كونوا ربانيين بما كنتم تعلمون الكتاب وبما كنتم تدرسون

تحفۂ مدرسین

یعنی

مثالی استاد بن کر آپ تدریس ایسے کریں

مدرسین کی صفات، انداز تدریس اور مختلف علوم وفنون کے آسان طریقۂ تدریس کے لئے اکابر علماء کرام اور مشائخ عظام کے بہترین مضامین کا حسین گلدستہ

از افادات

- محدث العصر حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ
- مولانا خیر محمد جالندھری رحمہ اللہ
- مولانا شاہ ابرار الحق رحمہ اللہ
- شیخ الحدیث حضرت مولانا نذیر احمد رحمہ اللہ
- مولانا شمس الحق رحمہ اللہ
- شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سلیم اللہ خان دامت برکاتہم العالیہ
- حضرت ڈاکٹر مفتی نظام الدین شامزی رحمہ اللہ
- حضرت مولانا ڈاکٹر عبد الرزاق سکندر دامت برکاتہم العالیہ
- شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم العالیہ
- مفتی عبد الرؤف غزنوی دامت برکاتہم العالیہ

جمع وترتیب

سید عبد الرشید بن مقصود ہاشمی

فاضل جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

ادارۃ الرشید کراچی

كونوا ربانيين بما كنتم تعلمون الكتاب وبما كنتم تدرسون ۞

تحفۂ مدرسین

یعنی

مثالی استاد بن کر

آپ تدریس ایسے کریں

مدرسین کی صفات، انداز تدریس اور مختلف علوم وفنون کے آسان طریقۂ تدریس کے لئے اکابر علماء کرام اور مشائخ عظام کے بہترین مضامین کا حسین گلدستہ

ازافادات

- محدث العصر حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ
- مولانا خیر محمد جالندھری رحمہ اللہ
- مولانا شاہ ابرار الحق رحمہ اللہ
- شیخ الحدیث حضرت مولانا نذیر احمد رحمہ اللہ
- مولانا شمس الحق رحمہ اللہ
- شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سلیم اللہ خان دامت برکاتہم
- حضرت ڈاکٹر مفتی نظام الدین شامزی رحمہ اللہ
- حضرت مولانا ڈاکٹر عبد الرزاق اسکندر دامت برکاتہم
- شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم
- مفتی عبد الرؤف غزنوی دامت برکاتہم

جمع وترتیب

سید عبد الرشید بن مقصود ہاشمی

فاضل جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

ادارۃ الرشید کراچی

علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن کراچی

بسم الله الرحمن الرحیم
اللهم
صل علی محمد وعلی آل محمد
کما صلیت علی ابراہیم وعلی آل ابراہیم
انک حمید مجید
اللهم
بارک علی محمد وعلی آل محمد
کما بارکت علی ابراہیم وعلی آل ابراہیم
انک حمید مجید

آئینہ کتاب

تقریظ

استاذ محترم حضرت مولانا محمد زیب صاحب دامت برکاتہم العالیہ

استاذ

جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن کراچی

الحمد لله وحده والصلاة والسلام على من لا نبي بعده وبعد:

دنیا میں انسانی ترقی کا دار و مدار اور عروج و زوال تعلیم و تربیت پر ہے خصوصاً اسلام کی ترقی روز اول سے اعلیٰ نصاب پر ہے جو وحی الٰہی ہے، اور اس کے معلمین مدرسین اساتذہ (جو کہ انبیاء علیہم السلام ہیں) پر تھیں جن کی تعلیم و تربیت نے دنیا میں بہت بڑے مخلص ولی کامل اور ماہر لوگوں کو تیار کیا، ہمارے لئے بھی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے نمونہ بنایا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے معلم و مربی کو دنیا نے نہیں دیکھا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کامل تعلیم و تربیت نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت زید بن ثابت حضرت ابی بن کعب وغیرہم رضی اللہ عنہم کو تیار فرمایا۔

ایسی ہی مخلص و مشفق وارث انبیاء علیہم السلام ماہر فنون وعلوم علمائے دین اپنے شاگردوں کی بنیادی حقوق تعلیم و تربیت کی ذمہ داریوں سے عہدہ براں ہونے والوں کے شاگرد کامل و ماہر استاذ معلم و مربی بن جاتے ہیں۔

تاہم جب سے امت مسلمہ ایک سے ایک زوال کا شکار ہوا اور ہر طبقہ کے رجال کار میں جہاں عملی

انحطاط و تنزلی کا دور دورہ ہوا وہاں علمی انحطاط و تنزلی نے بھی اپنا وہ کام دکھایا کہ گردش ایام نے دن یہ دکھائے:

گھٹ گئے انسان بڑھ گئے سائے

قرب قیامت (یرفع العلم ویظهر الجهل) کی مصداق نے اور (إذا وسد الأمر إلى غير أهله) کی مصداق نے ہمیں مادیت دنیا پرستی کے جال میں پھنسایا، مدرسین کی تقرری و ترقی قابلیت اور علمی صلاحیت کے بجائے سفارش اقربا پروری مادیت مالی منافع کی بنیاد پر جب سے شروع ہوئی تو علمی انحطاط کی انتہاء ہوگئی جس کے لئے نصاب سے مشکل کتابوں کو نکالا جارہا ہے۔

اسی انحطاط اور مشکل صورت حال نے اہل علم اکابر علماء کرام اور اہل درد مشائخ عظام کو متوجہ فرمایا اور انفرادی و اجتماعی کوششوں کا اہتمام فرمایا۔

انہی کوششوں اور مساعی جمیلہ میں سے مولانا سید عبدالرشید ہاشمی صاحب فاضل جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن کی کاوش و محنت تحفۃ المدرسین کتاب ہے جو انہوں نے مدارس اسلامیہ کے اساتذہ اور مدرسین حضرات کے لئے تحریر فرمائی ہے، اور جید علماء کرام کے متفرق مضامین اور تقاریر پر مشتمل ہیں، آئینہ ترتیب کتاب چار حصوں پر مشتمل ہے:

(۱) صفات مدرس۔

(۲) بہترین اسالیب تدریس۔

(۳) مختلف علوم اور فنون کے پڑھانے کے آسان اور مفید طریقے۔

(۴) تدریس کے لئے مطالعہ، طریقہ، ضرورت اور اہمیت۔

نیز اس کے ساتھ ساتھ بعض پائی جانے والی خرابیاں نہایت موثر انداز میں بیان کی ہیں۔

میں اپنے کچھ مصروفیت اور کاہلی کی وجہ سے کتاب کے مسودہ کا پورا مطالعہ نہیں کر سکا البتہ بعض عناوین کے دیکھنے سے اور حضرت مولانا محمد یسین صاحب استاذ جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کی مکمل

سرپرستی سے امید قوی ہے کہ انشاءاللہ تعالیٰ یہ تمام مدرسین اور اہل علم کے لئے بہت ہی مفید ثابت ہوگا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس مبارک کاوش اور محنت کو شرف قبولیت نصیب فرمائے اور ہر خاص وعام کے لئے مفید فرمائے اور مؤلف کے لئے ذخیرہ آخرت اور ذریعہ نجات بنائے۔

إنه سميعٌ قريبٌ وبالإجابة جديرٌ وقديرٌ

وصلى الله تعالى على خير خلقه محمد وآله وصحبه أجمعين

کتبہ: محمد زیب عفی عنہ

٣ / ٧ / ١٤٣٦ھ

تقریظ

استاذ محترم حضرت مولانا محمد یاسین صاحب دامت برکاتہم العالیہ

استاذ

جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن کراچی

قال اللہ تعالی: وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔

قرآن کریم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر بحیثیت معلم ومربی آیا ہے امت کی تعلیم کا کام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بنیادی فرائض منصبی اور مقاصد بعثت میں سے ہے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: «إنما بعثتُ معلّمًا» مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان معلمیت کو عالم اسلام کے مشہور محقق عالم ومحدث شیخ عبد الفتاح ابو غدہ رحمہ اللہ نے اپنی کتاب الرسول المعلم میں بہترین انداز کے ساتھ پیش کیا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے علماء امت کو انبیاء کرام کا وراث بیان فرمایا ہے: «إِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الأَنْبِيَاءِ، إِنَّ الأَنْبِيَاءَ لَمْ يُوَرِّثُوا دِينَارًا وَلاَ دِرْهَمًا إِنَّمَا وَرَّثُوا العِلْمَ، فَمَنْ أَخَذَ بِهِ أَخَذَ بِحَظٍّ وَافِرٍ» علماء انبیاء کے وارث ہیں اور انبیاء کرام کا ورثہ دینار اور درہم نہیں ہیں بلکہ ان کا ورثہ علم ہے جس کا وارث انہوں نے عالم کو بنایا۔

صحیح تعلیم وتربیت بھی وراثت نبوی کا ایک اہم حصہ ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معلم کی عظمت اس طرح بیان فرمائی ہے: «مُعَلِّمُ الْخَيْرِ يَسْتَغْفِرُ لَهُ كُلُّ شَيْءٍ حَتَّى الْحِيتَانُ فِي الْبَحْرِ» (مسند البزار)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اساتذہ کرام کو بھی حصول علم کے لئے آنے والے طلبہ کے ساتھ خوش

اخلاقی سے پیش آنے کا حکم فرمایا ہے: عَنْ أَبِي هَارُونَ الْعَبْدِيِّ قَالَ: كُنَّا نَأْتِي أَبَا سَعِيدٍ فَيَقُولُ: مَرْحَبًا بِوَصِيَّةِ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، إِنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «إِنَّ النَّاسَ لَكُمْ تَبَعٌ، وَإِنَّ رِجَالاً يَأْتُونَكُمْ مِنْ أَقْطَارِ الأَرَضِينَ يَتَفَقَّهُونَ فِي الدِّينِ، فَإِذَا أَتَوْكُمْ فَاسْتَوْصُوا بِهِمْ خَيْرًا». (الترمذي)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگ تمہارے تابع ہیں تمہارے پاس دور دراز ملکوں سے لوگ علم دین سیکھنے اور سمجھنے کے لئے آئینگے ان کے بارے میں میری وصیت کے موافق پیش آنا۔

طلبہ کی تعلیم وتربیت میں معلم کی اپنی شخصیت، علمی لیاقت، تدریسی صلاحیت، اخلاقی صالحیت، اخلاص واعلی سیرت وکردار کے ساتھ طلبہ کی اصلاح وترقی کا جذبہ انتہائی اہم ہے۔

برادر محترم سید عبدالرشید ہاشمی صاحب زیدت مکارمھم نے حضرات اساتذہ کرام میں بہترین صفات پیدا کرنے کے لئے اکابرین امت اور ماہرین فن علماء کرام (جنہوں نے اپنی معلمانہ زندگی کے تجربات کا نچوڑ اور جوہر پیش کئے ہیں) کے افادات کو جمع کر کے اس سے استفادہ کرنا آسان بنادیا ہے۔

جو حضرات پہلے سے تدریس سے وابستہ ہیں اکابرین امت اور مشاہیر فن کے ہدایات ان کی تدریس کو مزید جلا بخشے گی اور نو وارد (نئے فضلاء) کے لئے یہ کتاب بہترین معاون ثابت ہوگی اور تدریس کے سلسلہ میں رہنمائی کرے گی ان شاءاللہ۔

دعا ہے کہ اللہ تبارک وتعالی مولانا سید عبدالرشید ہاشمی زید مجدہ کے جمع کردہ اکابرین کے ارشادات وہدایات کا یہ مجموعہ مقبول عام فرمائے۔

محمد یسین عفی اللہ عنہ

۵ / ۷ / ۱۴۳۶ھ

چند باتیں چند وضاحتیں

اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام مخلوقات میں سے حضرت انسان کو جہاں دیگر بے شمار ولاتعداد نعمتوں سے نوازا ہے وہاں ان کو علم جیسی ایک عظیم الشان نعمت سے بھی مالا مال فرمایا ہے، اور علم بھی اپنی کتاب اور اپنے دین متین کا دیا ہے، لہذا دین کے علم کو سینے سے لگانا اور دن رات اس کے حصول میں لگے رہنا اور دوسروں تک اُسے منتقل کرنے میں مصروف رہنا ہی اس نعمت کا شکر اداء کرنا ہے، اور جتنا جتنا اس کو آگے پہنچاکر اس کا شکر اداء کیا جائے گا اتنا ہی اللہ تعالیٰ {لئن شکرتم لأزیدنّکم} میں بندوں سے کئے ہوئے وعدہ کے مطابق اس نعمت کو بڑھاتے چلے جائیں گے۔

دوسروں تک یہ علمی امانت کیسی پہنچائی جائے؟

اس کے لئے ہمارے پاس سب سے بڑا نمونہ ہمارے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، نبی علیہ السلام نے بہترین انداز سے جہاں دیگر میدانوں کو سنبھالا وہاں اس میدان میں بھی وہ بہترین نمونہ رہے، اور صرف یہ نہیں کہ انہوں نے یہ امانت ہمیں اور دنیائے عالم تک پہنچائی بلکہ پہنچانے کا حق بھی اداء کردیا اور زندگی کے تمام شعبوں سے متعلق اپنی تعلیمات کا ذخیرہ اور فروعات کے لئے باقاعدہ اصول اور ضوابط بڑے بہترین انداز میں بیان فرماکر تشریف لے گئے ہیں۔

نبی علیہ السلام کے نقش قدم پر چلتے ہوئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تابعین اور تبع تابعین اور الی یومنا ہذا جملہ اکابرین اور مشائخ عظام انہیں کے انداز تدریس اور اسالیب تدریس کو اپنے لئے حرز جان بناکر اس پر چلنے کو اپنے لئے باعث صد افتخار سمجھتے رہیں، پھر ان ہی اسالیب اور اصول وضوابط کو اور ان کی روشنی میں کچھ جدید اور مفید اسالیب کو ہمارے اکابرین ومشائخ نے اور خاص کر عالم عرب کے علماء حضرات نے جمع کیا ہیں اور آیندہ نسلوں کے لئے یہ لعل وجواہرات مرتب کرکے ہمارے اسلامی مکتبات میں ایک اچھا خاصا اضافہ فرمایا ہیں، مثلاً :

عمان کے كلية العلوم الإنسانية والاجتماعية جامعة صحار کے استاذ الشیخ محمود مزعل محمود الشباطات نے "طرق تدريس التربية الإسلامية وتطبيقاتها" کے نام سے ایک اچھی خاصی ضخیم کتاب لکھی ہیں جسے دار القضیہ مصر والوں نے ١٤٢٧ھ میں شائع کی ہیں اور عام عربی مکتبات میں مل رہی ہے۔

اور جامعہ دمشق کے تعلیم وتربیت کے مسئول شیخ جودت الرکابی صاحب نے "طرق تدريس اللُّغة العربية" کے نام سے کتاب لکھی ہیں جس کی دسویں طباعت دار الفکر دمشق والوں نے ١٤٢٦ھ میں شائع کی ہیں۔

اور دکتور حسن شحاتہ صاحب نے" أساسيات التدريس في العالم العربي" کے نام سے ایک اچھی خاصی ضخیم اور بہترین کتاب لکھی ہیں جس کی چوتھی طباعت الدار المَصرية اللبنانية نے ١٤٢٥ھ میں شائع کی ہے۔

اسی طرح الشیخ محمد یسین عبد الرحمن قندیل صاحب نے "التدريس وإعداد المعلم" کے نام سے کتاب لکھی ہے جس کی دوسری طباعت المملكة العربية السعودية کے دار النشر الدَّولي نے ١٤١٨ھ میں شائع کی ہے۔

اور جامعۃ القاہرۃ اور جامعۃ الملک عبد العزیز کے استاذ الدکتور ابراہیم محمد عطاء نے "دليل تدريس اللغة العربية" کے نام سے کتاب لکھی ہے جس کی پہلی طباعت ١٤٢١ھ میں مكتبة النهضة المصرية نے شائع کی ہے۔

اور صالح بن سلیمان المطلق البقاوی نے "مبدأ الرفق في التعامل مع المُتعلمين من منظور التربية الإسلامية" کے نام سے بڑے مرتب انداز میں کتاب لکھی ہیں جس کی پہلی طباعت المُملكة العربية السعودية کے دار النشر الدولي نے ١٤٢١ھ میں شائع کی ہے۔

اور نابغۃ العصر محقق بلا ریب اور ہمارے استاذ الاساتذہ شیخ عبد الفتاح ابو غدۃ رحمہ اللہ نے "الرَّسول المعلِّم ﷺ وأساليبه في التَّعليم" کے نام سے بڑی بہترین اور لاجواب کتاب لکھی ہیں جس کی چوتھی طباعت دار

البشائر الاسلامیۃ نے ۱۴۲۹ھ میں شائع کی ہے۔

اورہمارے استاذ محترم مدیر جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب دامت برکاتہم نے اپنے سالہا سال تجربات کا نچوڑ چند صفحات میں بڑے اچھے مرتب ومبوب ومشجر ومرقم انداز میں، عربی میں "کیف تُعلِّم اللغةَ العربيةَ لغيرِ النّاطقين بها" کے نام سے اور اردو میں "عربی زبان غیر عرب کو آپ کیسے پڑھائیں؟" کے نام سے مختصر مگر پر مغز اور خير الكلام ما قلَّ ودلّ کے مصداق پر اترتے ہوئے بڑی بہترین کتاب لکھی ہیں، یہ کتاب "دار القلم کراچی" والوں نے بڑے بہترین انداز میں شائع کی ہیں اور تقریبا ہر اسلامی مکتبہ میں مل رہی ہے۔

اور پھر آخر میں ہمارے محسن ومشرف وراہنما شیخ الادب العربی حضرت مولانا محمد ولی خان مظفر صاحب نے اس موضوع پر لکھی گئیں اکثر کتابوں کا خلاصہ اور نچوڑ اپنی کتاب "طرق التدريس وأساليب الامتحان" نامی کتاب میں بڑے منظم انداز میں جمع فرمایا ہے جو دیکھنے سے ہی تعلق رکھتی ہے۔

اس کے علاوہ اردو زبان میں بھی اس پر بڑا ذخیرہ موجود ہے جن میں سے شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کی کتاب "درس نظامی کی کتابیں کیسے پڑھیں اور پڑھائیں"، اور مفتی حنیف عبدالمجید صاحب کی "مثالی استاذ"، اور شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد نذیر صاحب کی "امداد المدرسین"، اور ہمارے شفیق ومہربان حضرت مولانا محمد فاروق حسن زئی صاحب کی "استاذ کا کردار" اور مولانا محمد نواز نقشبندی کی "اصول تدریس" اور مفتی ذاکر حسن صاحب کی "رہنمائے معلمین" قابل ذکر ہیں۔

غرض اس موضوع سے متعلق لکھی گئی کتابوں کا بڑا ذخیرہ ہمارے دینی مکتبات کا ایک مستقل حصہ بن چکا ہے جن کا ایک مختصر سا نمونہ آپ کے سامنے پیش کردیا گیا ہے، ظاہر بات ہے کہ اتنے بڑے ذخیرہ کو جمع کرنا اور پھر اس سے استفادہ کرنا ہرایک کی بس کی بات نہیں، اللہ تعالی جزائے خیر دے ہمارے ان زعمائے ملت کو جو عقابی اور شاہینی نگاہوں کے مالک اور نباض ملت تھے انہوں نے مذکورہ کتب کے ذخیروں میں غوطے لگائے اور اپنے زمان ومکان کے تقاضوں اور اذہان کو بھانپ کر اندازہ لگایا کہ ان میں سے کون کونسے اسالیب سے ہم زیادہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور کن کن طریقوں سے یہ امانت طالبان علوم نبوت کے سینوں میں اتاری جاسکتی ہے، ان

طریقوں اور اسالیب کو مضامین کی شکل میں لکھ کر وقتاً فوقتاً مجلات اور ماہنامہ جات میں جماعت مدرسین کی خدمت میں پیش فرماتے رہیں، اور مدرسین ان کے ارشادات اور ہدایات سے پیاس بجھا کر اپنا تدریسی رُخ سیدھا کرتے رہے، اور ان کے دور رس اثرات طالبان علوم نبوت پر پڑ کر نظر آتے رہیں، لیکن مرور زمانہ سے اس میں اضمحلال پیدا ہونے لگا، اور دوبارہ اُن مضامین اور ارشادات تک رجوع اور رسائی اس لئے نہ رہی کہ "مجلات شہریۃ" کی عمر بنسبت دیگر کتب کے بہت کم ہوتی ہے، ایک بار پڑھنے کے بعد عام طور پر اُسے قابل اعتناء نہیں سمجھا جاتا، بہت کم قدرداں اور باذوق افراد ایسے ہوتے ہیں جو اِن مجلات کو سنبھال کر ہر سال کے بلدہ شماروں کو کتابی شکل میں یکجا کرکے ریکارڈ میں رکھتے ہیں اور وقتاً فوقتاً ان کی طرف رجوع فرماتے رہتے ہیں۔

انہیں باذوق اور قدرداں حضرات میں سے ایک عظیم قدردان بلکہ اپنے اکابر اور مشائخ کے تراثِ علمی کے عاشق مشفقی ومحترمی استاذ محترم مولانا محمد یسین صاحب دامت برکاتہم کی شخصیت سرفہرست ہیں، جنہوں نے کئی سالوں کے مختلف ماہناموں سے ایسے مضامین نکالے پھر ان کی فوٹوکاپیاں بنواکر ایک مجموعہ تیار فرمایا نیز اس حوالے سے کئی چھوٹی بڑی کتابیں جمع کرکے بندہ کو حکم دیا کہ ان مضامین کو مرتب کرکے اور اِن کتابوں سے انتخاب کرکے ایک رسالہ تیار کرلو جو تدریسی میدان میں نئے آنے والے فضلاء کرام کے لئے ایک راہنما مینارہ ثابت ہو، بلکہ اس میدان میں قدم رکھنے سے قبل تراثِ اکابر ومشائخ سے مستفید ہوکر بطور "دورۂ تدریبیہ" اس کو پڑھ کر اس امانتِ علمیہ کو صحیح نہج اور منہج پر ادا کرنے کے لائق اور متحمل ہوں۔

بندہ یہ سن کر دل ودماغ میں جو ایک بجھی ہوئی چنگاری تھی وہ دوبارہ تازہ ہوئی؛ کیونکہ اس سے کئی سال قبل غالباً ۱۴۲۳ھ میں "مدرسہ عثمانیہ بہادر آباد کراچی" کے منتظمین حضرات نے مدرسین اور مدرسات کے لئے "دورہ تدریبیہ" کے نام سے ایک روزہ دورہ رکھا تھا جس میں ہمارے اکابرین اور مشائخ کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ اپنی زندگی بھر کے تجربات کا خلاصہ اور نچوڑ سامنے رکھ کر مختلف علوم اور فنون کے پڑھانے کے صحیح طریقے بیان فرمادیں، چنانچہ:

استاذ محترم حضرت مولانا مفتی نظام الدین شامزئی شہید صاحب رحمہ اللہ کو "فقہ" کا عنوان دے کر اس کے متعلق طریقِ تدریس القاء کرنے کی درخواست دی گئی تھی۔

اور استاذ محترم حضرت مولانا ڈاکٹر عبد الرزاق اسکندر صاحب کے سامنے "عربی زبان" سکھانے کے متعلق طرق القاء کرنے کی درخواست پیش کی گئی تھی۔

اور استاذ محترم حضرت مولانا مفتی عبدالرؤف غزنوی صاحب دامت برکاتہم کو "طریقِ تدریس حدیث" کے متعلق محاضرہ دینے کی پیش کش کی گئی تھی۔

اسی طرح درجہ ثانیہ تا درجہ خامسہ "ترجمۂ قرآن" اور درجہ سادسہ وسابعہ میں "تفسیر وعلوم تفسیر" کے متعلق نابغۂ زماں حضرت مولانا شمس الحق صاحب رحمہ اللہ ناظم تعلیمات "دارالعلوم کراچی" کو دعوت دی گئی تھی۔

اور "بحیثیت مدرس ایک استاذ کن صفات کا حامل ہو" اس کے متعلق ارشادات پیش کرنے کی درخواست حضرت مولانا عزیر حمن صاحب دامت برکاتہم استاذ الحدیث "دارالعلوم کراچی" کے سامنے پیش کی گئی تھی۔

ان سب حضرات نے آکر متعلقہ موضوعات پر اپنے قابل قدر اور گرانمایہ ارشادات سے سامعین وسامعات کو مستفید ہونے کا موقع فراہم فرمایا۔ جزاهم الله خيرًا في الدُّنيا والآخرة۔ بندہ گنہ گار بھی بفضل اللہ تعالیٰ از اول تا آخر بڑے شوق سے اس دورے میں شریک رہا۔ الحمد للہ امید سے بڑھکر فائدہ ہوا۔

بہر حال اِن حضرات سے جو کچھ سنا تھا، اس پر اُس وقت سے کام شروع کرلیا تھا تاکہ اپنے دیگر بھائیوں تک بھی اپنے اساتذہ اور اکابرین کی یہ صداء پہنچائی جائے، چنانچہ ان میں سے کئی محاضرات پر کام کرکے بہت کم حصہ ایسا تھا جو باقی رہ گیا تھا لیکن قدّر الله ما شاء، اور {لكل شيء عنده أجلٌ مسمًّى} کام وہیں کا وہیں رہ گیا، اور التواء در التواء کا شکار رہا، پھر جب استاذ محترم نے مذکورہ فرمائش کی تو وہ دھبی ہوئی اور بجھی ہوئی چنگاری دوبارہ تازہ ہوئی، لہذا استاذ محترم سے دعاؤں کی درخواست کرکے اللہ تعالیٰ کا نام لیا اور اس پر کام شروع کیا، کام کے دوران بھی استاذ محترم موقع بموقع اپنے ہاں بلاتے رہتے تھے اور مزید در مزید اس موضوع سے متعلق مواد فراہم فرماتے رہتے تھے، کام چلتا رہا اور اس حوالے سے کچھ دیگر مواد بھی ہاتھ آتے رہے، اسی اثناء "رموز تدریس" کے نام سے بھی ایک کتاب ہاتھ لگی جو انہیں محاضرات اور اس کے بعد دیئے گئے کچھ دیگر

محاضرات کا مجموعہ تھا جن کا ذکر ماقبل میں گذر چکا، چنانچہ ان محاضرات پر اپنے کئے ہوئے کام کو کالعدم سمجھ کر اس کتاب سے بھی کچھ مختصر اور کچھ تفصیلی اقتباسات لئے اور اپنے اس مجموعہ میں شامل کر لئے، اور کرتے کرتے ایک گلدستہ اللہ تعالیٰ نے تیار کروا دیا۔

اپنی طرف سے کوئی ایک دو فیصد حصہ بھی مشکل سے شامل کیا ہوگا، جو کچھ ہے سارا کا سارا اپنے اکابرین اور مشائخ کی تحریرات اور محاضرات کا گلدستہ ہے، جو انشاء اللہ ناظرین قدردانی کی نگاہ سے دیکھیں گے؛ کیونکہ جن جن کتابوں اور مجلات سے یہ مواد لئے گئے ہیں وہاں تک رسائی ہر ایک کے لئے اگر محال نہیں تھی تو مشکل ضرور تھی۔

بہر حال یہ مجالہ مضامین اور ارشادات اکابرین کا ایک حسین گلدستہ ہے جو قارئین کی خدمت میں اس درخواست کے ساتھ پیش کیا جارہا ہے کہ اس کو بار بار پڑھتے رہیں اور عملی میدان میں جب قدم رکھیں تو خوب محنت کر کے کبھی کبھار اِس آئینہ کے سامنے اپنے آپ کو پیش کرتے رہیں، یہ چیز اتنی اہم اور مفید ہے کہ ماقبل میں جن اکابرین اور زعمائے ملت کا تذکرہ ہوا، اُن میں سے اکثر حضرات نے اس بات کا اظہار فرمایا کہ ایسے "دوراتِ تدریبیہ" جو طرق تدریس پر مشتمل ہوں ہر ہر ادارے اور ہر ہر مدرسہ کے سطح پر اپنے اساتذہ کرام کے لئے وقتاً فوقتاً ہونے چاہیے، بلکہ نئے فضلاء کے لئے اس کورس پر مشتمل ایک "دورہ" ہو جس میں ماہرین فنِ تدریس اپنی زندگی کے مفید اور قابل قدر تجربات فضلاء کے سامنے رکھیں تاکہ پڑھانے سے قبل وہ اس میدان کے شہسوار بن کر اس میں قدم رکھیں ورنہ بصورت دیگر وہ نونہالانِ قوم پر اپنے تجربے کرتے رہیں گے اور آزماتے آزماتے جب اُن کی تدریس صحیح نہج پر آئیگی تو ایک زمانہ گذر چکا ہوگا، لہذا ضرورت اس بات کی ہے کہ تدریس کو باقاعدہ ایک فن سمجھ کر اپنے فضلاء کو دیگر فنون کی طرح اس کی بھی تعلیم دی جائے۔

لیکن یہ یاد رہے کہ طرق تدریس بتلانے والے ہمارے اکابرین ہی کے نقش قدم پر چلنے والے کہنہ مشق مدرسین ہوں جنہوں نے خود اس میدان میں اپنی زندگیاں کپائی ہوں اور طالبعلموں کی ذہنی سطح اور ان کی نفسیات سے واقف ہوں، جیساکہ اس سلسلہ میں مولانا ابن الحسن عباسی صاحب فرماتے ہیں:

"اساتذہ اور معلمین کی تربیت کے حوالے سے اس طرح کی نشستوں کو منعقد کرنا ایک مفید روایت بن سکتا ہے۔ جب اس طرح کے کورس اپنے ہی کسی معتبر ادارے میں مدارس ہی کے بزرگ اور تجربہ کار اساتذہ اور

علماء سے استفادے کی شکل میں ہو تو اس کی افادیت میں شک نہیں — منصب تدریس سے برسوں وابستہ رہنے والا ایک تجربہ کار اور بزرگ استاذ مختصر نشست میں اپنی زندگی کا حاصل پیش کرے گا تو یقیناً نئے فضلاء اور مدرسین کو احساس کمتری میں مبتلا ہوئے بغیر اس سے ضرور فائدہ ہوگا۔

البتہ پاکستان میں کچھ لوگوں کو دینی مدارس کی اصلاح کی کچھ اور طرح کی فکر لگ گئی ہے، اس کی صورت انہوں نے یہ نکالی ہے کہ کالج، یونیورسٹیوں اور عصری اداروں کے پروفیسروں اور لیکچرار حضرات کو بلاتے ہیں یا مدارس کے بعض اساتذہ کو وہاں لے جاتے ہیں، یہ پروفیسر حضرات مدارس کی اصلاح پر بیانات کرتے ہیں، یہ مقالات پڑھتے ہیں، علماء اور مدرسین کو زمانہ شناسی کا درس دیتے اور نئے رویوں سے شناسائی کا سبق پڑھاتے ہیں، تعلیم وتربیت کو ذریعہ معاش بنانے والے یہ پروفیسر حضرات بسا اوقات اس بوریہ نشین معلم و مدرس کے طرز واندازِ زندگی پر جملے کستے ہیں جس کے فقر و بے سامانی پر فرشتے رشک کرتے ہیں — کئی نئے فضلاء اس طرح کی مجلسوں سے احساس کمتری میں مبتلا ہوجاتے ہیں اور اپنے عالی منصب کے عظیم نعمت ہونے کا احساس اور قدر کھو بیٹھتے ہیں — عصری اداروں کے مفید تعلیمی اور تدریسی تجربات سے فائدہ اٹھانا قابل اعتراض نہیں، لیکن اس کا یہ ایک منفی پہلو ہے، مدارس کے منتظمین سے میری درخواست ہے کہ اس منفی پہلو کو نظر انداز نہ ہونے دیں، مدارس کے بوریہ نشین علماء اور طلبہ کی جفاکشی اور قربانی والی سادہ زندگی اس خطے میں تعلیم وتربیت کی زریں تاریخ کا اثاثہ ہے، ان مدارس کی کامیابی کا راز اکابر ہی کے بنائے ہوئے نظام اور طرز سے جڑا رہنے میں ہے، نئے کورسوں اور نئے تجربوں میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے، اس وقت شدید ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم مدارس میں جاری قدیم نظم کو مزید مضبوط بنائیں، یہ نظم جس قدر مستحکم ہوگا اسی قدر اس کے عمدہ نتائج نکلیں گے، حقیقت یہ ہے کہ اس سے بہتر نتائج دینے والا کوئی نظام ہماری نظر سے نہیں گذرا"۔ (ماہنامہ وفاق المدارس جمادی الاولیٰ ۱۴۲۲ھ)۔

مزید اس کی اہمیت اور افادیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اور اس میں کن کن باتوں کا ذکر ہو ان کو متعین کرتے ہوئے حضرت مولانا قاری محمد حنیف جالندھری صاحب فرماتے ہیں:

"جہاں تک "تدریب المعلمین" کا تعلق ہے، اس کی ضرورت افادیت اور اہمیت سے کسی بھی ذی شعور کو انکار نہیں ہوگا، درحقیقت ذرائع علم میں کتابیں، ماحول اور مدرسہ ثانوی حیثیت رکھتے ہیں، استاد سب سے اولین حیثیت رکھتا ہے، اس لئے کہ باقی تمام چیزیں جاندار نہیں ہیں، نہ کتابیں بولتی ہیں، نہ ماحول بولتا ہے اور نہ ہی درسگاہ اور اس کے در و دیوار، استاد ہی ایک جاندار آلۂ علم اور ذریعۂ علم ہے، تو استاد چونکہ اصل ہے

اس لئے جتنا وہ ماہر ہوگا اس سے کسب فیض کرنے والے شاگرد بھی اسی قدر ماہر ہوں گے، ـــ لیکن "تدریب المعلمین" کے دو پہلو سامنے رہنا ضروری ہیں: ایک پہلو کا تعلق "نصاب تعلیم" سے اور دوسرے کا تعلق "نظام تعلیم یا انداز تدریس" سے ہے۔

جہاں تک نصاب تعلیم کا تعلق ہے اس میں ضروری ہے کہ استاد کو یہ معلوم ہو کہ فلاں فن، فلاں کتاب، اور فلاں علم میں نے کیسے پڑھانا ہے، ظاہر ہے کہ استاد کو یہ تربیت ماہر اساتذہ ہی دے سکتے ہیں جن کا اس میدان میں بہت زیادہ تجربہ ہو، کیونکہ دیکھا یہ گیا ہے کہ تدریس کے دوران بعض اوقات غیر ضروری مباحث بیان ہوجاتے ہیں اور ضروری مباحث کسی وجہ سے نظرانداز ہوجاتے ہیں، بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ ایک مسئلہ جسے اختصار کے ساتھ بیان ہونا چاہیے، اس میں بہت زیادہ طوالت ہوجاتی ہے یا چند ابواب جو کہ ہر کتاب میں مکرر ہوتے ہیں، ان میں تکرار ہوجاتی ہے، مثال کے طور پر "کتاب الطہارۃ" پر تدریس کے دوران لمبی لمبی بحث ہوجاتی ہے، لیکن اس کے بعد اخلاقیات، کتاب البیوع یا دیگر پر سرسری انداز سے گزرتے ہوئے پوری طرح توجہ نہیں ہوپاتی، عرض کرنے کا منشا یہ ہے کہ "تدریب المعلمین" کا ایک حصہ وہ ہے جس کا تعلق درس نظامی کے نصاب اور اس کے طریقہ تدریس کے ساتھ ہے، اس کے لئے ضروری ہوگا کہ جو ماہر اساتذہ ہیں وہ اپنے تجربے کی روشنی میں بتائیں کہ فلاں فن کے لئے یہ کتابیں ہیں جن سے مدد لی جاسکتی ہے، اور یہ یہ مباحث زیادہ ضروری ہیں، ان کو بیان کریں اور یہ غیر اہم مباحث ہیں ان کو بیان کرنے سے گریز کریں، اس سلسلے میں "تدریب المعلمین" کے لئے ایسے ماہر اساتذہ درکار ہوں گے جن کا تجربہ میرے خیال میں کم از کم "بیس سال" ہونا چاہیے، کیونکہ اتنا تجربہ رکھنے والے ہی صحیح رہنمائی کرسکتے ہیں۔

دوسرا پہلو نفسیاتی ہے کہ آج کے دور میں جو طریقہ تدریس یا طریقہ تعلیم ہے اس کے اندر طلبہ کی نفسیات، علمی سطح، ذہنی سطح، اور ان کے فہم و دانش کو سامنے رکھ کر تعلیم دینے کا اہتمام کرنا خود جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک بات کو بار بار دہراتے تھے، تاکہ اچھی طرح سے سمجھ لی جائے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم پڑھاتے ہوئے دائیں بائیں اور ہر طرف اپنے چہرہ انور کو پھیرتے تھے، اس لئے کہ مواجہہ سے بہت ساری باتیں سمجھ آتی ہیں، اسی طرح یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ آج مار کا زمانہ "مار" کا زمانہ نہیں ہے، اگر آپ طالب علم کو ماریں گے تو وہ کبھی بھی پڑھنے کے لئے تیار نہیں ہوگا، زمانہ بدل گیا ہے، ایک دور تھا جب آپ طلبہ کی پٹائی کرتے تھے تو وہ اس کو بھی سعادت سمجھتے تھے، آج تو اپنے بچے کو بھی کچھ کہتے ہوئے انسان محتاط ہوتا ہے، تو یہ نفسیاتی چیزیں ہیں کہ بچے کو پڑھانا کیسے ہے؟ پیار، محبت اور ترغیب

کے کون سے انداز ہیں؟ یہ "تدریب المعلمین" کا دوسرا حصہ ہے۔

تیسرا حصہ تدریب کا وہ آجاتا ہے کہ استاذ اپنے تدریسی عمل میں ملکی اور عالمی حالات کو پیش نظر رکھے، اس حوالہ سے ایک بہت بڑی کمی جو میں محسوس کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہمارا پڑھانا تطبیقی نہیں ہوتا، یعنی آج جو کچھ ہم پڑھا رہے ہیں ان کو موجودہ حالات پر منطبق کرنا مثال کے طور پر اگر ہم "کتاب البیوع" پڑھا رہے ہیں تو بیع کی کچھ تو وہ صورتیں ہیں جو قدیم زمانے میں رائج تھیں، آج صورت حال کئی طرح سے مختلف ہوسکتی ہے، جیسا کہ "بیع غرر" ہے آج اس کی کیا صورتیں ہیں؟ "بیع حبل الحبلہ" ہے، اسی طرح "ملامہ" ہے، یہ وہ چیزیں ہیں جن کے بارے میں یہ جاننا کہ موجودہ زمانے میں ان کی کیا صورتیں ہیں؟ یا جیسے ہم "کتاب المساقات والمزارعات" پڑھاتے ہیں جس میں باغوں کا، کھیتوں کا اور کاشت کا بیان پڑھاتے ہیں، ان کی آج مروجہ صورتیں کیا ہیں؟ ان کا کیا حکم ہے؟ اس زمانے میں صورتیں کچھ اور تھیں جو آج سے مختلف ہیں، اس زمانے میں کنویں تھے، ان کے بارے میں ہم پڑھتے ہیں کہ یہ صورت ہو تو کنواں ناپاک ہو جائے گا، پاک کرنے کا یہ طریقہ ہے، لیکن آج تو طالب علم کو کہیں کنواں نظر نہیں آتا، ہمارا جو معاشی نظام ہے آج اس میں ایک بینکنگ کا شعبہ ہے، تجارت صرف مقامی اور قومی سطح پر ہی نہیں بلکہ عالمی سطح پر ہورہی ہے، ٹیلی فون، فیکس اور ای میل پر تجارت ہورہی ہے، تجارت کی ان صورتوں کا کیا حکم ہے؟ موجودہ بینکاری کے نظام پر یہ صورتیں کیسے منطبق ہوتی ہیں؟ خلاصہ کلام یہ کہ ہمارے ہاں تدریس تطبیقی نہیں ہے، طالب علم جو پڑھ رہا ہے وہ سمجھتا ہے کہ مجھے علم مل رہا ہے اور یہ برکت کے لئے بھی ہے، لیکن آج کی زندہ دنیا میں، باہر مارکیٹ میں اپنے علم کو کیسے منطبق کروں گا یہ اس پر پوری طرح واضح نہیں ہے اور یہ میرے خیال میں زیادہ ضروری ہے"۔ (ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ ۲۰۰۹)

علم میں وہ پختگی کیوں نہ رہی؟ اس کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں، منجملہ ان کے ایک یہ کہ طلباء میں وہ محنت نہ رہی جو پہلے تھی، ماضی میں ہم اپنے اکابرین کی تاریخ کو دیکھ لیں تو واضح طور پر ہمیں ملتا ہے کہ انہوں نے تن من دھن کی بازی لگا کر ہر چیز پر پڑھنے ہی کو ترجیح دی تھی، کوشش ان کی یہ ہوتی تھی کہ کسی بھی کتاب کا کوئی کلمہ اور جملہ ایسا نہ رہے جسے ہم سمجھے نہ ہوں، جب اس طرح پڑھتے ہوئے کوئی کتاب ختم ہو جاتی تھی تو جہاں وہ آگے بڑھ کر کوئی دوسری کتاب شروع فرماتے وہاں باقاعدہ طور پر پچھلی پڑھی ہوئی کتاب پڑھانا بھی شروع فرما لیتے تھے: جیسا کہ علامہ مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ اپنی کتاب "برصغیر پاک وہند میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت" میں لکھتے ہیں:

"ہمارے نظام تعلیم کی ایک اور قابل ذکر خصوصیت جو بظاہر معمولی معلوم ہوتی ہے لیکن اگر سوچا جائے تو کتنے دور رس منافع کی وہ حامل تھی، مطلب یہ ہے کہ منجملہ اور دستوروں کے ایک دستور اس زمانہ میں یہ بھی تھا کہ عموماً بڑی جماعت کے طلبہ یعنی اوپر کی کتابیں پڑھنے والے فارغ ہونے سے پہلے طالب علمی ہی کے دنوں میں اس کی کوشش کرتے تھے کہ اپنی پڑھی ہوئی کتابیں نچلی جماعت کے طلبہ کو پڑھاتے رہیں، خصوصاً جو لوگ آگے چل کر مدرسی اور پڑھنے پڑھانے میں زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کئے ہوئے رہتے، حضرت مولانا عبد الحئی فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی خودنوشتہ سوانح عمری میں لکھا ہے:

وكلّما فرغتُ من تحصيل كتابٍ شرعتُ في تدريسه (نفع المفتی والسائل ص۲۵) جس کتاب کے پڑھنے سے میں فارغ ہوتا اسی کو پڑھانا بھی شروع کر دیتا۔

کلما کا لفظ بتاتا ہے کہ یہ کوئی اتفاقی صورت ایک دو کتابوں کے ساتھ پیش نہیں آئی تھی، بلکہ ہر کتاب کے ساتھ آپ کا یہی دستور تھا جس کا پہلا فائدہ تو یہی تھا جیسا کہ مولانا ہی فرماتے ہیں: فحصل لي الاستعدادُ التامُّ في جميع العلوم بعون الله الحي القيوم۔ تمام علوم میں میری لیاقت پختہ ہوتی چلی گئی، اللہ حی وقیوم کی اعانت سے۔

اور یہ واقعہ بھی ہے کہ علم کو جو یوں مسلسل تازہ بتازہ نوبنو حالت میں رکھنے کی کوشش کرے گا، اس کی قابلیت جتنی بھی بڑھتی چلی جائے کم ہے، خصوصاً تجربہ کی بات ہے کہ کسی چیز کے سمجھنے میں آدمی پڑھنے کے وقت اتنی ذمہ داری محسوس نہیں کرتا جتنی ذمہ داری پڑھانے کے وقت خود بخود اس پر عائد ہو جاتی ہے، خود سمجھ کر دوسرے کو سمجھانے کی کوشش کرنا، دونوں میں بڑا فرق ہے، مولانا نے لکھا ہے کہ اس طریقہ کار کا یہ نتیجہ تھا کہ:

لم يبق تعسرٌ في أي كتابٍ كان من أي فنٍّ كانَ حتى أني درّستُ مالم أقرأه حضرة الأستاذ كـ"شرح الإشارات" للطوسي و"الأفق المبين" و"قانون الطب" و"رسائل العروض"۔ مجھے کسی کتاب کے سمجھنے سمجھانے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوتی تھی، خواہ کونسی بھی کتاب ہو اور کسی فن کی ہو، حتی کہ اس مشق کی بنیاد پر ایسی کتابوں کو میں نے پڑھایا جنہیں استاد کے سامنے میں نے نہیں پڑھی تھی، مثلاً طوسی کی "شرح اشارات" اور "الأفق المبين" اور "قانون طب" اور عروض کے بعض رسائل۔

مولانا مرحوم نے بے پڑھے جن کتابوں کے پڑھانے کا ذکر کیا ہے، جو ان کتابوں کی خصوصیتوں سے ناواقف ہیں، وہ کیا اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں، "الأفق المُبين" میر باقر کی اوبی اور ذہنی زور کا

شاہکار ہے، پڑھانے والے کو آسمان کے قلابے زمین سے اور زمین کے قلابے آسمانوں سے ملانے پڑتے ہیں، یا طوسی کی شرح اشارات توازن دماغی کا جتنا اچھا نمونہ ہے، ابن سینا اور امام رازی کی بحثوں کو انتہائی سنجیدگی کے ساتھ چکانے میں یہ شخص جتنا کامیاب ہوا ہے (شاید ہی کوئی اور اتنا کامیاب ہوا ہو) اسی لئے اس کتاب کے پڑھانے میں پڑھانے والوں کو بھی ضرورت پڑتی ہے کہ اپنے احساسات کو جادہ اعتدال سے ہٹنے نہ دیں ورنہ بات ہی ہاتھ سے نکل جاتی ہے، اسی طرح قانون گو طب کی کتاب ہے نسبتاً اسے زیادہ مشکل نہ ہونا چاہیے لیکن قلم تو ابن سینا کا ہے، جن حقائق ونکات کی طرف مختصر لفظوں میں اشارہ کرنا ہے، ان کا انہی الفاظ سے اخذ کرنا طلبہ کو سمجھانا یہ ساری باتیں آسان نہیں ہیں — غور تو کیجئے! مطالعہ، مباحثہ، اعادہ اور فراغت سے پہلے مدرسہ یعنی پڑھنے کے ساتھ ہی پڑھی ہوئی کتابوں کو پڑھاتے چلے جانے ان تمام ذرائع سے دماغوں کو جب مانجا جائے ان میں جلا پیدا کی جائے تو ایسے دماغوں کی صلاحیتوں میں جتنا بھی اضافہ ہو، غور وفکر کا مادہ جتنا بھی بڑھتا چلا جائے، احساسات میں نزاکت، شعور کی بیداری میں جتنا بھی اضافہ ہوتا چلا جائے وہ غیر متوقع نہیں ہو سکتا"۔ (برصغیر پاک وہند میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت:۲۹، ۳۰ج۲)

اب جب یہ رجحان تقریباً ناپید ہوا تو ایسی کمزوری کا سامنا تو ضرور ہوگا۔

لیکن اس سے بھی بڑھ کر وجہ ایک اور ہے۔ اور اس کو تسلیم کرنا شاید کڑوا گھونٹ ہو، لیکن والحقُّ أحقُّ أن يُقالَ۔ وہ یہ کہ مدرسین حضرات نے انداز تدریس وہ نہیں اپنایا جو ہمارے اکابرین اور مشائخ کا تھا، وہ کیا انداز اور اسلوب تھا اس کے لئے یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے اس کو پڑھئے اور مستفید ہوتے رہئیں۔

واضح ہو کہ یہ کتاب از اول تا آخر کسی ایک ہاتھ سے لکھی ہوئی تحریر نہیں ہے بلکہ مختلف اکابرین ومشائخ کے مضامین اور محاضرات کا مجموعہ ہے جس میں لازمی طور پر وقفے وقفے سے کچھ صفحات پڑھنے کے بعد تنوع آتا رہے گا، کبھی تو قاری پڑھتے پڑھتے اپنے آپ کو اردو ادب کی چوٹیوں پر بسیرا کرتے ہوئے پائے گا اور کبھی ادبیت کی ان عالی شان چوٹیوں سے دامن کوہ کی طرف اترتے ہوئے محسوس کرے گا، لیکن نشیب وفراز کے اس چلتے ہوئے سلسلے کا تعلق صرف اردو ادب کی حد تک ہوگا "تدریس کے اصول اور سنہری اصول" ہر دو قسم کے مضامین ومحاضرات میں ایک سے ایک ہاتھ آتے رہیں گے۔

بہر حال کچھ اس طرح کرنے سے مضامین کا یہ گلدستہ آپ کے ہاتھ میں ہے، مجموعی اعتبار سے اس کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

پہلا حصہ "صفات مدرس" پر مشتمل ہے، یعنی بحیثیت استاذ ایک مدرس کو کن صفات کا حامل ہونا چاہئے۔

دوسرا حصہ مجموعی اعتبار سے طرق تدریس پر مشتمل ہے، یعنی کسی بھی فن کی کوئی کتاب ہو اس میں طریقۂ تدریس کیا ہونا چاہیے۔

اور تیسرا حصہ بعض خاص خاص علوم اور فنون کے طرق تدریس پر مشتمل ہے، مثلاً صرف اور نحو ابتدائی درجات میں کس طرح پڑھائی جائے اور وسطانی اور اعلیٰ درجات میں کس طرح؟ اسی طرح کتب فقہ ابتدائی درجات میں کس طرح پڑھائی جائے، اور بعد والے درجات میں کس طرح؟۔

اسی طرح تفسیر، درس قرآن، حدیث اور عربی زبان وغیرہ کے متعلق الگ الگ عنوانات دیکر الترقي من الأدنى إلى الأعلى کے اصول کو سامنے رکھ کر ایسے جملہ مضامین کو مرتب کرنے کی اپنی سی کوشش کی گئی ہے۔

آخر میں اپنی ہی ایک تحریر کا اقتباس لگانا شاید مناسب ہوگا جو بندہ نے حضرت مولانا ولی خان المظفر صاحب کی کتاب طرق التدریس واسالیب الامتحان کے لئے مولانا ہی کے حکم کے امتثال میں لکھا تھا:

"کتاب اس قابل ہے ہر مدرس اسے اپنے لئے حرز جان بناکر بلااستیعاب ایک بار نہیں بلکہ بار بار پڑھتا رہے اور اپنی تدریسی زندگی میں ان اسالیب کو نافذ کرتا رہے، کیونکہ ہم آج کل ایک ایسے دور سے گذر رہے ہیں جس میں ہر چیز رو بترقی ہے مثلاً لوہا، لکڑی، پلاسٹک وغیرہ چیزوں سے جو جو چیزیں جس نقش ونگار کے ساتھ تیار ہورہی ہیں ماضی میں ان چیزوں کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا، غرض ہر چیز ہر فن آج رو بترقی ہے رو بتنزل اگر کوئی چیز ہے تو وہ ہماری علمیت ہے اس کے ہر فن میں ترکیز اور ٹھوس پن ختم ہوتا چلا جارہا ہے، میدانِ محنت میں نئے رجال کار کا آنا تقریباً مفقود ہوتا چلا جارہا ہے، جو گنے چنے چند ہستیاں اپنی پیرانہ سالی ضعف اور نقاہت کے باوجود ہر فن میں ماہر اور ہر فتنہ کے سامنے سینہ سپر ہوکر نظر آرہے ہیں وہ حضرات بھی تقریباً اپنی پونجی سامان لپیٹ کر آہستہ آہستہ ہمیں یتیم چھوڑ کر دار بقا کی طرف کوچ کرتے ہوئے چلے جارہے ہیں، فیا أسفا۔ حالانکہ آج کے اس پر فتن دور میں ہم زیادہ محتاج ہیں کہ ہمارے پاس رجال کار ہوں اور ہر فتنہ کا تعاقب کرنا جانتے ہوں اور ہر باطل کو حق پر قائل کرنا جانتے ہوں لیکن نتیجہ : کسی کے سامنے ہے، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہماری بنیاد ہی کچی رہ جاتی ہے اور اس کی ایک وجہ : یہ ہے کہ طلبہ کرام میں محنت کا وہ محنت نہیں رہی جو ماضی کے علماء کرام نے دراسۃ میں کی

ہیں، لیکن اگر سچ بات کہی جائے تو اس سے بڑے سبب کے مرتکب ہم جماعت مدرسین ہیں، اس لئے کہ پڑھاتے وقت یا تو ہم جان چھڑا کر پڑھاتے ہیں یا یہ کہ مبتدئین کو منتہین سمجھ کر ما فوق الاستطاعۃ بحاث میں ان کو الجھا دیتے ہیں، لہذا انتہائی ضرورت ہے ہمیں اپنے رخ کو سیدھا کرنے کی"۔

اللہ کرے قارئین کے لئے مفید ثابت ہو، اور جس مقصد کے لئے یہ قدم اٹھایا گیا ہے اللہ تعالیٰ اُسے وجود نصیب فرمائے، اور دُعا ہے کہ عنداللہ بھی قبول اور منظور ہو، اور استاذ محترم مولانا محمد یاسین صاحب دامت برکاتہم اور ان کے مقدمۃ الجیش اور پیش رو قافلہ (قافلہٗ شہداء) اور جملہ متعلقین، بندہ اور اس کے والدین محترمین اور تمام اساتذہ کرام اور جملہ معاونین کے لئے صدقہ جاریہ ہو، علمی میدان میں اللہ تعالیٰ دن دُگنی رات چگنی ترقیاں نصیب فرمائیں، مرتے دم تک عافیت اور استقامت کے ساتھ اپنے دین عالی کی خدمت نصیب فرمائیں اور خدمت والوں سے جڑا ہوا اور وابستہ رہنے کی توفیق عطا فرمادیں، آگے سے آگے بڑھنے کی اللہ تعالیٰ توفیق مرحمت فرمائیں، آمین یا رب العالمین ــ و یرحم اللّٰہُ عبدًا قال آمینا

سید عبد الرشید بن مقصود ہاشمی

۷ محرم الحرم ۱۴۳۵ھ بروز ہفتہ

پہلا حصہ

صفاتِ مدرس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کامیاب مدرس کی دس نمایاں اور امتیازی خوبیاں

مولانا محمد یزید نعمانی صاحب

مصعب بن زبیر رحمہ اللہ نے اپنے صاحب زادے سے فرمایا: اے میرے لختِ جگر! علم حاصل کرو، اگر تمہارے پاس مال ہوا تو یہ علم تمہارے لئے باعث زینت اور شانِ افتخار ہے، اور اگر تمہارے پاس دنیا کی دولت نہ ہوئی تب بھی یہ علم تمہارے لئے کسی متاعِ بے بہا سے کم نہیں۔

دین اسلام ہر جہت سے کامل واکمل ہے، اِس کے کمالات ومحاسن اور فضائل ومناقب میں سے ایک نمایاں خوبی اور ممتاز وصف علمِ وحی ہے، قرآن وسنت نے جابجا مختلف مقامات پر حصولِ علم کی ترغیب وتشویق دے کر یہ امر واضح کردیا ہے کہ ایک عالم وعارف کبھی بھی کسی جاہل ونداں کے برابر نہیں ہوسکتا، ان کے درمیان کسی مساوات وہمسری کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا، یہ علم ہی ہے جس طرف سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نسبت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: میں معلم واستاذ بناکر بھیجا گیا ہوں، آج بھی جو حضرات تعلیم وتعلم دین سے منسلک اور وابستہ ہیں، ان کی حیثیت، مرتبت اور اہمیت مسلم ہے، بقول حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ:

> "تعلیم (دین) کی حالت دوسرے کاموں کے مقابلے میں ایسی ہے جیسے انجن کا پہیہ، کہ اس کے چکر پر تمام گاڑیوں کو حرکت ہوتی ہے، اگر اس کی حرکت بند ہوجائے تو تمام گاڑیوں کی حرکت بند ہوجائے، مگر اس کی ضرورت کا احساس لوگوں کو نہیں ہوتا، درس وتدریس (دین) سب محکموں کی روح ہے، خواہ تقریر ہو، خواہ تحریر، خواہ تصنیف، سب اسی تعلیم (دین) کی فرع ہیں، مگر اس وقت سب سے زیادہ اسے بے کار سمجھ رکھا ہے، عام طور سے لوگوں کی نظر میں علماء کی وقعت کم ہے"۔ (تحفۃ العلماء ١/٢٩)

آج کے مادہ پرست، ظاہر بیں اور بناوٹ شعار زمانے میں مجموعی طور پر مدارس دینیہ بحمداللہ ایک معلم ومدرس کو اس کا وقار وعزت ویسے ہی فراہم کرتے ہیں، جو اس کے منصب ومقام کا تقاضا ہے، مرورِ ایام نے جہاں طلبہ علوم دینیہ کو تن آساں، سہل پسند اور غفلت کا خوگر بنادیا ہے، وہاں اساتذہ اور مدرسین علوم نبویہ کی ذمہ داریاں اور ان کے بلند رتبہ مقام کے تقاضے بھی پہلے سے کئی گنا بڑھ چکے ہیں، سستی، بے فکری اور عدم توجہی کی اس تاریک وسیاہ فضا میں وہ کون سے ایسے قابل توجہ اسباب وعوامل ہیں جن کو برت کر ایک کامیاب مدرس ومعلم اپنے متعلمین ومنتسبین کی صلاحیتوں کو دو آتشہ کرسکتا ہے؟ جن سے استفادہ کرکے وہ اپنے لئے کامیابی وکامرانی کی راہیں ہموار کرسکتا ہے؟ جن کی بنیاد پر امتِ بیضاء کو معتبر رجال کار اور مستند افرادِ دین مہیا کئے جاسکتے ہیں؟ آیئے! ایک اجمالی مگر موثر انداز میں ان سوالات کا جواب تلاش کریں:۔

۱۔ وقت کی پابندی:

پابندیِ وقت ہر عقل مند انسان کی خوبی ہے، تھوڑے وقت میں زیادہ کام کرنے اور کروانے کا بنیادی اصول مقررہ وقت کا بھرپور اور درست استعمال ہے، اپنے وقت کی کامل حفاظت اور اُسے تول تول کر خرچ کرنا ہی کامیاب تدریس کی جانب پہلا قدم ہے، اس حوالے سے ذراسی بے اتفاقی وبے توجہی اور تساہل نہ صرف علمی، عملی اور اخلاقی رویے کے منافی ہے، بلکہ زیرتدریس شاگردوں پر بھی اس کے برے اور منفی اثرات پڑسکتے ہیں، جو یقیناً ان کے بہتر مستقبل کے حوالے سے زہر قاتل ہے، وقت کا التزام یہ تو اچھی اور قابل تحسین عادت ہے، البتہ اپنے گھنٹے سے قبل دوسرے استاد کے گھنٹے کا وقت لیا جائے اور نہ ہی مقررہ وقت ختم ہونے کے بعد دوسرے مدرس کے اوقات میں بے جا دخل اندازی کی جائے، متعین ساعتوں میں اپنی بات سمیٹنا اور تکمیل تک پہنچانا اخلاقاً وشرعاً ایک مدرس کی ذمہ داری ہے۔

۲۔ تفہیم سے قبل تفہم:

وقت کو معتدل انداز میں اسی وقت اپنے لئے کارآمد اور مفید بنایا جاسکتا ہے جب آپ تعلیم گاہ میں جانے سے پہلے متوقع سبق کو خوب اچھی طرح دیکھ چکے ہوں، بسا اوقات عبارت میں کسی قسم کی غلطی وابہام کی وجہ سے

صحیح معنی اور مفہوم اخذ نہیں ہوپاتا،چنانچہ اس مرحلے کو اگر پہلے ہی عبور کرلیا جائے تو یقیناً آپ مکمل اطمینان وسکون کے ساتھ طلبہ کو سمجھا سکتے ہیں،اسی طرح عبارت کے مالھا وماعلیہا کی آگاہی اور واقفیت سے افہام کا راستہ آسان اور سہل ہوجاتا ہے، سبق کی روانی اور رفتار بھی متاثر نہیں ہوتی۔

یاد رکھئے! سمجھانے سے قبل سمجھنا،بولنے سے پہلے سوچنا اور کرنے سے پیشتر نتائج پہ نظر رکھنا آپ کے انداز تدریس اور معیار تعلیم پر خوش گوار اور دیرپا اثرات ڈال سکتے ہیں۔

۳۔اسلوب تعلیم:

ہر انسان کو خالق کائنات نے مختلف خوبیوں اور محاسن سے نوازا ہے،یہ ضروری نہیں کہ ایک اچھائی اور خوبی کسی انسان میں ہو تو لازماً دوسرے فرد میں بھی پائی جائے، مگر چند ایسی صفات ضرور ہیں جو مشترکہ طور پر ہر انسان کو قدرت کی طرف سے ودیعت کی گئی ہوتی ہیں،یہ الگ بات ہے کہ کون کتنا اور کس خوبی سے اسکو اپنے تصرف میں لاکر اپنے لئے ترقی کی منزلیں قریب کرتا ہے،ایک مقبول اور ہر دل عزیز استاذ کی پہچان اور اس کا تعارف یہ ہے کہ وہ سبق اور درس کو شاگردوں کے ذہن وفہم کے قریب لے آئے،یہ قرب ونزدیکی اس قدر ہو کہ کوئی طالبعلم اس کتاب وسبق سے وحشت وتنگی اور بعد محسوس نہ کرے، لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟

جواب بہت سیدھا اور آسان ہے: درس ہمیشہ تقطیع اور تجزی کے اصول پر پڑھایا جائے،یعنی دانش گاہ میں قدم رکھنے سے قبل ہی آپ ذہناً اس بات کو مستحضر کرلیں کہ آج میرے سبق میں کتنی باتیں،کتنے مباحث،کتنے فائدے اور کتنے نکات ہوں گے؟اس تعیین وتحدید کے بعد عبارت پر ان کو منطبق کردیں۔انشاء اللہ العزیز کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔

۴۔طلبہ کی استعداد:

بلاشبہ ہر اچھے مدرس کی تمنا اور آرزو ہوتی ہے کہ اس کے طلبہ علمی لیاقت اور فنی استعداد میں مضبوط اور پختہ ہوں،اس خواہش کے شگوفے اسی وقت چٹکیں گے جب آپ طلبہ کو بھی اپنی تدریسی عمل کا حصہ بنالیں،اس کی پہلی صورت تو یہ ہے کہ روزانہ کی بنیاد پر ان سے عبارت خوانی کروائی جائے، "سب نہ سہی،ایک

سہی،زیادہ نہ سہی، مختصر سہی" کے اصول اور ضابطے کو سامنے رکھ کر چلا جائے تو بہت کچھ پایا جاسکتا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ: گزشتہ سبق کا حتی الامکان اعادہ کروائیں،چاہے خود سن کر یا آپس میں تقسیم کر کے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ :ہفتے دو ہفتے میں سابقہ خواندگی کا سرسری لیکن تنقیدی جائزہ لیں،ان امور کی رعایت سے استاذ کے ذہن میں خود بھی نئی نئی باتیں اور اچھوتے خیالات جنم لیتے ہیں،جو عمل کی بھٹی سے نکل کر کندن کی صورت اختیار کر جاتے ہیں، ضرورت ہے فقط ہمت اور حوصلہ کی۔

۵۔مصطلحات فن اور طلبہ:

اولین اور بنیادی درجات میں اس بات کا التزام ولحاظ رکھا جائے کہ طلبہ کو صرف ونحو،فقہ واصول فقہ،اصول تفسیر وحدیث اور منطق وبلاغت کے مصطلحات واصطلاحات خوب ازبر ہوں،شروع میں اس اہم اور طالب ریاضت مرحلے کو نظر انداز کر دینے کا نقصان آخر تک نظر آتا ہے،ابتدائی طالب علموں کے اذہان وافکار اس خام مال کی طرح ہیں جسے ماہر اور موقع شناس کاریگر کسی بھی عمدہ سانچے اور خوبصورت ظرف میں ڈھال سکتا ہے، چنانچہ اس وقت کا معیاری اور کامیاب استعمال اسی صورت ممکن ہے جب ان تازہ ذہنوں کو ماہر ومشاق مدرس اپنے متعلقہ فن کی موٹی موٹی تعریفات مثالوں کے ساتھ یاد کراوے جو آگے چل کر ان کے لئے مطولات کے سمجھنے میں مددگار ثابت ہوگا۔

۶۔علمی تشنگی کی آبیاری:

حدیث مبارکہ میں رسول معلم صلی اللہ علیہ وسلم نے اچھے اور نکتہ رس سوال کو آدھا علم فرمایا ہے،سوال یہ ہے کہ طالبان علوم نبوت میں یہ علمی پیاس اور تشنگی کا ذوق وشوق کیسے اور کیوں پیدا ہو سکتا ہے؟ اس کا حل احادیث مبارکہ کی کتب میں موجود ہے،حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے ایک مرتبہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جماعت سے ایک سوال فرمایا،کسی کو جواب نہ آیا،میں جان گیا کہ اس سوال کا کیا جواب ہے،لیکن شرم وحیا اور چھوٹے ہونے کی وجہ سے مجھے بولنے کی ہمت نہ ہوئی۔شیخ عبدالفتاح ابوغدہ رحمہ اللہ اپنی کتاب "الرسول المعلم صلی اللہ علیہ

وسلم وأساليبه في التعليم'' میں مندرجہ حدیث شریف کے حاشیہ میں رقمطراز ہیں:

"استاذ کے لئے مستحب ہے کہ وہ اپنے متعلمین و مستفیدین سے از خود سوال کرے، جس کے ذریعے ان کے اندازِ فہم کی جانچ پرکھ کے ساتھ ساتھ ان میں غور و فکر اور سوچ و بچار کی جانب رغبت و شوق پیدا کرنے کی کاوش شامل ہو، اگرچہ معلم طلبہ کے سامنے اس بات کو اس انداز میں بیان کر چکا ہو، کہ وہ اپنی کم فہمی اور ناسمجھی کی بناء پر اس سوال کی گہرائی اور حقیقت تک نہ پہنچ سکے ہوں"۔(ص ۱۰۸)

۷۔دوران درس ناصحانہ کلمات:

والد اور استاذ کے مابین کلیدی فرق و امتیاز یہ ہے کہ باپ اپنے بچے کی مادی اور ظاہری و جسمانی نشوونما کرتا ہے، جب کہ ایک مشفق و مہربان استاذ کی نظر ہمہ وقت اپنی روحانی اولاد کی سیرت و کردار پہ رہتی ہے، اور کیوں نہ ہو، کہ اس قیمتی اور زریں دور کی کمی اور کجی پوری عمر کا روحانی روگ بن سکتی ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ حقیقت پسند اور نفسیات شناس مدرس اپنے آپ کو فقط کتاب کی تدریس و تعلیم تک محدود نہ کرے، بلکہ دوران درس کوئی نصیحت آموز کلمہ کوئی فکر انگیز واقعہ، کوئی نظریہ ساز جملہ کہہ کر اپنے زیر تربیت نونہالوں کی عملی زندگی کا دھارا بدلنے میں مثبت اور نتیجہ خیز کردار بھی ادا کرے۔

۸۔معتدل مزاجی:

طلبہ کے ساتھ اعتدال، میانہ روی اور دوستانہ رویہ، ان کی فکری، علمی اور ذہنی صلاحیتوں کو ابھارنے اور نکھارنے میں بے حد مفید و معاون ثابت ہوتا ہے، جہاں خشک مزاجی، بے جا غصے کا اظہار اور حد اعتدال سے بڑھی ہوئی سختی اور تشدد آپ کو طالب العلم سے دور کر دیتی ہے، وہاں افراط کی شکار نرمی، طبیعت میں عدم سلیقے کا عنصر اور طلبہ سے فضول گپ شپ بھی درس گاہ کے عمومی اور آپ کے پڑھانے کے خصوصی ماحول کو متاثر و بدنما کرتی ہے، ایسی فضا اور ماحول جس میں توسط و اعتدال کا رنگ نمایاں ہو، آپ کی ذہنی پختگی اور بہترین انتظام کا مظہر سمجھی جائے گی، ورنہ اس معاملے میں کسی بھی قسم کی کمی یا کوتاہی سے پیدا ہونے والے نتائج کا سدباب ناممکن اور محال ہے۔

۹۔طلبہ میں امتحانی شعور اجاگر کرنا:

ایک کسان کے لئے انتہائی خوشی اور مسرت کا سب سے بڑا لمحہ وہ ہوتا ہے جب اسے اپنے ہاتھوں بویا ہوا بیج ــــــ ایک لہلہاتی ہوا کے دوش پر لچکتی اور ہری بھری فصل کی صورت میں نظر آتا ہے، بالکل اسی طرح صاحب دل استاذ کے لئے راحت اور عزت کا مکمل سامان اس وقت میسر ہوتا ہے جب اس کے ہونہار طلبہ امتیازی اور نمایاں حیثیت و مرتبہ حاصل کریں، اگرچہ امتحان دینا شاگرد اور متعلم کا کام ہے، مگر اس کی تیاری کے لئے لائحہ عمل، طریقہ امتحان کی وضاحت اور لکھنے کے ڈھنگ کی صورت گری جیسے مراحل استاذ کے ہاتھوں ہی وقوع پزیر ہوتے ہیں، جائزہ چاہے تحریری ہو یا تقریری، ہر دو کے لئے چند راہنما اور سودمند ہدایات بتلانے سے طالبعلم کا حوصلہ بڑھتا ہے اسے ڈھارس ملتی ہے، اُسے یقین ہوجاتا ہے کہ ایک قوت میری سرپرستی اور راہ دکھلانے والی موجود ہے، اس احساس کا منطقی نتیجہ بہت خوش گوار اور فرحت بخش ہوتا ہے۔

۱۰۔اساتذہ میں باہم جوڑ واتفاق:

کوئی ادارہ، جماعت اور معاشرہ ایک فرد وانسان سے مکمل نہیں ہوتا، مختلف مزاج اور متفرق طبیعتیں مل کر ہی کسی مدرسہ، اسکول اور گھر کو وجود بخشتی ہیں، ان الگ الگ مزاجوں اور طبیعتوں کا کسی امر پر متفق ومتحد ہوجانا، اُس کی پائیداری، مضبوطی اور پختگی کے لئے بنیادی وکلیدی اہمیت رکھتا ہے، اس کے برعکس افتراق وانتشار، فتنہ وفساد اور ٹوٹ پھوٹ کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا، قابل، محنتی اور مخلص استاذ ہمیشہ ایثار پیشہ، منکسر النفس اور اعمال صالحہ کا حریص ہوتا اور رہتا ہے، اس کی ابتداء سے یہ کوشش ہوتی ہے کہ اس کی ذات، کردار اور شخصیت، مدرسہ، اسکول اور ادارے کے مجموعی ماحول کے لئے تکدر اور خرابی کا باعث وسبب نہ بنے، اس کے کسی قول وعمل سے دوسرے کی دل آزاری اور دل شکنی نہ ہو، ایک شخص اور فرد کا یہ عزم، ارادہ اور نیت پورے ادارے اور جماعت کے استحکام ودوام کا ذریعہ بن سکتا ہے، وگرنہ ایک چنگاری ہی پورے ڈھیر کو راکھ بنادینے کے لئے کافی ہوجاتی ہے، اللہ رب العزت ہم سب کو صحیح معنوں میں دین کا خادم وسپاہی بنائیں! آمین۔ (ماہنامہ دار العلوم دیوبند جنوری ۲۰۱۲ء)

استاذ کی چند خوبیاں

شیخ الحدیث حضرت مولانا نذیر احمد صاحب رحمہ اللہ

ا۔ سبق میں حاضری:

مدرس کا فریضہ ہے کہ درس گاہ میں وقت پر حاضر ہو، اور تمام وقت طلبہ پر لگائے، جس جماعت کا یہ گھنٹہ ہے وہ اس جماعت اور سبق کا حق ہے، اس میں کوتاہی کرنا حق تلفی ہے، تنخواہ پورے گھنٹے کی ملے گی اور اگر پورا گھنٹہ نہ دیا تو خیانت متصور ہوگی، اور اتنے حصہ کی تنخواہ بھی حلال نہ رہے گی، ناشتہ، وضوء یا غسل کریں، کپڑے تبدیل کریں، سب شرعی وطبعی ضروریات بہر کیف پوری کریں، لیکن اوقات مدرسہ میں درس گاہ میں پہنچنے کو یقینی بنائے رکھیں، تاخیر کو زندگی کا حادثہ سمجھیں، معمول نہ بنائیں۔

کسی حادثۂ مسرت یا حادثۂ غم کا ایسا اثر اپنی طبیعت پر ظاہر نہ ہونے دیں جو تقریر وتدریس کے نشاط میں مانع ہو، صاف ستھرے کپڑے اور جسم، توجہ کامل، انتہائی کیف وسرور کے ساتھ علم کے منظم موتیوں کے ہار اپنے ذہن کے "بریف کیس" میں مرتب کرکے درسگاہ میں پہنچیں، سبق اور طلبہ پر حاوی رہیں، اپنی دھن میں مست اور منہمک رہیں اور طلبہ کو بھی اسی دھن میں مست رکھنے کا اہتمام کریں۔

سبق سے پہلے اگر اشراق کا وقت ہو چکا ہو تو دو رکعت نفل پڑھ لیں، جس میں تداخل نیات ہو، یہ نفل "صلاۃ التوبہ" بھی ہوں، اے اللہ! میرے مطالعہ کی خامیاں دور کردے، گناہوں کی ظلمات کے اثرات دور کردے کہ وہ تقریر پر چھا نہ جائیں، اور "صلاۃ الحاجۃ" کی بھی نیت ہو کہ میں نے جو مطالعہ کیا ہے اس کو سہل انداز سے منتقل کرنے کی توفیق عطاء فرمائے، انشاء اللہ یہ سونے پر سہاگہ کا کام دے گا، ورنہ کم از کم استاذ باوضوء ہو، وضوء سے نور قلب حاصل ہوتا ہے، باوضوء اور بے وضوء پڑھانے میں زندہ اور مردہ کا فرق ہے، غذا وغیرہ کی ترتیب ایسی رکھیں جس سے وضوء باقی رکھنے میں مدد ملے۔

جب مطالعہ کامل ہوگا اور طلبہ کو فیض پہنچانا استاد کی زندگی کا مقصد ہوگا اور طبیعت بھی مشوش نہ ہوگی، مجلس علم بھی نشاط سے بھرپور ہوگی تو سبق کا یہ کیف وسرور استاد کو کتنا چڑھائے گا اور طلبہ کے شوق میں کیا تلاطم پیدا کرے گا، اور ان میں علم کی کیسی مستی پیدا کرے گا؟ چکھنے کی چیز چکھ کر ہی معلوم ہوگی۔

۲۔ سبق کی نشست:

استاد کو درس گاہ میں ایسے بیٹھنا چاہئے کہ جس میں وقار بھی ہو اور عاجزی اور مسکنت بھی، چستی بھی ہو تیقظ بھی، طلبہ کو بھی ان ہیئات واوضاع کا عادی بنائے، تپائیاں سیدھی ہوں، طلبہ سیدھے قطار میں بیٹھے ہوں، بیٹھنے کے حلقے کا اسلوب متعین ہو، طالب علمانہ ہیئت سے بیٹھے ہوں، چونکہ ظاہر باطن میں موثر ہوتا ہے اس لئے اس حسن صورت کا حقیقت تک رسائی میں بہت تعاون ہوگا، ان طلبہ کا معمول بنادیں کہ ان کی نظر استاد اور کتاب ہی کی طرف رہے، دائیں بائیں یا پیچھے مڑکر دیکھنا ایسا مزاج بالکل نہ بننے دیا جائے۔

درسگاہ اور امتحانی ہال اور نماز میں ان اوضاع کو بڑی شفقت سے بچوں کی طبیعت بنادیں، جب بچوں کی طبیعت ہی ایسی بن جائے گی تو سختی کی ضرورت پیش نہیں آئے گی، ڈھیل دے دے کر طلباء کو بری اوضاع کا عادی بناکر ان کو روکنا سختی سمجھا جائے گا، اس لئے ابتداء ہی سے ان کی مزاج سازی کریں۔

بچوں کی تربیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ڈنڈا لے کر ان کے پیچھے پڑ جاؤ، ڈنڈے سے وقتی طور پر تو بچے دب جائیں گے لیکن ان کی مزاج سازی نہیں ہوگی، ڈنڈے کے بغیر ان کی طبیعت اور عادت کو صحیح رخ عطاء کریں، اگر آپ ان کو سیدھا کرکے بٹھا نہیں سکتے تو پڑھائیں گے کیا؟۔

یہ ساری کمزوریاں استاد کی طرف سے آتی ہیں، استاد توجہ اور تیقظ سے بیٹھے گا تو شاگرد بھی اسی طرح بیٹھیں گے۔

بحیثیت مدرس کامیاب استاذ کی صفات

از استاذ محترم
حضرت مولانا ڈاکٹر عبد الرزاق اسکندر صاحب دامت برکاتہم العالیہ
مہتمم ازہر الہند جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن

تعلیم وتدریس ایک شریف اور قابل احترام فن ہے جس کے لئے کچھ شرائط اور آداب ہیں جن کا جاننا اور ان کی عملی مشق کرنا ایسا ہی ضروری ہے جیسے ہر فن کو سیکھنے کے لئے اس کی عملی مشق ضروری ہوتی ہے۔

فنِّ تدریس کے لئے ذوق، فطری صلاحیت، اور پھر اسے حاصل کرنے کے لئے توجہ، محنت اور مشقت کی ضرورت ہے، تاکہ اسے سیکھنے والا ایک معلم کامل بن کر نکلے، اور اس میں ایک "کامیاب استاذ" کی صفات اور خصائص موجود ہوں، اور جب وہ تدریس کے میدان میں قدم رکھے توطلبہ اس سے مستفید ہوں، اور اس کے تجربہ میں اضافہ ہوتا رہے، اور وہ خود علمی اور روحانی لذت محسوس کرے۔

تعلیم وتدریس ایک مقدس منصب ہے اور سید الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلی صفات میں سے ایک صفت اور فرائض نبوت میں سے ایک فریضہ ہے، ارشاد باری ہے: {لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ}۔

لہذا جو عالم دین، قرآن کریم یا کسی شرعی علم کی تدریس کا کام سرانجام دے رہا ہے، وہ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت کر رہا ہے، لہذا اسے یہ جاننا چاہئے کہ وہ ایک سعادتمند انسان ہے، اور اسے یہ سعادتمندی مبارک ہو، ان شرعی علوم میں ایک علم "عربی زبان" بھی ہے، جو قرآن کریم کی زبان، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان، اور شریعت اسلامیہ کی زبان ہے، چونکہ تعلیم وتربیت کے ذریعہ استاذ کے اثرات

شاگرد پر پڑتے ہیں،اس لئے اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کوامت کیلئے معلم اور مربی بناکر بھیجا، اورآپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم وتربیت خودفرمائی{وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ} اورخوب تربیت فرمائی {وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ}اس لئے آپ ایک اعلیٰ اورکامل معلم تھے،ایساباکمال معلم نہ آپ سے پہلے کسی نے دیکھااورنہ آپ کے بعدکسی نے دیکھا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اعلیٰ صفات میں کمال علم،عظیم حکمت،اعلیٰ اخلاق، شاگردوں کے ساتھ شفقت اوررحمت،ان کی تعلیم وتربیت کیلئے نہایت عمدہ اور مفید اسالیب کا استعمال،اوران کی خبرگیری جیسے صفات اپنے کمال کی انتہاء کوپہنچے ہوئے تھے۔

اس لئے جومعلم اوراستاذآپ صلی اللہ علیہ وسلم کانائب بنناچاہے اورفن تدریس میں کمال تک پہنچنے کاخواہشمند ہوتواسے چاہئے کہ پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صفات وکمالات جو اس میدان سے متعلق ہیں معلوم کرے،اورپھران صفات میں آپ کے نقش قدم پرچلے،ارشادباری ہے:{لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ}۔

اب میں اختصارکے ساتھ چندایسی صفات کاذکرکرونگا جو ایک کامیاب استاذ اور مدرس کیلئے ضروری ہیں،اورانکی مثالوں کی طرف اشارہ کرتاجاؤنگاکیونکہ میرے سامنے اس وقت دورہ حدیث سے فارغ ہونے والے فضلاء ہیں،اوریہ مثالیں اُن کے ذہنوں میں ابھی تروتازہ ہیں،کیونکہ وہ حال ہی میں احادیث پڑھ کرفارغ ہوئے ہیں۔

ا۔علم میں کمال:

"کامیاب استاذ" کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ امکانی حدتک علم میں کمال رکھتاہو، خصوصا اس مضمون اورفن میں جس کے پڑھانے کی اس پرذمہ داری ڈالی گئی ہے،کیونکہ استاذ کوجس مضمون میں جتنی مہارت اوردست رَس ہوگی اتنی ہی وہ طلبہ کوفائدہ پہنچاسکے گا، لہذا متعلقہ مضمون میں کمال حاصل کرنے کے لئے استاذکوچاہئے کہ وہ اس مضمون کی بنیادی کتابیں ہمیشہ اپنے زیر مطالعہ رکھے، اور جو کتاب اسے پڑھانی ہے اُسے باربار دیکھے، اور دوران مطالعہ اگرکسی عبارت یاکسی مسئلہ کے سمجھنے میں دقت پیش آئے تواپنے

استاذ سے مراجعت کرے،اور اگراپنا استاذ نہ ہو تو اس مضمون کے کسی ماہر اُستاذ سے رجوع کرے، اور اُس سے پوچھے اور اس کے ساتھ مذاکرہ کرے،اوراس میں شرم محسوس نہ کرے کیوں کہ علم حاصل کرنے میں شرم نہیں۔

۲۔فصاحت وبلاغت:

ایک "کامیاب استاذ" کیلئے فصیح وبلیغ ہوناضروری ہے لہذا جس زبان میں وہ طلبہ کو پڑھارہاہے،اس پراُسے دست رس حاصل ہونی چاہئے تاکہ وہ مافی الضمیراور کتاب کے مضمون کو فصیح وبلیغ انداز میں طلبہ کے سامنے پیش کرسکے،اورایک معمولی صلاحیت رکھنے والا طالب علم بھی اسے سمجھ سکے،اوردوران تدریس وہ زبان استعمال کرے جو سامنے بیٹھنے والے طلبہ کی ذہنی سطح کے مطابق ہو،نہ اُس سے اُونچی جوان کی سمجھ سے بالاترہو اور نہ اتنی نیچے جو عوامی سطح پر اتر آئے۔

گفتگو میں ایک ربط اور ترتیب ہو، ٹھہر ٹھہر کر بولے، جلدی نہ کرے، تاکہ سننے والا اس کے ہر جملہ کو سنے اور سمجھ جائے، اور اگر مضمون ایسا ہو جس میں جملوں کو دُھرانے اور بار بار کہنے کی ضرورت ہے، تو انہیں بار بار دُھرائے، خصوصًا جب عربی زبان کا مضمون ہو۔

حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بحیثیت "معلم کامل" آپ کی صفات بیان کرتے ہوئے اندازِ گفتگو کے بارے میں فرماتی ہیں: كانَ رسول اللهِ صلى الله عليه وسلم لايسرد الكلام كسردِكم، ولكن إذا تكلَّم تكلَّم بكلامٍ فصلٍ، يحفظه من سمعه۔(الجامع لاخلاق الراوی وآداب السامع للخطیب:۲/۱۲۴)

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہاری طرح جلدی جلدی گفتگو نہیں فرماتے تھے، لیکن آپ جب گفتگو فرماتے تو ٹھہر ٹھہر کر گفتگو فرماتے جو بھی اُسے سُنتا وہ اُسے یاد کرلیتا۔

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو کے بارے میں فرماتے ہیں کہ أنّه كان إذا تكلَّم بكلمةٍ أعادَها ثلاثًا، حتى تفهم عنه۔ (صحیح بخاری:۱/۱۲۴) یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب گفتگو فرماتے تو بوقت ضرورت اسے تین بار دُھراتے، تاکہ سننے والے اسے اچھی طرح

سمجھ جائیں۔

۳۔اسالیب اور اندازِ تعلیم:

"کامیاب استاذ" کی صفات میں سے ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ تدریس کے مختلف اسالیب اور انداز سے واقف ہو، اور یہ جانتا ہو کہ کس فن کو کس طرح پڑھایا جاتا ہے، اور خصوصًا اس فن کو جسے وہ پڑھارہا ہے، اور یہ بھی جانتا ہو کہ مضمون یا طلبہ کے بدلنے سے اسلوب کس طرح بدلا جاتا ہے۔

(عربی زبان غیر عرب کو آپ کیسے پڑھائے؟)

فرمودہ حضرت علامہ شمس الحق افغانی رحمہ اللہ

ایک مدرس کو درس کی تیاری کے لئے تین بار مطالعہ کرنا چاہئے:

پہلی بار فہم کے لئے، دوسری بار افہام کے لئے اور تیسری بار تسہیل کے لئے۔ یعنی پہلے اتنا مطالعہ کرے کہ مضمون کو خود اچھی طرح سمجھ لے پھر دوبارہ کر کے طالب علم تک علم منتقل کرنے کی ترتیب ذہن میں بنالے، پھر تیسری بار مطالعہ کر کے اس ترتیب میں آسانی پیدا کرے تاکہ طالب علم تھوڑے وقت میں نہایت آسانی سے سمجھ جائے۔

مثالی استاذ کے اوصاف

حضرت مولانا مفتی غلام الرحمن صاحب مدیر جامعہ عثمانیہ پشاور

ملاحظہ: مفتی صاحب کا یہ مضمون اگرچہ اسکول کالج کے اساتذہ کے لئے لکھا گیا تھا اس لئے بعض کچھ ایسے اصطلاحات بھی سامنے آئے گی جو انہیں اساتذہ سے متعلق ہیں البتہ بیان کی گئی صفات ساری ایسی ہیں جو ہر ایک استاذ میں ہونی چاہئیں اس لئے اسے یہاں شامل کیا جارہا ہے۔

ماہرین تعلیم کا کہنا ہے کہ اچھے تعلیمی ادارے کا قیام تکونی شکل پر موقوف ہے، جب تک یہ چیزیں کسی ادارے کو میسر نہ ہوں، تو اس کو معیاری ادارہ کہنا مشکل ہے، اور نہ اس کے بغیر ادارہ اپنا وجود منوا سکتا ہے، وہ تین چیزیں یہ ہیں:

(۱) ــــ بامقصد نصاب تعلیم۔(۲)ــــ تعلیمی ماحول۔(۳)ــــ بہتر استاذ کا ہونا۔

پھر بھی اول الذکر دونوں چیزوں کی موجودگی میں کامیابی سے ہمکنار ہونا مشکل ہے، اچھا نصاب ہی کیوں نہ ہو، مصنوعی طور پر ماحول بھی بن جائے لیکن جب تک "اچھا استاذ" میسر نہ ہو تو یہ دونوں چیزیں افادیت کھو بیٹھتی ہیں، ہاں اگر "اچھا استاذ" ہو تو وہ درخت کے نیچے بیٹھ کر بھی تعلیمی ماحول بنا سکتا ہے، اور مقررہ نصاب کا جوڑ معاشرے سے پیدا کر کے بچوں کو معاشرتی ضرورت کے مطابق تیار کر سکتا ہے، چنانچہ برطانیہ کے نظام تعلیم کے مطالعہ کے دوران ہمیں بتایا گیا کہ بعض اساتذہ ایسے ہوتے ہیں جو حکومت کے مقرر کردہ نصاب کی کتابیں ایک طرف رکھ کر طلبہ وطالبات کو مختصر وقت میں اتنا کچھ پڑھا دیتے ہیں کہ جس کی وجہ سے بچوں کو مقررہ نصاب کی کتابیں پڑھنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

اچھا استاد کون ہوتا ہے؟

ممکن ہے کسی دوسرے میدان میں اچھائی اور بہتری میں تفاوت ہو، کوئی معیشت کی نظر سے دیکھے، کسی کو وفاداری میں بہتری محسوس ہو، اور کسی کو چاپلوسی میں اچھائی نظر آئے، لیکن تعلیمی ماحول کے حوالہ

سے بہتری کا معیار طلبہ وطالبات کے مفادات کے تحفظ کے ارد گرد گھومتا ہے، "اچھا استاد" وہ ہے جس سے بچے اور بچیاں زیادہ سے زیادہ استفادہ کر سکیں، بحیثیت مسلمان ہمارا ایمان ہے کہ کرۂ ارض پر آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کوئی اچھا استاد نہیں آیا، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے معلم بنا کر بھیجا۔اس لئے بحیثیت مسلمان بطور آئیڈیل اچھا استاد ہمارے لئے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

تعلیمی ماہرین کے نزدیک ایک اچھے استاد میں چند خوبیوں کا نمایاں ہونا ضروری ہے، ان خوبیوں سے لیس ہوکر وہ معاشرے میں بہتر کردار ادا کر سکتا ہے۔

متعلقہ فن پر عبور:

یہ استاد کی بنیادی خوبی ہے کہ جو کچھ پڑھائے اس کے بارے میں اسے گہرائی تک آگاہی ہو، سرسری معلومات سے استاد طلبہ کا حق ادا نہیں کر سکتا، کتاب میں جو کچھ لکھا ہے اس کے علاوہ بھی موضوع کے بارے میں استاد کی آگاہی ضروری ہے، تب جاکے ایک موضوع پر سیر حاصل بحث کرکے موضوع کا حق ادا ہوسکتا ہے، موضوع کے بارے میں آگاہی حاصل کرنے کے لئے کسی دوسرے کے نوٹس پر اکتفا کرنا، یا آئے دن بازاروں میں ترجمے، خلاصے اور گائیڈ حاصل کرکے طلبہ کو وہی پڑھانے سے موضوع کا حق ادا کرنا مشکل ہے، کیونکہ ایسے مواد غیر معیاری ہوتے ہیں، ہاں کسی کے تجربے سے فائدہ اٹھانا کوئی بری بات نہیں، لیکن یہ ایک غیر سنجیدہ حرکت ہے کہ کوئی استاد کسی دوسرے استاد کی کاپی یا تقریر کا فوٹو اسٹیٹ سامنے رکھ کر بچوں کو اس کا املاء کرائے، استاد کی شخصیت اس سے بنے گی کہ اس کے سبق کا انداز طلبہ کی استعداد اور ظرف کو دیکھ کر نرالا ہو، استاد کے انداز بیاں سے، انفرادیت کے انتزاع سے اس کی علمی شخصیت میں اضافہ ہوگا، بعض اوقات استاد کوئی غیر معیاری بات کلاس میں کہہ دیتا ہے جو شاید بچوں کی دسترس میں نہ ہو، بچے اس وقت اس کا مواخذہ نہ کرسکیں لیکن اگر غلط بات بچے کاپی میں لکھ دیں تو کل جس کے پاس یہ کاپی جائے گی استاد کی کمزوری اس پر عیاں ہوگی، یہ بھی ممکن ہے کہ اس وقت یہ راز فاش نہ ہو لیکن کل یہ بچے بڑے ہوکر کسی غلط لفظ کو لاشعوری طور پر دہرائیں اور کوئی ان کا مواخذہ کرے یا

خود پڑھانے کے دوران ان کو غلطی کا احساس ہوجائے تو اس وقت استاد کی کمزوری طالب یا طالبہ پر عیاں ہونے کی وجہ سے وہ عظمت باقی نہ رہے گی جو شاگرد کے ذہن میں استاد کے بارے میں ہونی چاہئے۔

آپ یوں سمجھیں کہ آپ کے تلامذہ اور شاگرد آپ کے ترجمان اور آئینہ ہیں، آپ کو موضوع کے بارے میں جو معلومات ہیں اور آپ طلبہ کو جو بتاتے ہیں بچے یہ معلومات ایک دوسرے کو منتقل کرتے ہیں، یہ بھی ممکن ہے آپ جب کلاس میں موضوع کے بارے میں کوئی غیر معیاری بات کہہ دیں تو آپ کی کلاس کے بچے جدید ذرائع معلومات کی وجہ سے بہت چالاک ہیں، ممکن ہے ٹی وی، انٹرنیٹ کی وجہ سے بچے کے پاس معیاری معلومات ہوں، اس وقت شاگردوں کے ذہن میں استاد کی اہمیت گرجاتی ہے، بلکہ آپ ایک لفظ کے غلط تلفظ یا معنی بتلانے سے اپنی حیثیت کھو بیٹھتے ہیں، اسی لئے کلاس میں جانے سے پہلے خوب تیاری کریں، اس کے لئے آپ اسکول کے وقت کے علاوہ کوئی وقت نکالیں جس میں آپ کل پڑھائے جانے والے سبق کا مطالعہ کریں۔

اسکول ٹیچرز میں یہ عادت کم ہے، البتہ دینی مدارس کے اساتذہ کے ہاں اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں بلکہ بعض اساتذہ ایسے ہوتے ہیں جو چھوٹی سے چھوٹی کتاب بغیر مطالعہ کے نہیں پڑھاتے، پیشگی مطالعہ کی عادت بننے سے آپ کے پاس معلومات کا ایک وسیع ذخیرہ جمع ہوسکتا ہے، کیونکہ آپ ایک سال اگر کسی سبق کے بارے میں کسی نکتہ سے آگاہی حاصل کریں تو یہ اپنی ذاتی کتاب کے حاشیہ میں نوٹ کرکے محفوظ کرلیں، آیندہ سال اس پر طائرانہ نظر ڈالیں لیکن صرف اس پر اکتفا نہ کریں، بلکہ مزید تلاش میں رہیں، رفتہ رفتہ یوں تلاش کے جذبہ سے آپ کو اس کتاب کے بارے میں یا اس کے موضوع کے بارے میں زیادہ مواد میسر ہوگا، لیکن زیادہ معلومات میسر ہونے پر آپ کا بحیثیت استاد ایک دوسرا امتحان شروع ہوجاتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ طلبہ کو معلومات کی ڈکشنری مہیا کریں، آپ زیادہ معلومات کی وجہ سے طلبہ پر ناقابل تحمل بوجھ نہ ڈالیں، آپ ان معلومات میں سے طلبہ وطالبات کے ظرف، ذہن اور استعداد وصلاحیت کو مدنظر رکھتے ہوئے انتخاب کریں، یوں آپ کا لیکچر اور پڑھائی موضوع کے بارے میں آپ کی معلومات کا خلاصہ ہوگا، یہ خلاصہ جتنا معیاری ہوگا اس سے آپ کی شخصیت ابھرے گی۔

آپ کے خلاصۂ سبق میں معلومات کے انتخاب کے ساتھ ساتھ الفاظ کا چناؤ اور جملوں کا انتخاب بھی ضروری ہے تاکہ آپ سبق آسان اور سلیس الفاظ میں پیش کر سکیں، آپ کا سبق جتنا جاذب ہوگا اتنا شاگردوں کو اخذ کرنے میں آسانی رہے گی۔

معلومات کو منتقل کرنے کی صلاحیت:

یہ استاد کی دوسری اہم خوبی ہے کہ اس کے ذہن میں جو کچھ ہے وہ بچوں کو کیسے منتقل ہو، بعض اساتذہ ذاتی طور پر ذہین ہوتے ہیں، ان کے پاس سبق کے بارے میں بہت سی معلومات ہوتی ہیں لیکن استاد کے سینہ سے علم شاگردوں کی طرف کیسے منتقل ہوگا، اس کے لئے استاد میں مزید صلاحیت کی ضرورت ہے، بعض لوگوں میں خداداد صلاحیتیں ہوتی ہیں کہ وہ ان کی زبان کھلتے ہی تلامذہ اور شاگردوں کی طرف منتقل ہونا شروع ہوجاتی ہیں، ایسے لوگ فطری طور پر استاد ہوتے ہیں اور فطری صلاحیتوں کی وجہ سے رب کائنات کی صفتِ علم کا مظہر اور عوام وخواص کے لئے مرجع ہوتے ہیں اور بعض لوگ خود اپنے تجربے یا دوسروں کے تجربات سے استفادہ کرکے انتقال علم کی خصوصیت حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔

آپ یہ نہ بھولیں کہ آپ کے انداز بیان، الفاظ کے چناؤ اور جملوں کے انتخاب پر انتقال علم موقوف ہے، بلکہ آپ کی وضع قطع کا بھی اس پر بڑا اثر ہوتا ہے، بعض استاد یا استانی معصوم بچوں پر رعب جمانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ بچے مرعوب رہیں، یاد رکھیں! اس میں اگر آپ کا ذخیرہ معلومات بچوں کی طرف منتقل ہو تو وہ ادھورا ہوگا، کلاس میں داخل ہوتے ہی آپ کی شخصیت جاذب ہونی چاہیے، آپ کی وضع قطع، نشست وبرخاست اور گفتگو میں بچوں کو مانوس بنانے کی کیفیت پائی جاتی ہو، کلاس میں داخل ہوتے ہی بچے اور بچیاں آپ کی موجودگی کو نعمت خداوندی تصور کریں، نہ کہ عذابِ الٰہی کا نزول سمجھیں، ایسا ہی کلاس سے نکلتے وقت آپ بچوں کا دل ساتھ لے کر نکلیں کہ بچے آپ کے کلاس سے نکلنے پر ایک قسم کا بوجھ محسوس کریں اور یہ کہیں، کاش! یہ استاد یا استانی مزید کچھ وقت دے، یہ نہ سمجھیں کہ شکر ہے جان چھوٹ گئی۔

تعلیمی ماہرین کا کہنا ہے کہ آپ بچوں کو مانوس بنانے کے لئے سبق کے بارے میں کوئی اسٹوری، قصہ یا دلچسپی کا مواد پیش کریں، آپ بچوں سے یوں پیش آئیں جیسا کہ یہ آپ کے بچے ہیں، اس لئے بچوں کو مارنا، پیٹنا، ذہنی ٹارچر دینا بچوں کی شخصیت کو گرانا، تعلیمی اصولوں کے منافی ہے، اخلاق، قانون اور شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی کہ استاد بچوں کو تعذیب دے، تادیب الگ چیز ہے جس کی اجازت شریعت میں پائی جاتی ہے، برطانیہ کے تعلیمی ماحول میں "آوٹ ڈور روم" اس کی مثال ہے کہ جہاں بھی بچے یا بچی کلاس میں تعلیمی ماحول پر اثر انداز ہوں اور دوسرے بچوں کا وقت ضائع کرنے کا ذریعہ ہوں تو اس بچے کو کلاس سے باہر نکال کر پرنسپل کے دفتر میں بھیجیں جو اس کی نفسیات کو سامنے رکھتے ہوئے اس کی اصلاح کی کوشش کرے جو ایک الگ موضوع ہے، لیکن یہ استاد کے فرائض منصبی کے مخالف ہے کہ وہ ڈنڈا لے کے بچوں کو مارے یا کسی جسمانی سزا کو ذریعہ اصلاح بنائے، آپ یاد رکھیں کہ مارنے پیٹنے سے بچے بنتے نہیں بلکہ بگڑتے ہیں، بچوں کو سزا دینے سے آپ اور بچوں کے درمیان خلیج بن سکتا ہے جس کے ہوتے ہوئے آپ کا ذخیرہ معلومات بچوں کو منتقل نہیں ہوگا، بلکہ بچوں کی سزا کا علم جب والدین کو ہوجائے تو اس سے یہ خلیج وسیع سے وسیع تر ہوجاتی ہے، پھر آپ کے رویہ سے اس خلیج کو پار کرنا آپ کے اختیار میں نہیں رہے گا۔

بچوں کے تقاضوں سے آگاہی:

استاد کی اہم تیسری خوبی، اس کا بنیادی تعلق تعلیمی نفسیات سے ہے، ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارے دینی مدارس میں اس کی اہمیت سے ذمہ دار لوگ غفلت کا شکار ہیں، البتہ عصری اداروں میں کچھ درجہ تک اس کی رعایت رکھی جاتی ہے، بعض اوقات اساتذہ بچوں سے جو توقعات رکھتے ہیں وہ ان کی عمر اور طبیعت سے ہم آہنگ نہیں ہوتیں، جس کے نتیجے میں بچوں میں نافرمانی کی عادت پڑجاتی ہے، نفسیات انسان کی ضرورت ہے، ان کو مسدود کرنا کئی بیماریوں اور کمزوریوں کو جنم دیتا ہے، اس لئے بچوں کی نفسیات کو سامنے رکھتے ہوئے ان کے لئے لائحہ عمل بنائیں، بچوں کی نفسیات کو مسدود رکھنے کی بجائے ان کی اصلاح پر توجہ دیں، کہتے ہیں:

ھنفسیات پانی کی مانند ہے اگر پانی زمین سے نکلے تو اس کو متبادل راستہ دیں ورنہ وہ خود اپنے لئے راستہ بناتا ہے"۔

اس لئے جہاں کہیں بچوں کی نفسیات کی اصلاح کا پہلو نہ ہو تو وہاں بچے جھوٹ بولنا، دھوکہ دہی، استاد کی نافرمانی اور بغاوت جیسی حرکت پر آمادہ ہوتے ہیں، استاد کا یہ کمال ہے کہ وہ بچوں اور بچیوں کو پڑھاتے وقت فاصلے ختم کرے، ذہنی طور پر جتنا قرب ہوگا اتنا ہی بچے زیادہ استفادہ کریں گے، چنانچہ جبرائیل امین علیہ السلام نے خدمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوکے جہاں طلب علم کے اصول بتلائے اس میں شاگرد اور استاد کے درمیان قرب کو خاص اہمیت حاصل ہے، استاد اور شاگرد کے درمیان فاصلے مٹانے کے لئے یہ چیزیں ضروری ہیں کہ سب کے درمیان میں ہم آہنگی رہے، یہ تو نہیں ہوسکتا کہ بچے اور بچیاں اس اسٹیج پر پہنچیں جس مقام پر استاد فائز ہو، وہاں یہ ممکن ہے کہ استاد نیچے اتر کر بچوں کے معیار پر آئے، گویا آپ کلاس میں جاکے بات کروگے تو اس میں آپ کو کلاس کا ایک بچہ یا بچی بن کے پڑھانا ہوگا، آپ کو اندازہ ہوگا کہ ماں جب چھوٹے بچے کو باتیں سکھاتی ہے تو وہ بچے کے زبان میں ادھوری باتیں کرنے کی کوشش کرتی ہے کہ بچہ سیکھ جائے، اسی طرح اگر آپ اپنے معیار سے بچوں کے معیار پر آجائیں تو اس سے بچوں کے تقاضوں کو سمجھنے میں آسانی رہے گی، جب بھی آپ کلاس میں بچوں کے تقاضوں کے ادراک میں کامیاب ہوں تو پھر آپ بچوں کو گیم کا وقت بھی دیں گے، ان کی قوت فہم کو سامنے رکھتے ہوئے ان سے اس کے مطابق تقاضے کریں گے، استاد یا استانی کے لئے کلاس کے ایک فرد کی حیثیت اختیار کرنے سے فاصلے مٹ جائیں گے، یہی وجہ ہے ابن خلدون کا کہنا ہے کہ چھوٹے بچوں کو پڑھانے سے استاد میں بچوں کی عادتیں پیدا ہوجاتیں ہیں۔

وفاداری کا ثبوت:

میرے خیال میں یہ تمام خوبیاں ایک استاد میں تب پیدا ہوسکتی ہیں جب استاد اپنے فن اور پیشہ سے وفادار ہو، عملی میدان میں زندگی کے کسی بھی شعبہ میں وفاداری کا ثبوت دیئے بغیر کامیابی ناممکن ہے، ڈاکٹر، انجینئر، زمیندار جو بھی جس فن میں نام پیدا کرنے کی خواہش رکھے اور کام کرے تو اس کے لئے

اس فن سے وفاداری کا ثبوت پیش کرنا ضروری ہے، ایک استاد یا استانی جب تدریس کے شعبہ سے مخلص ہو تب جاکر یہ اچھا استاد ثابت ہوسکتا ہے، کیوں نہ ہو جب کہ تدریس صرف حصول رزق کا ذریعہ نہیں اور نہ ایک پیشہ ہے بلکہ یہ عبادت کا اہم ذریعہ ہے، جب نیت خالص ہو تو ایک پیشہ اختیار کرنے سے خلافت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم سعادت سے انسان بہرہ ور ہوسکتا ہے، وفاداری کی صورت خود استاد ماحول بن کر سامنے آتا ہے، اسے تنخواہ سے غرض نہیں، وسائل بٹورنا کام نہیں، بلکہ فن سے والہانہ جذبہ رکھتے ہوئے ہر وقت تعلیمی میدان میں منہمک رہے، ایسے شخص کے لئے کام بوجھ نہیں بلکہ غذا بن جاتا ہے، جس سے اس کی طبعی خواہش کی آبیاری ہوتی ہے، میرا تجربہ ہے کہ استاد اپنے پیشے سے وفاداری کی صورت میں مفادات کے خول میں نہیں پھنستا اور نہ وہ اپنے شعبہ کو چھوڑ کے دوسرے میدان میں جانے کی کوشش کرتا ہے، "استادی" ہی اس کا اوڑھنا، بچھونا رہتا ہے، یہی اس کی زندگی ہوتی ہے اور یہی اس کا جینا اور مرنا ہوتا ہے۔

ہمارے نظام تعلیم کی خامی ہے کہ سیاسی دخل اندازی کی وجہ سے اچھے اچھے اساتذہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے، کبھی کسی استاد کو اسکول سے اٹھاکر دفتر میں بٹھاتے ہیں اور کبھی ماہر دفتر کو اسکول بھیج کر طلبہ کی زندگیوں سے کھیلا جاتا ہے، گزشتہ حکومت کے دور میں جب ایجوکیشن کے حوالہ سے میں نے یہ مشورہ دیا کہ دفتر اور تعلیمی اداروں کو الگ رکھ کر اساتذہ اور منتظمین کی الگ الگ کٹیگریاں رکھیں، اگرچہ اس وقت اساتذہ کی تنظیمیں اس کے خلاف شور مچاتی رہیں لیکن آخر کار ان کو سر جھکانا پڑا، چنانچہ موجودہ حکومت نے اس پر عمل شروع کیا ہے، اس سے اچھے اساتذہ کی کارکردگی کو تحفظ ملے گا نیز کسی انتظامی افسر پر کی ہوئی محنت رائیگاں نہیں جائے گی، میرے دل میں اس شخص کی عزت بڑھ جاتی ہے جو کسی بڑے منصب پر فائز ہونے کے باوجود اپنے آپ کو استاد کہنے پر فخر محسوس کرے آپ استاد رہیں اور استاد ہونے پر معاشرہ میں فخر کریں۔ (ماہنامہ وفاق المدارس شوال ۱۴۳۲ھ)

استاد کے لئے چند زریں اصول

حضرت مولانا مفتی محمد حنیف عبد المجید صاحب دامت برکاتہم
مدیر مدرسہ بیت العلم کراچی

استاد کو چاہئے کہ شاگردوں کے ساتھ خیر خواہی کرے، حضرت تمیم داری رحمہ اللہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دفعہ فرمایا: الدِّین النَّصیحۃ دین خیر خواہی ہے، ہم نے پوچھا کن کے لئے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: للّٰہِ ولکتابہ ولرسولہ ولأئمۃ المسلمین وعامَّتھم یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کی کتاب اور اس کے رسول اور ائمہ مسلمین اور عام مسلمانوں کے لئے۔

عامۃ المسلمین کی خیر خواہی یہ ہے کہ ان کے ساتھ شفقت سے پیش آئیں اور ان کے فائدے کے کام کئے جائیں ان کو مفید تعلیم دیں اور ان سے تکلیف دہ اسباب کو دور کیا جائے اور ان کے لئے وہی پسند کیا جائے جو اپنے لئے پسند ہو اور ان کے لئے بھی وہی ناپسند ہو جو اپنے لئے ناپسند ہو۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک کامل مومن نہیں بن سکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے وہ پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہو۔

اگر کسی شاگرد کو اس کی کسی ناشائستہ حرکت پر نصیحت کرنا ہو اور وہ حرکت ایسی ہو کہ اگر سب کے سامنے ظاہر کی جائے تو اسے شرم آئے گی تو اس کو تنہائی میں نصیحت کرے اور بعد میں وہ نصیحت سب کو سنادے مگر اس شاگرد کا نام نہ لے اس طرز عمل سے اس کو ندامت ہی نہ ہوگی اور نصیحت کا فائدہ دوسروں کو بھی حاصل ہو جائے گا۔

طلبہ کے ساتھ خیر خواہی یہ بھی ہے کہ:

۱۔ اگر طالب علم کے پاس اتنی وسعت نہ ہو کہ وہ تحصیل علم کے ساتھ اپنے قیام وطعام کا خود کفیل ہوسکے تو اس کا حتی الوسع انتظام کرنا چاہئے۔

۲۔ سبق کا ناغہ نہ کرے اگر کسی مجبوری سے ناغہ ہوجائے یا کسی طالب علم سے مجبورا ناغہ ہوجائے تو اس کی تلافی مختلف اوقات میں کرے اگر اس قسم کی بیماری میں طالب علم مبتلا ہے کہ اپنی قیام گاہ سے اس کے پاس نہیں آسکتا تو اس کے لانے کا کوئی انتظام کرے اگر یہ بھی نہیں کرسکتا تو خود طالب علم کے پاس جاکر سبق پڑھادے اس معاملے میں حضرات سلف صالحین کی زندگی اور ان کی محنت کو سامنے رکھیں۔

ربیع بن سلیمان جو کہ حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کے شاگرد ہیں فرماتے ہیں: امام شافعی نے مجھ سے کہا کہ "اگر میں تجھے علم گھول کر پلا سکتا تو ضرور پلاتا"۔

۳۔ حضرت سفیان ثوری فرماتے ہیں واللہ! طالب علم اگر میرے پاس نہ آسکیں تو میں خود ان کے پاس جاکر ان کو علم سکھاؤں گا، ایک شخص نے ان سے کہا کہ یہ طالب علم بغیر نیت کے علم حاصل کرتے ہیں آپ نے فرمایا: علم حاصل کرنا ہی نیت ہے۔

۴۔ پڑھا ہوا سبق جب تک طالب علم نے یاد نہ کرلیا ہو اگلا سبق نہ پڑھائے اور آسانی کے لئے پڑھے ہوئے سبق کے متعلق سوالات تحریر کردئے جائیں اور دوسرے دن ان سوالات کے زبانی جوابات طلبہ سے پوچھے جائیں ہفتہ میں کم از کم ایک دن علمی سوالات ان سے کیا کرے تاکہ ان کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔

۵۔ اگر کوئی طالب علم ذہین ہو تو دوسرے طلبہ کے ساتھ جماعت بندی کی قید نہ رکھے بلکہ اس کو اس کے ذہن اور استعداد کے مطابق سبق پڑھائے اور اس کے وقت کو ضائع ہونے سے بچائے۔

امام محمد رحمہ اللہ کے حالات میں لکھا ہے کہ دن کے علاوہ رات کے وقت میں بھی درس وتدریس کا عمل جاری رکھتے تھے لیکن یہ درس عام نہ ہوتا تھا بلکہ جو طلبہ دور دراز سے خاص ذوق لے کر ان کی خدمت میں آتے اور ان کے پاس وقت کم ہوتا تو ان کے لئے یہ وقت رکھا تھا۔

صاحبِ آداب یہ لکھتے ہیں کہ میں نے بھی اپنے اساتذہ کو اس میں بہت شفیق پایا کہ وہ بھی اس قسم کے طلبہ کے ساتھ درس گاہ کے اوقات کے علاوہ میں بھی بڑی محنت کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ ہمارے اساتذہ کا ہمارے ساتھ ایسا ہی معاملہ تھا۔

٦۔ اگر کوئی مضمون طالب علم کی سمجھ میں دورانِ سبق نہ آرہا ہو تو دوسرے وقت اس کو سمجھادے، اس سلسلے میں اگر وہ کسی دوسرے استاذ سے اس کو حل کرنا چاہے تو اس میں ناگواری نہ ہونی چاہئے بلکہ خود ہی کہہ دینا چاہئے کہ مجھے اتنا ہی معلوم تھا اگر اب بھی سمجھ میں نہ آئے تو کسی اور سے سمجھ لینا یا میں ہی دریافت کرکے بتادونگا، اور اگر اس مضمون کو خود استاذ نہیں سمجھ رہا ہے تو صاف اقرار کرلے کہ میری سمجھ میں اس وقت نہیں آرہا ہے اور کسی وقت سمجھادوں گا، اس میں توہین کی کیا بات ہے کوئی ایسا ہے جس کو ہر بات معلوم ہو؟ علم تو بحرِ بے کراں ہے بشر کی وسعت میں علم کا احاطہ ممکن ہی نہیں، خداتعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا: {وما أوتيتم من العلم إلا قليلا}۔اور نہیں دیا گیا ہے تمہیں علم میں سے مگر تھوڑا سا۔

خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شان تھی کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی مسئلہ کا علم نہ ہوتا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا جاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے: لا أدري کہ میں نہیں جانتا، یہاں تک کہ وحی آجاتی۔

حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے دریافت کیا: أيُّ البلدان أحب إلى اللهِ؟وأي البلدان أبغض إلى اللهِ،اللہ کے نزدیک بہترین جگہیں کون سی ہیں اور بدترین کون سی ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں لا أدري فرمایا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل علیہ السلام سے پوچھا اور جبریل علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا، تو اللہ کی طرف سے جواب آیا کہ إنَّ أحبَّ البقاع إلى اللهِ المَساجد، وأبغض البقاع إلى اللهِ الأسواق-بہترین جگہیں مساجد ہیں اور بدترین جگہیں بازار ہیں۔

ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں یہ بھی علم میں سے ہے کہ آپ جو نہیں جانتے ہیں اس کے

بارے میں کہہ دیں کہ واللہ اعلم۔

حضرت امام مالک رحمہ اللہ سے ایک مسئلہ پوچھا گیا آپ نے فرمایا مجھے نہیں معلوم، یہ جواب سُن کر ان کے ایک شاگرد نے کہا آپ نے اپنی لاعلمی کا اقرار کرکے ہم کو شرمندہ کردیا، تو فرمایا کہ ملائکہ مقربین تو اپنی لاعلمی کا اقرار کرکے شرمندہ نہیں ہوئے بلکہ کہا: {سبحنك لا علم لنا إلا ما علّمتنا، إنّك أنت العليم الحكيم}، اے اللہ! ہم تو بس وہی جانتے ہیں جو آپ نے سکھایا ہے، بیشک آپ بہت جاننے والے حکمت والے ہیں۔

سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے ایک مسئلہ پوچھا گیا تو کہنے لگے مجھے معلوم نہیں، اور ہلاکت ہو اس کے لئے جو علم نہ رکھے اور علم کا دعوی کرے۔

حضرت امام مالک رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جب عالم لا أدري کہنا بھول جاتا ہے تو ٹھوکریں کھانے لگتا ہے۔

حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ لاعلمی کی صورت میں لا أدري (میں نہیں جانتا) کہنا آدھا علم ہے، اور حضرات سلفِ صالحین کے حالات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اگر کوئی بات معلوم نہ ہوتی تو فوراً لاعلمی کا اعتراف کرلیتے، یا دوسرے سے دریافت کرکے جواب دیتے۔

علماء کرام لکھتے ہیں کہ اپنی لاعلمی کی صورت میں لاعلمی کا اعتراف نہ کرنا نقصان دِہ ہے کسی طرح بھی مفید نہیں بلکہ بہت بڑا عیب ہے۔

فإن جهلتَ ما سُئلتَ عنه ولم يكن عندك علمٌ منه،

اگر آپ ناواقف ہیں اس سے جو آپ سے پوچھا جائے، اور آپ کے پاس اس سے متعلق علم نہیں ہے۔

فلا تقل فيه بغير فهمِ إنّ الخطأ مِزرٌ بأهل العلم

تو بغیر سمجھے اس کے متعلق کچھ نہ بولئے، اس لئے کہ غلطی اہل علم سے ہونا بے وقوفی ہے۔

وقل إذا أعياك ذاك الأمرُ ما لي بما تسأل عنه خبر

اور کہہ دیجئے جب آپ کو یہ معاملہ تھکادے، کہ میرے پاس آپ کے سوال کے متعلق کچھ علم نہیں۔

فذاك شطر العلم عند العلماء كذاك مازالت تقول الحكماء

یہ نصف علم ہے علماء کے نزدیک، اسی طرح برابر علماء کہتے رہے ہیں۔

۷۔ استاذ کو چاہئے کہ اگر کوئی طالب علم اپنی حالت کی مجبوری کی بنا پر اس کے پاس سے منتقل ہوکر کسی دوسرے استاذ یا کسی دوسرے مدرسے میں پڑھنے کا ارادہ رکھتا ہو اور اس میں اس کا فائدہ بھی ہو تو دیانت داری کا تقاضہ یہ ہے کہ خوشی سے اس کو اجازت دیدے، محض اپنے حلقہ درس کی رونق یا ادارے میں طلبہ کی زیادہ تعداد دکھانے کے لئے اس کو مت روکیں جس جگہ طالب علم کا جی نہ لگے وہاں رہ کر وہ کیا پڑھ سکتا ہے، آخر کار وہ بد دل ہوکریا تو بھاگ جائے گا یا حصول علم ہی سے ہاتھ دھو بیٹھے گا اور یہ دونوں چیزیں مضر ہیں۔

حضرت سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ جب اپنے آبائی وطن کوفہ پہنچے اور حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو معلوم ہوا تو اپنے شاگردوں سے کہا کہ تمہارے پاس عمرو بن دینار رحمہ اللہ کی مرویات کا حافظ آگیاہے، ان سے جاکر استفادہ کرو، چنانچہ امام صاحب کے تلامذہ وہاں جاکر ان سے استفادہ کرنے لگے، حضرت سفیان رحمہ اللہ خود فرماتے ہیں کہ مجھ کو سب سے پہلے جس نے محدث بنایا وہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ ہیں۔

علماء فرماتے ہیں کہ یہ بھی خود اخلاص کی علامت ہے کہ کہیں (بطریق شرع) دین کاکام ہوتا دیکھ کر خوش ہو، نہ کہ صرف اپنا مجمع بڑھانے کی فکر ہو، اگر ہمارے ادارے کے سامنے دوسرا تعلیمی ادارہ کھل جائے تو اخلاص کی علامت یہ ہے کہ طبیعت پر بوجھ نہ ہو بلکہ خوش ہوں کہ اچھا ہے علم کی اشاعت ہوگی۔

۸۔ معلم کو چاہئے کہ اپنے دل کو پاک صاف رکھے کسی طالب علم سے ناخوش ہوکر کینہ نہ رکھے اس سے دل سیاہ ہوتا ہے خود کو اس شعر کا مصداق بنائے:

آئین ماست سینہ چون آئینہ داشتن
کفر است در طریقہ ما کینہ داشتن

اور یہ خیال کرے کہ ان طلبہ نے اپنے آپ کو میرے حوالہ کردیا ہے، مجھے ان پر محنت کرکے اور ان کو بنا سنوار کے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا ہے،یہ میری کھیتی ہے جو آخرت میں کام آئے

گی، طلبہ کے طفیل اللہ تعالیٰ استاذ کو بڑی خوبیاں عطافرماتے ہیں، بسا اوقات سبق پڑھاتے ہوئے مفید باتیں استاذ کے دل میں من جانب اللہ پیدا ہوتی ہیں، جن کا باعث طلبہ کی طلب، پیاس اور اخلاص ہوتا ہے، حضرت مولانا محدث قاری عبدالرحمن صاحب پانی پتی رحمہ اللہ کے متعلق ان کے استاذ حضرت شاہ محمد اسحق صاحب مہاجر مکی رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے: کہ حدیث کے الفاظ میں ان کو پڑھاتا ہوں حدیث کی روح خود مجھے ان سے حاصل ہوتی ہے، اس کا بارہا تجربہ ہوا کہ اگر مطالعہ میں ایک مضمون سمجھ میں نہیں آیا تو سبق کے وقت بآسانی اس کے مطلب تک رسائی ہوگئی، یہ طلبہ ہی کی برکت ہوتی ہے۔

۹۔ شاگردوں کی طرف سے اگر کوئی خلاف طبیعت بات پیش آئے اور باعث ملال ہو تو ان کو معاف کردے یہ خیال کرکے کہ ان سے دین کا نفع مجھ کو بہت مل رہا ہے، معاف کردینے سے اللہ پاک کے ہاں قرب بڑھے گا۔

ایک بزرگ کو کسی نے مکار کہا — مریدوں نے اس کو مارنا چاہا فرمایا: جانے دو کچھ نہ کہو اور میرے ساتھ آؤ، گھر لیجاکر ان کو بہت سے خطوط دکھائے جن میں بڑے بڑے القاب لکھے تھے اس کے بعد فرمایا کہ مکار کہنے والے پر اس وجہ سے غصہ ہوتے ہو کہ اس نے غلط بات کہی ہے تو ان القاب کے لکھنے والوں پر بھی غصہ کرنا چاہئے کہ انہوں نے بھی غلط لکھا ہے۔

لہذا استاذ یہ سوچے کہ ان سب کے باوجود اس میں ہمارے لئے خیر ہے اور امید ہے کہ ان میں سے کچھ شاگرد ایسے نکل آئیں جن سے اصلاح امت کا کام اللہ تعالیٰ لے لیں اور ہمارے لئے ذریعہ نجات بن جائیں۔

۱۰۔ طلبہ کی تربیت کے سلسلے میں حضرات سلف صالحین کے واقعات اور ان کے زمانۂ طالب علمی کے حالات سنانا بے حد مفید ہے، تجربہ سے ثابت ہے کہ طلبہ کی ہر قسم کی حالت درست کرنے میں یہ طریقہ بہت موثر ہے، کتاب "المدرس" میں لکھا ہے کہ دورانِ سبق خواہ کسی بھی فن کی کتاب ہو طالب علم کے لئے اصلاح کی بات ضرور کیا کرو، اور استاذ کو چاہئے کہ وہ طالب علم کو

دینی تعلیم کے سلسلے میں فضائل وغیرہ سنا کر ترغیب دلائے۔

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

"اگر مدارس میں تربیت کے سلسلے میں کم از کم یہ ہوتا کہ طلبہ میں دینی شغف پیدا کرنے کی طرف توجہ کی جاتی اور دین کی قدروقیمت ان کے دل ودماغ میں بٹھانے کی معمولی سی بھی کوشش ہوا کرتی تو یہ نہ ہوتا کہ چارچار، چھ چھ سال ان مدارس میں پڑھ کر جو لوگ درمیان میں کسی بھی وجہ سے چھوڑ کر چلے جاتے ہیں تو عموماً یہی دیکھا جاتا ہے کہ وہ کوئی دینی اثر لے کر نہیں جاتے"۔

قاضی شریح کندی متوفی ۸۰ھ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کوفہ کا قاضی مقرر کیا تھا، انہوں نے ایک مرتبہ اپنے بچے کو نماز کے وقت کتے کے بچہ سے کھیلتے ہوئے دیکھا تو مکتب کے معلم کے نام یہ چند اشعار لکھ کر مہر بند کیا اور اپنے بچے کے ہاتھ بھیجا، جن میں اس کو سزا دینے کا فیصلہ تھا:

تَرك الصلاة لأكلُبٍ يسعى بها طلَبَ الهِراش مَعَ الغُوَاةِ الرّجِيس

میرے بچے نے نجس وناپاک کتوں کے بھڑکانے اور لڑانے میں نماز چھوڑدی ہے۔

فَلَيأْ تِينَّكَ غَدْوةً بصَحِيفةٍ كُتبتْ له كصحيفة المُتَلَمّس

وہ صبح کو تمہارے پاس صحیفہ لے کر آئے گا، جو اس کے لئے متلمس کے صحیفہ کی طرح لکھا گیا ہے۔

فإذا هَممْتَ بضربةٍ فبِدُرَّةٍ وإذا بلغتَ به ثلاثًا فاحبِس

جب تم اس کو سزا دینا چاہو تو آہستہ کوڑے سے مارو، اور (آہستہ سے) تین ڈنڈیاں مار کر ہاتھ روک لو۔

واعلَمْ بأنّك ما أتيت فنفسَه مع ما يجُرُّ عنّي أعزّ الأنفس

تم نے میرے فیصلہ پر سزا دی ہے، اس کے باوجود مجھے قلبی تکلیف ہے وہ مجھے بہت محبوب ہے۔

قاضی شریح کے بچے نے دو غلطیاں کی تھیں، کتا لڑایا، اور نماز ترک کی، اس پر انہوں نے خود سزا نہیں دی بلکہ معلم سے سزا دلوائی، اس میں معلم کے لئے لطیف تنبیہ تھی کہ وہ مکتب کے بچوں کی دینی واخلاقی تعلیم وتربیت پر پوری توجہ کرے، اور سزا دینے میں بچہ کی معصومیت اور والدین کی محبت کا لحاظ رکھے۔

یاد رکھئے! بچہ مستقبل میں ڈاکٹر بن جائے گا، انجینئر بن جائے گا، عالم، مفتی بن جائے گا، مگر تربیت نہیں ہوگی تو ہر حال میں جس شعبہ میں جائے گا وہاں فساد ہوگا۔

لہذا تربیت پر خوب زور دیں، تربیت کی خوب فکر کریں، کہ یہ بچہ بچی انسان بن جائیں، پھر مسلمان بن جائے مسلمان بنانا یہ ہے کہ اپنے پیدا کرنے والے کو پہچان لے، اس کی ایسی معرفت اس کے دل میں بیٹھ جائے کہ گناہوں کی طرف جانے کی ہمت نہ ہو سکے اور ان کے ہاتھوں اور زبان سے سلامتی ہی نکلے، کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔

۱۱۔ استاذ کو شاگرد سے ذاتی خدمت لینے میں احتیاط کرنا چاہئے، بغیر کسی مجبوری کے اپنا ذاتی کام اس سے نہ لے، اور مجبوری میں اگر کبھی کوئی خدمت لے تو کسی طرح اس کی مکافات کردے، نیز اس کا لحاظ رکھے کہ اس قسم کا کام اس سے نہ لے جس کو وہ سہار نہ سکے، یا اس میں اس کے سبق یا تکرار وغیرہ کا نقصان ہوتا ہو، کیونکہ جس مقصد کے لئے اس نے ماں باپ کو چھوڑا اپنا وطن چھوڑا ہے جب اس میں حرج واقع ہوگا تو بددلی پیدا ہوگی اور اخلاص کے ساتھ ہرگز کام نہ کرے گا، نابالغ کے وجود اور ذات سے خدمت لینے میں تو بہت سے مسائل ہیں اس لئے حتی الامکان احتیاط کرے اور شرعی حدود اور مسائل پر نظر رکھے۔

امام ابن طاہرؒ جب فن حدیث کی تحصیل کے لئے اپنے استاذ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو دیکھا کہ شیخ خود ہی اپنا سب کام کرتے ہیں بازار سے سامان لاد کر آتے ہیں، ایک مرتبہ دیکھا کہ ایک دکان سے سامان لیا اور دامن میں سب چیزیں لے کر آئے اور میرے اصرار پر بھی نہ دیا، اس وقت ان کی عمر ۷۹ برس تھی۔

ابوالاسود رحمہ اللہ (علم نحو کے سب سے پہلے مرتب کرنے والے) کے حالات میں لکھا ہے کہ آخیر عمر میں ان پر فالج گرا، اور اس کے اثر سے ان کے ہاتھ پاؤں ماؤف ہوگئے تھے، اس معذوری کی حالت میں بھی پاؤں سے گھسٹتے ہوئے بازار جاتے اور اپنا کام کر آتے حالانکہ ان کے ہزاروں شاگرد تھے۔

امام بخاری رحمہ اللہ شہر بخارا کے باہر ایک مہمان خانہ بنوا رہے تھے، اور مزدوروں کے ساتھ خود بھی کام کرتے تھے، ایک شاگرد نے عرض کیا آپ کو اس محنت کی کیا ضرورت ہے ہم لوگ

موجود ہیں؟ فرمایا: هذا الذي ينفعني یہ بات مجھے بھی نفع دیتی ہے۔

جب ایسے جلیل القدر ائمہ کرام اپنا کام خود کرلیا کرتے تھے یا تعاون کرتے تھے تو ہمیں بھی اپنی اور اپنے گھر والوں اور عام انسانوں کی خدمت خود کرنی چاہئے، کوشش کرنی چاہئے کہ پانی بھی پینا ہو تو کسی سے مانگے نہیں خود جاکر پانی پی لے، جب شاگردوں سے کام کروانے کی عادت پڑ جاتی ہے تو "نفس امارہ" پھر سستی و غفلت کا عادی ہو جاتا ہے، اور ایسے اشخاص بڑھاپے سے بہت پہلے بڑھاپے تک پہنچ جاتے ہیں۔

حضرت مولانا منظور احمد رحمہ اللہ مدرس مظاہر العلوم سہارنپور مدرسہ سے مکان جاتے ہوئے اپنا سامان خرید کر خود ہی لے جاتے، حضرت مفتی عزیز الرحمن صاحب رحمہ اللہ مفتی اعظم اور ولی کامل تھے دیوبند میں مدرسہ میں تشریف لیجانے سے قبل محلے کے ضعفاء سے گھریلو سودے کے پرچے لے جاتے اور سودا گھر گھر پہنچاتے تھے۔

حضرت مولانا ظریف احمد صاحبؒ باوجود پیرانہ سالی کے اپنا کام خود اپنے ہاتھوں سے انجام دیتے تھے اور طلبہ کو بھی اس کی ترغیب دیتے تھے۔

ان سب سے بڑھ کر خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنا کام خود اپنے دست مبارک سے فرمایا کرتے تھے، بکریوں کا دودھ دوہ لیتے تھے، پھٹا کپڑا سی لیتے، نعلین مبارک ٹوٹ جاتے تو اپنے ہاتھ سے گانٹھ لیتے، اپنے کام کے لئے دوسروں کو تکلیف نہ دیتے، خندق کھودنے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود شریک ہوئے، مسجد کی تعمیر میں آپ نے حصہ لیا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ لکھ رہے تھے اور سیاہی ختم ہوگئی خود ہی اٹھے اور قلم کی سیاہی لی اور دوبارہ لکھنے میں مصروف ہوگئے، ایک مہمان بیٹھا ہوا یہ منظر دیکھ رہا تھا مہمان نے سوال کیا کہ آپ کسی غلام کو یہ حکم دے دیتے وہ یہ کام کردیتا، فرمایا: خادم ابھی ابھی سویا تھا اور اس کی نیند خراب کرنا میں نے مناسب نہیں سمجھا، مہمان نے کہا! مجھے ارشاد فرمادیتے: فرمایا: ہمارے ہاں مہمان سے خدمت لینا عیب شمار کیا جاتا ہے اور فرمایا: میں نے خود ہی یہ کام کر لیا تو کیا ہوگیا، میری شان کوئی

میں کمی تو نہیں آئی،ذھبتُ وأنا عمر، ورجعتُ وأنا عمر، وخیرالناس مَن کان عند اللہِ متواضعًا،یعنی میں جب گیا تھا تب بھی عمر تھا،اور واپس لوٹا تو بھی عمر ہی رہا،اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بہتر وہ شخص ہے جو متواضع ہو۔

لہذا آج سے یہ نیت کریں کہ ہم اپنے تمام کام خود ہی کریں گے، اس سے بدن چست بھی رہتا ہے،پھر تیلے پن کی عادت رہتی ہے کئی بیماریاں دور ہونے کا سبب بنتا ہے، ورنہ جو اساتذہ کرسی اور گدی پر بیٹھے ہی رہتے ہیں وہ بہت جلد بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

۱۲۔ اسی طرح ایک استاذ کا دوسرے اُستاذ کو ادارہ یا مہتمم یا کسی اور استاذ کی برائی خیر خواہی کی نیت سے بھی نہیں بتلانی چاہئے اور نہ دوسرے اُستاذ کو سننا چاہئے، اس سے انفرادی اجتماعی نقصان ہوتا ہے۔

غیبت، چغلی، کسی کی پردہ دری، افتراق بین المسلمین تو عوام کے لئے بھی ناجائز اور حرام ہیں تو پھر علماء اور اُمت کے مقتداء، راہنمایان قوم واساتذہ کے لئے یہ حرام کام کس طرح جائز ہوں گے۔

اسکولوں اور مدارس میں جب اس قسم کی برائیاں آتی ہیں اور اساتذہ ایک دوسرے کی برائی میں لگ جاتے ہیں تو اس کا اثر طلبہ پر بھی بہت بُرا پڑتا ہے۔

پھر جب یہ استاذ خود مہتمم یا پرنسپل بن جاتے ہیں تو چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں کہ کتنا سکون تھا صرف استاذ ہونے کی ذمہ داری تھی، وہ صحیح نہ نبھ سکی، اور پرنسپل اور مہتمم اور مسجد کی کمیٹی والوں پر اعتراضات اور ان کے عیوب اور نقائص ڈھونڈ کر اُچھالنا میرا کام تھا، اب خود جب میرے سر پر آئی تو پتا چلا کہ پرنسپل و مہتمم بننا اور ان شعبوں کی ذمہ داری لینا اپنے آپ کو جلد بڑھاپے تک پہنچانا ہے۔

ایک نقصان یہ ہوتا ہے کہ اُستاذ جب طلبہ اور عوام کے سامنے دوسرے اساتذہ کی برائیاں بیان کرتے ہیں تو یہ غیبت ہوتی ہے اور غیبت کے گناہ سے دل مردہ ہو جایا کرتا ہے، اور رہی سہی نیکیاں بھی ان کے اعمال نامے میں چلی جاتی ہیں، جن کی غیبت کی ہے، اسی لئے کسی عاقل کا قول ہے (کمال مبالغہ کے ساتھ کہ) اگر میں غیبت کروں تو اپنی والدہ کی کروں تاکہ میری نیکیاں ان

کے نامہ اعمال میں چلی جائیں، یعنی اعمال خیر کا منتقل ہونا اس قدر یقینی ہے کہ بتانے کے لئے یوں فرمادیا۔

لہذا جس ادارہ میں آپ ہیں، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر کریں اور وہاں کسی کا کوئی عیب یا کوتاہی سامنے آئے تو اس کے لئے دو رکعت نفل پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ اے اللہ! اپنے فضل وکرم سے اس کو تاہی کو دور فرمادیں، اور جو بھی آپ سے ہوسکتا ہے مثبت انداز میں اور سوچ سمجھ کر اس میں اپنی طرف سے تعاون فرماکر اس کوتاہی کو دور کرنے کی کوشش کریں، لیکن لِلّٰہِ ایسا قدم نہ اٹھائیے جس سے ادارے کو نقصان پہنچے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک مرتبہ اپنے حواریین سے فرمایا کہ بتاؤ اگر تمہارا کوئی بھائی اس حالت میں سڑک پر برہنہ پڑا ہوا ملے کہ اکثر بدن اس کا کھلا ہوا ہو تو تم اس کو ڈھانکو گے یا مزید اور برہنہ کردوگے؟ سب نے پہلی صورت کو صحیح بتایا، تو فرمایا کہ پھر اگر کسی کا کوئی عیب سامنے آتا ہے تو اس کو بھی چھپانے کی بجائے مزید کوتاہیوں کا تذکرہ کیوں کرتے ہو۔

(ماہنامہ وفاق المدارس جمادی الاخری ۱۴۳۰ھ)

مثالی مدرس کی صفات پر ایک نظر

مدرسین کی خدمت میں مختصراً ان کے فرائض کا خاکہ پیش کیا جاتا ہے:

۱۔ مدرس کو تدریس سے پہلے درس کے لئے تیاری کرنی چاہئے۔

۲۔ مدرس طلبہ کے ساتھ ہمدردی سے پیش آئے۔

۳۔ مدرس اپنے کام کو حصولِ رزق کا وسیلہ نہیں بلکہ دینی ومعاشرتی خدمت تصور کرے۔

۵۔ مدرس اپنی جملہ توجہ طلبہ کے کردار کی تشکیل پر دے، مندرجہ بالا فرائض کے ساتھ مدرس کو چاہئے کہ اپنا انداز بیان اور طریقہ تدریس آسان بنائے، اس لئے کہ جو شخص اپنے مخاطب کی ذہنی سطح کو نظر انداز کر کے نصیحت کرتا ہے، تو اس کی گفتگو سے بعض اوقات نفع کم اور نقصان زیادہ ہونے کا خطرہ ہوتاہے، مدرس کے قول وفعل میں تضاد نہ ہو، اور اسے اپنے نفس کی اصلاح کی فکر ہو، جس کے لئے ضروری ہے کہ کسی صاحب باطن اہل دل سے مکمل رابطہ ہو، اس کے بغیر عادتاً یا تجربتاً معلومات معمولات نہیں بن سکتیں۔

٦۔ مدرس طلبہ کی حوصلہ افزائی کرے، تاکہ وہ استاذ کی نقل وتقلید کے علاوہ خود بھی تعمیری کام کر سکیں، مدرس ذاتی طور پر تدریس کے میدان میں آگے بڑھنے کے لئے مطالعہ وتحقیق کرتا رہے۔

۷۔ مدرس کو خوش مزاج اور پر امید ہونا چاہئے اور دوران تدریس مناسب موقعوں پر خوش مزاجی کا مظاہرہ کرنا چاہئے، کیونکہ بعض دفعہ خوش مزاجی تدریس کے لئے بڑی مؤثر ہوتی ہے۔

۸۔ معلم کو اپنے کار منصبی نہایت ذمہ داری سے ادا کرنے چاہئیں، تاکہ جو درس وہ دے رہا ہو، وہ طلبہ کو اچھی طرح ذہن نشین کرائے اور دوران تعلیم فضول گوئی، ہرزہ سرائی، جھوٹی سچی باتوں اور زمین وآسمان کے قلابے ملانے اور بے سروپا حکایات سنانے یا اپنے ذاتی حالات کا ذکر طلبہ کے

سامنے کرنے سے گریز کرے، بلکہ طلبہ میں اپنی شخصیت طرز عمل اور علمیت سے وقار قائم کرے۔

۹۔ اپنا قلم اپنی کتاب ساتھ لے کر جائے، ایسا نہ ہو کہ خالی ہاتھ درسگاہ میں جائے اور طلبہ سے کتاب لے اور پوچھے کہ گزشتہ روز کہاں تک پڑھا تھا؟۔

۱۰۔ دوران سبق طالب علم کو حاضری رجسٹر لانے یا کسی دوسرے کام سے باہر بھیجا جاتا ہے، جس سے طالب علم کا وقت بھی ضائع ہوتا ہے، اور طالب علم کو علمی نقصان بھی پہنچتا ہے، اس سے حتی الامکان گریز کرنا چاہئے۔

۱۱۔ درسگاہ میں داخل ہوتے وقت سلام کرنا چاہئے اور سبق شروع کرنے سے پہلے حاضری لینا اور طلبہ کے پاس کتابیں وغیرہ دیکھنا ان کی صحت اور صفائی کا خیال رکھنا، غیر حاضر طلبہ کے بارے میں معلومات کرنا اور اگر بیمار ہوں تو ان کے لئے دُعا کرنا اور ممکن ہو تو اُن کی عیادت کے لئے جانا، اور غلط طریقے پر اور بے نیازی کے انداز میں بیٹھے ہوئے طلبہ کو سیدھا بیٹھنے کی ہدایت کرنا، معلم کی خوبی ہے، نیز طلبہ کے ساتھ زیادہ فضول ربط وضبط بڑھانے سے گریز کریں، اور طلبہ کی ہمت افزائی کے لئے وقتاً فوقتاً انعامات دینے کا سلسلہ جاری رکھے۔

۱۲۔ نیز بلا ضرورت رخصت پر نہ جائے، بلکہ مدرسہ میں داخل ہوتے ہی سارا وقت درس وتدریس اور مطالعہ میں گزارے، خوش گپیوں اور بیکار کاموں میں وقت ضائع نہ کرے حتی کہ ادارہ میں اخبار بھی پڑھنے سے گریز کرے۔

۱۳۔ نیز صدر مدرس اور ناظم مدرسہ کے احکامات کی پوری طرح تعمیل کرے، انتظامی اور تدریسی امور میں متعلقہ حضرات کی ہر ممکنہ مدد کرے اور مقررہ وقت پر نصاب ختم کرنے کی کوشش کرے، اپنے ہر فعل اور قول میں طلبہ کی بھلائی کو مد نظر رکھے، مدرسہ کے اندر کوئی ایسی حرکت نہ کرے، جو کہ مدرسہ اور طلبہ وغیرہ کے لئے نقصان دہ ہو، بلکہ اپنے کردار سے یہ ثابت کرے کہ اگر طلبہ کو یہ مضمون دیا جائے کہ "میرا پسندیدہ استاذ کون ہے"، تو وہ اس استاذ کا نام لیں۔

۱۴۔ استاذ شاگردوں پر شفقت کرے، ان کو اپنے بیٹوں کے برابر جانے، اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إنما أنا لكم مثل الوالد۔ ترجمہ: میں تم میں شفقت کے اعتبار سے ایسا ہوں جیسے باپ (اپنے بچوں کے لئے ہوتا ہے)۔

۱۵۔ آداب تعلیم یعنی سکھانے میں صاحب شریعت کی پیروی کرے محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے حصول کی نیت کرے، جزاءیا شکریہ کا قصد نہ کرے اور نہ طلبہ پر احسان جتلانے کی نیت کرے۔

۱۶۔ شاگردوں کو نصیحت کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرے۔

۱۷۔ طالب علم کو اگر بداخلاقی پر سزا دے تو بطریق تعریض اور بطریق رحمت دے۔

۱۸۔ جو علم پڑھارہا ہو اس کے علاوہ جو دوسرے جائز علوم ہیں ان کی مذمت طلبہ کے سامنے نہ کرے۔

۱۹۔ طالب علم کی سمجھ کے مطابق تقریر کرے ایسی تقریر نہ کرے جو اسکی سمجھ سے بالاتر ہو۔

۲۰۔ استاذ اپنے علم پر عامل ہو، تاکہ اس کے فعل سے اس کے قول کی تکذیب نہ ہو۔

۲۱۔ ابتداء میں اتنا سبق پڑھائے کہ سہولت کے ساتھ مبتدی دو مرتبہ دہراسکے اور پھر آہستہ آہستہ بتدریج زیادہ کرتا جائے۔

۲۲۔ ابتداء میں ایسی کتاب شروع کرائی جائے جو طالب علم زیادہ سمجھ سکے۔

۲۳۔ حکماء کا قول ہے کہ اگر کسی کو صرف اچھے اچھے کھانوں ہی کا شوق ہے تو یہ ایک جانور کی خصلت ہے، اگر کسی کو صرف بننے سنورنے ہی کا شوق ہے تو اس پر فقط نسوانی ذوق کا غلبہ ہے، اگر کوئی بے کار پڑے رہنے کا عادی ہے تو وہ گویا مردہ ہے، اگر کسی کو صرف کھیلنے کا شوق ہے تو وہ گویا بالکل بچہ ہے، اگر کسی کو مال کمانے ہی کی دھن ہے تو وہ صرف تاجر ہے، ہاں اگر کسی کو علم حاصل کرنے کا شوق ہے اور جستجو کا مادہ ہے تو واقعی وہ "ایک محقق مثالی استاذ" کہلائے جانے کا مستحق ہے، ہمیں چاہئے کہ ہم اپنا محاسبہ کرلیں کہ ہم اپنے آپ کو کس فہرست میں شمار پاتے ہیں؟۔

۲۴۔ استاذ اس نیت سے پڑھائے کہ یہ سب بچے خود استاذ بن سکیں، یعنی اگر یہی سبق آج کسی بچے کو کہا جائے کہ تم دوسروں کو سمجھادو تو وہ سمجھا سکے، اگر اس طرح محنت کے ساتھ استاذ نے سمجھایا تو واقعتًا وہ مثالی استاذ ہے، اسی لئے ماہرین کا کہنا ہے کہ کبھی کبھی استاذ بغیر تعین کے کسی بچے کو چاک (مارکر) ہاتھ میں پکڑا کر کہے: آج یا کل کا سبق تم دوبارہ ان سب بچوں کو سمجھاؤ، یا آج تم لوگ مطالعہ کرکے آنا، کل تم خود ہی پورا سبق حل کرنا، اس سے انشاء اللہ تعالیٰ بہت ہی زیادہ فائدہ ہوگا۔

۲۵۔ استاذ مجلس کا خود ہی ادب کرے، تپائیوں کتابوں کا ادب خود استاذ کرے گا تو بچوں پر بھی اس ادب کا اثر ہوگا۔

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنی مجلس درس میں باوضوء جاتے تھے، پہلے دو رکعت نماز پڑھتے، پھر نہایت ادب اور وقار کے ساتھ قبلہ رو بیٹھ کر بسم اللہ اور حمد وصلوٰۃ کے بعد درس شروع کرتے۔ (تحفۃ المدرس ۵۹/۲، ۴۳)

مدرسین کے لئے نصائح

حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب رحمہ اللہ

۱۔ اس کی کوشش کرے کہ استاذ جب بنے کہ اپنی اصلاح کسی شیخ کامل سے کراچکا ہو اور ماتحتوں کو ایک نظر سے دیکھے اور طلبہ کے اخلاق کی نگرانی اور ان کی اصلاح کو مدنظر رکھے۔

۲۔ طلباء سے خدمت نہ لے، اگر ضرورت پڑے تو کام میں آسانی کا خیال رکھے خود مدد کرے یا کسی اور سے مدد کروائے۔

۳۔ شاگردوں کا ممنون رہے کہ ان لوگوں نے اپنے کو تمہارے سپرد کیا ہے کہ تم اپنے دین کی کھیتی باڑی میں خوب شوق سے کام کرو۔

۴۔ متعلمین کو ایک نظر سے دیکھے اور یکساں برتاؤ رکھے تاکہ کسی متعلم کے دل میں حسد یا رنج نہ پیدا ہو، اور بدگمان نہ ہو کسی کے ساتھ کچھ خاص معاملہ کرنا ہو تو اس کو مع اس کی وجہ کے اوروں پر صراحتاً یا اشارۃً ظاہر کردے۔

۵۔ تعلیم میں دنیا پیش نظر نہ ہو بلکہ دین مدنظر ہو۔

۶۔ حیا اور وقار سے رہے تاکہ یہ اخلاق متعلمین میں پیدا ہوں کیونکہ حیا ایمان کی درخت کی بڑی شاخ ہے، اگر یہ پیدا ہوجائے گی تو دین کے بہت کاموں کی پابندی کرلیں گے، مگر وقار سے مراد کبر نہ سمجھے۔

۷۔ کچھ دیر تک خلوت میں فراغت کے وقت رہے اور اس میں اپنے نفس سے محاسبہ کرے کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کے اوامر میں سے کیا کیا پورا کیا اور نواہی میں سے کس کس کو چھوڑا، اور تعلیم میں اور تربیت میں کیا کیا کوتاہیاں ہوئیں، اور کیا کیا سرانجام ہوئیں، مرضیات خداوندی کے بجالانے پر تہہ دل سے شکریہ ادا کرے تاکہ موافق وعدہ خداوندی {لئن شکرتم

لأزيدنّكم} اور ترقی ہو، اور ارتکاب معاصی پر دل سے توبہ واستغفار کرے تاکہ بشارت یعنی:
طوبى لمَن وُجد في صحيفته استغفارًا كثيرًا، میں داخل ہو، اور کوتاہیوں کو دفع کرنے
کی دل وجان سے کوشش کرے اور اللہ تعالیٰ سے بصد عاجزی والحاح التجا کرے کہ مرضیات بجا
لانے کی توفیق عنایت فرمائیں اور نامرضیات سے اجتناب نصیب فرمائیں، اور اسی پر عمر بھر رکھیں،
اور اسی پر خاتمہ فرمائیں، {وما ذلك على الله بعزيز}۔

خلاصہ یہ ہے کہ کچھ دیر تک ضرور خلوت اختیار کرے اور مذکورہ بالا کاموں کو بجا لائے تاکہ نور
باطن نصیب ہو اور بہت سی آفتوں سے نجات ہو۔

اور جناب رسول کریم اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا خلوت اختیار کرنے کا، حالانکہ آپ معصوم
تھے، ہم لوگ تو سر سے پیر تک گناہ ہی گناہ سے بھرے ہوئے ہیں ہم لوگوں کے لئے تو
خلوت اور ضروری ہوگی، چنانچہ ارشاد خداوندی {فإذا فرغت فانصب وإلى ربك فارغب}
سے ظاہر ہے جیسے ربڑ وغیرہ میں پھونک مار کر ہوا بھرتے ہیں اسی طرح ذوق وشوق، وجد، شکر،
ہمت سے پر کردیتی ہے کرکے دیکھو۔

۸۔ خلوت بالامرد سے بہت اجتناب کرے اور امرد خوبصورت سے بہت ہی سخت اجتناب کرے،
ہرگز ان کے ساتھ خلوت نہ کرے اور جلوت میں بھی ضرورت سے زیادہ بات چیت نہ کرے،
نہ ان کی طرف قصدا دیکھے اور نہ ان کی بات نفس کے تقاضہ سے سنے کیونکہ امرد پرستی کا مرض
اسی طرح پیدا ہوتا ہے کہ پہلے بالکل پتہ نہیں چلتا، اور جب جڑ مضبوط ہوجاتی ہے تب پتہ
چلتا ہے کہ اس وقت کنارہ کشی امرد سے بہت دشوار ہوگئی ہے۔

اپنی پاکدامنی پر ناز نہ کرے کہ میں بھلا اس مرض میں کہاں مبتلا ہوسکتا ہوں، حضرت یوسف علیہ
السلام نے فرمایا: {إنّ النّفس لأمارةٌ بالسوء} اور حضرت امام اعظم رحمہ اللہ نے امام محمد
رحمہ اللہ کے رخ پر جب تک وہ امرد تھے نظر نہ ڈالی، حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمہ اللہ
فرماتے ہیں کہ میں دنیا میں سوائے نفس کے کسی سے نہیں ڈرتا، تو ہم تم اپنے پاک ہونے پر

کیا ناز کر سکتے ہیں، اگر ایسا خیال میں آئے تو سمجھیں شیطان دھوکہ دے رہا ہے، اور یہ مرض ان میں اسی طرح پیدا کرنا چاہتا ہے کہ اسے خبر نہ ہوگی تب اسے قدرت مقابلہ نفس پر نہ ہوگی یا بہت ہی مشکل ہوگی، یہ شیطان ہی کا مقولہ ہے کہ:

"اگر جنید بغدادی رحمہ اللہ ایسا مرد اور رابعہ بصریہ رحمہا اللہ ایسی عورت خلوت میں ہوجائیں تو ہم دونوں کے اندر خیالات برے پیدا کرکے دونوں کا منہ کالا کردیں"۔

تو صاحبو! (شیطان) ایسے اولیاء کو بہکانے کا دعوی کرتا ہے تو ہم اور آپ کب اس پھندے سے بچ سکتے ہیں۔{رب أعوذبك من همزات الشياطين، وأعوذبك رب أن يحضرون}۔۔۔۔

۹۔ طلبہ کی صحت کے لئے اور ان کی فراغت کے لئے برابر دُعا کیا کرے تاکہ اپنے دین کی کھیتی کرسکے۔

۱۰۔ اگر طلباء سے کوئی بات خلاف طبیعت پیش آئے اور باعث ملول ہو تو یہ خیال کرکے کہ ان سے دین کا نفع مجھ کو بہت ہورہا ہے معاف کردے، اور معاف کردینے سے اور بھی اللہ میاں کے یہاں قرب بڑھے گا، اللہ والے تو اور ایسوں کا احسان مانتے ہیں حضرت مرزا مظہر جان جاناں شہید رحمۃ اللہ سے ایک شخص نے کہا کہ حضرت آپ کی بیوی صاحبہ بڑی بدزبان ہیں، حضرت مرزا صاحب نے فرمایا ایسا مت کہیے، ان کا مجھ پر بڑا احسان ہے، کہنے والے نے کہا کہ یہ بیوی صاحبہ کیا احسان کرے گی یہ تو نہایت ہی بدزبان ہیں؟، حضرت نے فرمایا کہ بھئی! یہی تو احسان ہے کہ وہ برا بھلا کہتی ہیں اور میں صبر کرتا ہوں جس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ نے دنیا میں مرزا کا ڈنکا بجادیا۔

حضرت مولانا اسماعیل شہید رحمہ اللہ کو ایک شخص نے مجمع میں کہا تم حرامی ہو، حضرت نے فرمایا کہ بھئی! تم غلط کہتے ہو، میرے بابا کے نکاح کے گواہ ابھی تک موجود ہیں۔

ایک بزرگ کو لوگوں نے مکار کہا، مریدوں نے ان کو مارنا چاہا، بزرگ صاحب نے فرمایا نہیں جانے دو، میرے ساتھ آؤ، گھر پر چلو، اور گھر پر لے گئے، جتنے خطوط ان کے آئے تھے، اور

لمبے چوڑے القاب غوث وقطب لکھے سب سامنے رکھ دیئے اور فرمایا کہ مکار کہنے والے پر آپ لوگوں کو کیوں غصہ آیا اسی وجہ سے ناکہ اس نے غلط بات کہی، تو ان صاحبوں نے سبھی غلط لکھا ہیں، انہیں بھی مارنا چاہیے، نہیں تو دونوں کو چھوڑنا چاہیے، ورنہ یہ نفس کا کام ہوگا کہ خلاف واقعہ بھلائی پر تو خوش ہوگیا اور کچھ نہ کہا نہ برا معلوم ہوا، اور خلاف واقعہ برائی پر برہم ہوگیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو قتل کرنے کے لئے گرایا، اور سینہ پر سوار ہوئے، اس نے منہ پر تھوک دیا، حضرت نے چھوڑدیا، لوگوں نے پوچھا آپ نے چھوڑدیا؟ فرمایا کہ میں ڈرا کہ کہیں میرا قتل کرنا نفس کے تقاضہ سے نہ ہو، واقعی یہ حضرات نفس کے مکر سے واقف تھے اور اس کے مکر پہچانتے تھے، ایسے ہی لوگ ہیں جو شیطان پر ہزار عابد سے بڑھ کر اشد ہیں۔

غرضیکہ معلم اپنے دل کو پاک وصاف رکھیں، کسی طالب علم کے قصور پر ناخوش ہوکر کینہ نہ رکھیں، اس سے دل کا ستیا ناس ہوجائے گا، بس دل میں اللہ میاں کو جگہ دینا چاہیے، اور اشعارِ ذیل کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔

آئین ماست سینہ چوں آئینہ داشتن
کفرست در طریقت ما کینہ داشتن
بہ نشین دردل ویرانہ ام اے گنج مراد
کہ من این خانہ بسودا کے تو ویراں کردم

ہاں طالب علم کی اصلاح کی غرض سے کچھ تنبیہ یا کوئی سزا یا کوئی ترکیب کردے جس میں اپنے نفس کا شائبہ نہ ہو، اگر ہوگا تو اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ہے۔{وکفی باللّٰہِ شھیدا}۔

۱۱۔ اگر کوئی طالب علم مدرسہ سے چلا جائے، بد دل نہ ہو، پریشان نہ ہو، گھبرائے نہیں، ہائے ہائے نہ کرے کہ میری آمدنی یا ناموری گئی، اب میری زندگی کیسے کٹے گی اور اس طالب علم کی یا اس کے سرپرستوں کی ہرگز ہرگز خوشامد نہ کرے، خدا پر توکل رکھے، اور اللہ والا بنکر رہے، اللہ میاں

اس کے ہو کر رہیں گے، حدیث میں آیا ہے: مَن کان للہ کان اللہ لہ، دیوانہ باش تو دیگراں خور۔

اور یہ شعر اپنا معمول رکھے:

ہر کہ خواہد گو بیاؤ ہر کہ خواہد گو برو
دارو گیرو حاجب ودرباں دریں درگاہ نیست

اور یہ سمجھے کہ ایک کی ذمہ داری سے چھٹی ہوئی، اگر اس کی تعلیم وتربیت میں کوتاہی ہوئی تو قیامت میں گت بنتی، اللہ تعالیٰ نے اس سے نجات دی اور یہ سمجھے کہ قطع اسباب میں امتحان ہے توکل کا، اسباب کے ساتھ متوکل بننے کا دم بھرتے تھے، اب اسباب کو اللہ نے منقطع کردیا تاکہ تمہارے توکل کی قلعی کھلے، اگر اب بھی اس طرح خنداں وشاداں رہو اور خدا پر ویسا ہی بھروسہ رہے جیسا کسی آدمی کے کہہ دینے سے کہ میں تمہارا ذمہ دار ہوں بھروسہ ہوجاتا ہے اور دل کو اطمینان ہوجاتا ہے، اور خوراک پوری کھائی جاتی ہے اور نیند اچھی طرح آتی ہے اگر تمہاری حالت ایسی ہی رہے تو تم بے شک متوکل، ورنہ جھوٹے ہو، تمہارا توکل اسباب پر ہے۔

خلاصہ یہ کہ مدرس خادم دین بن کر رہے، اگر طالب آئیں خدمت کرے ورنہ خدا کا نام لے آزاد رہے۔ (مجالس ابرا)

اساتذہ کرام کے لئے راہنما اُصول

محترم ڈاکٹر حافظ قاری فیوض الرحمن صاحب

ذیل میں چند ایسے اُصول بیان کئے گئے ہیں جن کی پابندی اساتذہ و معلمین کے لئے بڑی ہی مفید ثابت ہوگی:

شاگردوں پر شفقت و نرمی:

اساتذہ کو چاہیے کہ شاگردوں پر شفقت کریں اور انہیں اپنی اولاد کی طرح سمجھیں، رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: إنّما أنا لكم مثل الوالد لولده۔ (مسند) میں تمہارے لئے ایسا ہوں جیسے والد اپنی اولاد کے لئے ہوتا ہے۔

ابو ہارون عبدی اور شہر کا کہنا ہے کہ جب ہم طالب علم حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو فرماتے: خوش آمدید خوش آمدید، سنو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عنقریب زمین تمہاری لئے مسخر کردی جائے گی اور تمہارے پاس کم عمر آئیں گے جو علم کے بھوکے پیاسے ہوں گے، دین کی سمجھ کے خواہشمند ہوں گے اور تم سے سیکھنا چاہیں گے پس جب وہ آئیں تو انہیں تعلیم دینا، مہربانی سے پیش آنا، اور ان کی آؤ بھگت کرنا اور حدیث بتانا۔

اساتذہ کو غصہ اور طیش میں نہیں آنا چاہیے، تجربے سے یہ ثابت ہے کہ سخت کلمات کی بنسبت نرم کلمات زیادہ موثر ہوتے ہیں۔

امام غزالی رحمہ اللہ کا ارشاد ہے کہ: استاذ کو بُردبار اور حلیم الطبع ہونا چاہیے۔

شیخ عبد القادر جیلانی رحمہ اللہ کا ارشاد ہے کہ: جب تک تیرا غصہ باقی ہے اپنے آپ کو اہل علم میں شمار نہ کر۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ: معلم کو مہر ومحبت کا مجسمہ ہونا چاہیے، درشت خو آدمی کی بات سننے کے لئے کوئی تیار نہیں ہوتا، قرآن پاک میں ارشاد ہے: {فبما رحمة من اللهِ لنتَ لهم، ولو كنتَ فظاً غليظاً لانفضُّوا مِن حولكَ} (آل عمران: ۱۵۹) آپ اللہ کی مہربانی سے ان کے لئے نرم واقع ہوئے ہیں اور اگر آپ سخت، درشت خو ہوتے تو لوگ آپ سے ہٹ جاتے۔

امام ابویوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اپنے شاگردوں کے ساتھ ایسے خلوص ومحبت سے پیش آؤ کہ دوسرا دیکھے تو سمجھے کہ یہ تمہاری اولاد ہیں۔

طلبہ کو مارنا نہیں چاہیے، کیا اساتذہ اپنی طالب علمی کے دوران اپنے لئے اس مار کو پسند کرتے تھے؟ حدیث پاک میں ہے: لا يؤمن أحدكم حتى يحبَّ لأخيه ما يحبُّ لنفسه،اس وقت تک کوئی کامل مومن نہیں ہوسکتا جب تک اس کے اندر یہ بات نہ ہو کہ اپنے بھائی کے لئے بھی وہی پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ ایک مرتبہ صحن مسجد میں درس دے رہے تھے، بارش ہونے لگی، طلبہ اپنی اپنی کتابیں لے کر اندر چلے گئے، حضرت نے ان کے جوتے اٹھائے اور حفاظت کی جگہ رکھدئے۔

امام صفیان بن عیینہ رحمہ اللہ ایک مرتبہ کسی بات پر طلبہ سے ناراض ہوگئے اور کہا کہ: لقد هممتُ أن لا أحدِّثكم شهراً، میں نے ارادہ کرلیا ہے کہ تمہیں ایک ماہ تک درس نہ دوں، اس پر ایک نوجوان طالب نے عرض کیا: يا أبا محمدا لِن جانبَك، وحسِّنْ قولَك، وتأسَّ بصالحي سلفِك، وَاجمِل مجالسةَ جلسائك، فقد أصبحت بقية النَّاس وأمينًا للهِ ورسوله على العلم، آپ نرمی فرمایئے، اوراچھی بات کیجئے، اپنے اسلاف کرام کی پیروی کیجئے، اپنے حلقہ نشینوں کے ساتھ اچھا سلوک کیجئے، کیونکہ آپ ان بزرگوں کی یادگار، اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے علم کے امین اور ذمہ دار ہیں، شاگرد کی اس بات سے استاذ پر رقت طاری ہوگئی، بہت روئے اور یہ شعر پڑھا(جس کا مطلب یہ ہے):

بستیاں خالی ہوگئیں تو میں بغیر سردار بنائے سردار بن گیا اور تنہا میری سرداری میرے لئے بڑی آزمائش ہے، اور پھر تمام طلبہ کو پڑھانا شروع کردیا۔

اخلاص نیت:

اساتذہ کو چاہیے کہ درس وتدریس میں انتہائی خلوص سے کام لیں، تدریس سے مقصود دنیا کمانا نہ ہو بلکہ خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور آخرت کے لئے یہ کام کریں، رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: مَن تعلَّم علماً مما يبتغى به وجه اللهِ لا يتعلمه إلا ليطلب عرضًا من الدنيا لم يجد عرف الجنَّة يعني ريحها۔ (ابوداود) جس نے ایسا علم سیکھا جس سے اللہ کی رضامندی حاصل کی جاسکتی ہے لیکن اس کا مقصد دنیا ہے تو ایسے شخص کو جنت کی ہوا تک نہیں پہنچے گی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے: جس عالم کو دنیا سے محبت رکھنے والا دیکھو اس کو دین کے بارے میں اچھا نہ سمجھو اس لئے کہ جس کو جس سے محبت ہوتی ہے اسی میں گھسا کرتا ہے۔

اساتذہ کو بہر حال دنیوی حرص ولالچ سے بہت بلند ہونا چاہیے ورنہ وہ عزت کے اس مقام تک پہنچ نہیں سکیں گے جو اس مقدس پیشہ سے وابستہ ہیں، بلکہ حرص ولالچ سے ملنے والا رزق ان کی عزت کو داؤ پر لگوے گا۔

علامہ اقبال نے ویسے ہی نہیں کہا:

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی

جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

یحیی بن معاذ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ: علم وحکمت سے جب دنیا طلب کی جائے تو ان کی رونق چلی جاتی ہے۔

ایک عرب شاعر کا کہنا ہے:

بئسَ المَطاعم حين الذل تكسبها

القِــدر منتصبٌ والقَــدر مخفوضٌ

وہ کھانے کس قدر برے ہیں جن کو ذلت کے ساتھ تو حاصل کرتا ہے کہ ہانڈی تو چولہے پر چڑھی ہے اور عزت خاک میں مل رہی ہے۔

مشہور حافظِ حدیث استاذ حماد بن سلمہ رحمہ اللہ کے ایک شاگرد نے اپنے تجارتی سفر سے واپسی پر اپنے استاذ کی خدمت میں چند تحائف پیش کئے تو انہوں نے فرمایا کہ: ان دو باتوں میں سے ایک کو قبول کرو:

"چاہو تو تمہارے تحفے قبول کرلوں لیکن پھر تم کو حدیث نہ پڑھاؤں گا، اور اگر چاہتے ہو کہ تمہیں حدیث پڑھاؤں تو پھر ہدیہ قبول نہ کروں گا"۔

ابو عبد الرحمن سلمی رحمہ اللہ کی خدمت میں عمر بن حریث نے کچھ اونٹ بطور ہدیہ پیش کئے آپ نے یہ کہہ کر واپس کردیے کہ: ہم نے تمہارے لڑکے کو قرآن پڑھایا ہے اور کتاب اللہ پر ہم اجرت نہیں لیتے۔علیہ

علامہ عیسیٰ بن یونس محدث کی خدمت میں ہارون الرشید کے مشہور وزیر جعفر برمکی نے ایک لاکھ درہم پیش کیے تو انہوں نے فرمایا: میں نہیں چاہتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی قیمت کھاؤں۔

ان ہی کی خدمت میں ایک مرتبہ مامون الرشید نے حدیث سننے کے بعد کافی رقم پیش کی تو فرمایا:
لا شربۃ ماءٍ، پانی کا ایک گھونٹ بھی نہیں (لوں گا)۔

علامہ ابراہیم الحربی کی خدمت میں متعدد بار خلیفۂ وقت معتضد باللہ نے بڑی بڑی رقمیں بھیجیں لیکن انہوں نے ہر بار معذرت کردی، ایک بار قاصد سے کہا کہ: خلیفہ سے کہہ دیں کہ ہمیں پریشان نہ کریں ورنہ ہم یہاں سے کوچ کرجائیں گے۔

ایک مرتبہ مشہور استاذ مولانا مرتضیٰ حسن رحمہ اللہ نے مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ سے عرض کیا حضرت! تنخواہ لینے میں میری طبیعت کو الجھن ہوتی ہے کیونکہ یہ تو صاف دین فروشی ہے، مولانا تھانوی رحمہ اللہ نے فرمایا: ہرگز یہ دین فروشی نہیں، آج کل تنخواہ لینی چاہیے کیونکہ اس سے کام اچھی طرح

ہوگا اور اس کا بار طبیعت پر رہے گا اور بدوں تنخواہ لئے کام کا بار نہیں ہوتا۔

اس پر مولانا مرتضی حسن صاحب رحمہ اللہ نے عرض کیا: تنخواہ لینے میں یہ تو مصلحت معلوم ہوئی مگر اس ضرر کا کیا علاج ہے کہ اس میں دین فروشی ہے؟۔

مولانا تھانوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ:

"اگر کسی شخص کو ایک جگہ اتنی تنخواہ ملتی ہے کہ اس کے گزارے کے لئے کافی ہے پھر دوسری جگہ اس سے زیادہ تنخواہ مل رہی ہے جس میں پہلی جگہ سے زیادہ دینی خدمت کی صورت نہیں ہے تو اگر وہ پہلی جگہ چھوڑ کر دوسری جگہ چلا جائے تو بے شک دین فروشی ہوگی"۔

راقم الحروف کے استاذ پروفیسر ڈاکٹر محمد ضیاء الحق صوفی بن پروفیسر مولانا اصغر علی روحی (گورنمنٹ کالج لاہور) نے ایک مرتبہ دُعا کرنے کے لئے ارشاد فرمایا تو عرض کیا گیا: چھوٹوں کی دعائیں تو بڑوں کو پہنچ ہی جاتی ہیں، آپ بڑے ہیں اور پھر استاذ ہیں، آپ اپنی دعاؤں میں ہمیں یاد فرماتے رہا کریں، اس پر انہوں نے فرمایا: ہمیں استاذ نہ کہا کریں کہ اس سے کوفت ہوتی ہے، اس پر مؤدبانہ عرض کیا گیا کہ: جب آپ ہمارے استاذ ہیں تو پھر کیا کہا کریں؟ فرمانے لگے: بھئی! ہم پڑھانے کی تنخواہ لیتے ہیں، استاذ تو وہ ہوتے تھے جو اللہ کے لئے بغیر کچھ لئے پڑھایا کرتے تھے، اس پر عرض کیا گیا کہ: آپ ہم سے تو کچھ نہیں لیتے حکومت سے لیتے ہیں، فرمایا: میں تو اُسے بھی اچھا نہیں سمجھتا۔

حالانکہ گھر پر طلبہ کو مفت پڑھایا کرتے تھے اور بڑی ہی محنت محبت اور خلوص کے ساتھ پڑھاتے تھے، کئی طلبہ نے ان سے گھر پہ تعلیم حاصل کرکے جامعہ پنجاب سے ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں حاصل کیں، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

شاگردوں کی خیر خواہی:

اساتذہ کو چاہیے کہ طلبہ کی خیر خواہی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کریں:

(الف) امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو جب اپنے ایک شاگرد ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ بہت ہی غریب ہیں اور ان کی والدہ چاہتی ہیں کہ محنت مزدوری کرکے کچھ لائیں تاکہ کھانے پینے کا انتظام ہو تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی طرف سے ان کے لئے وظیفہ اتنا

مقرر کردیا تھا کہ ماں بیٹے کے جملہ اخراجات کے لئے کافی ہوتا تھا، بعد میں یہی ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ چیف جسٹس کے منصب پر فائز ہوئے۔

حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ نے بارہا اپنے شاگردوں کی مالی مدد کی، امام محمد رحمہ اللہ نے بھی اسد بن فرات کی مالی مدد کی، اسی طرح امام شافعی رحمہ اللہ کی بھی کئی بار مالی مدد کی تھی۔

تلامذہ کی یہ مالی مدد اس صورت میں ہے کہ جب اساتذہ میں اس کی وسعت وگنجائش ہو۔

(ب) سبق میں ہرگز ناغہ نہ کریں، اگر مجبوراً ناغہ ہواہو تو اس کی جس حد تک ممکن ہو تلافی کردیں، ربیع بن سلیمان کہا کرتے تھے کہ ہمارے استاذ امام شافعی رحمہ اللہ نے مجھ سے کہا کہ اگر میں تجھے علم گھول کر پلا سکتا تو ضرور پلاتا۔

حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ کہا کرتے تھے کہ بخدا اگر یہ طلبہ میرے پاس نہ آسکیں تو میں خود ان کے پاس جاکر ان کو علم سکھاؤں۔

(ج) پڑھے ہوئے سبق کے متعلق اگلے روز سوال کرکے ان سے جوابات پوچھیں، ہفتہ میں ایک دن علمی سوالات ان سے کیا کریں تاکہ ان کی معلومات میں اضافہ ہوتا رہے۔

(د) ان میں اچھے اخلاق پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کرتے رہیں تاکہ تعلیم کے ساتھ اصل مقصد یعنی تربیت کی بھی تکمیل ہو۔

(ھ) اگر معلوم ہوجائے کہ سبق میں کوئی غلطی ہوگئی ہے تو رجوع کرلیں، اور طلبہ کو صاف بتادیں کہ فلاں بات میں نے غلط کہی تھی، اس کا صحیح مطلب یہ ہے، اس اعتراف میں اساتذہ کی بڑائی ہے، ہرگز توہین نہیں ہوتی، بلکہ ان کی دیانت وامانت کا سکہ طلبہ کے دلوں میں بیٹھ جائے گا۔

محمد بن کعب قرظی کا کہنا ہے کہ ایک شخص نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک مسئلہ پوچھا، انہوں نے بتادیا، ایک دوسرا شخص جو وہاں موجود تھا اس نے کہا امیر المؤمنین! مسئلہ یوں نہیں ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بے شک تم صحیح کہتے ہو، مجھ سے غلطی ہوگئی۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے لوگو! جو بات جانتے ہو وہی کہو، جو نہیں

جانتے اس پر اللّٰہُ أعلم کہا کرو، کیونکہ علم کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ جو بات نہ جانتا ہو اس میں لاعلمی کا اعتراف کرلے۔

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ایک شخص نے سوال کیا تو جواب دیا: میں نہیں جانتا، وہ آدمی کہنے لگا عبداللہ نے کیا اچھا طریقہ اختیار کیا کہ جو نہیں جانتے اس سے لاعلمی کا اقرار کرلیا۔

حضرت مجاہد سے وراثت کا ایک مسئلہ پوچھا گیا، جواب دیا: میں نہیں جانتا، کہا گیا آپ جواب کیوں نہیں دیتے؟ فرمایا: عبد اللہ بن عمر کو جو بات معلوم نہ ہوتی تھی تو صاف لفظوں میں اقرار کرلیتے کہ مجھے معلوم نہیں۔

سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے ایک مسئلہ پوچھا گیا تو کہنے لگے مجھے معلوم نہیں، اور ہلاکت ہے اس کے لئے جو علم نہ رکھنے پر علم کا دعوی کرے۔

امام مالک رحمہ اللہ نے عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول نقل کیا ہے کہ عالم جب لا أدري (میں نہیں جانتا) کہنا بھول جاتا ہے تو ٹھوکریں کھانے لگتا ہے۔

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ لاعلمی کی صورت میں لا أدري کہنا آدھا علم ہے۔

سلف صالحین کے حالات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کو ذرا بھی اس میں تامل نہ ہوتا تھا کہ اگر ان کو کوئی بات معلوم نہ ہوتی تو فوراً اس کا اعتراف کرلیتے تھے یا دوسرے سے دریافت کرکے جواب دیتے۔

راقم الحروف کے استاذ مولانا حافظ محمد ادریس رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ آدمی کے علم سے چونکہ اس کی جہالت زیادہ ہوتی ہے اس لئے اعتراف میں کیا حرج ہے۔

شاگردوں کی تربیت:

تعلیم کا اصل مقصد بتانا نہیں بلکہ بنانا ہے، ہر ہر مضمون کے اساتذہ کا فرض ہے کہ اپنے شاگردوں کی محبت وشفقت کے ساتھ اصلاح کرتے رہیں، اصلاح کا سب سے موثر ذریعہ ذاتی نمونہ ہے اسے کسی بھی اسٹیج پر فراموش نہیں کرنا چاہیے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم معلم انسانیت ہیں، آپ صلی اللہ علیہ

وسلم کا ارشاد ہے: إنما بعثتُ معلمًا،کہ مجھے معلم بناکر بھیجا گیا ہے، اور مجھے معلم اس لئے بناکر بھیجا گیا ہے کہ لوگوں کے اخلاق سنواروں، بعثتُ لأتمم مكارم الأخلاق،آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ارشاد ہے: بعثتم ميسّرين ولم تبعثوا معسرين، تمہیں آسانی کے لئے بھیجا گیا ہے سختی اور تنگی کے لئے نہیں،آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ارشاد ہے: الدين يسرٌ، دین آسان ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: {يريد اللهُ بكم اليسر ولايريد بكم العسر} اللہ تم سے آسانی کا ارادہ کرتاہے تنگی کا نہیں ہے۔(البقرۃ:۱۸۵)

تو جب اللہ تعالیٰ نے خود آسانی کا ارادہ فرمایا، اور دین بھی آسان اور سہل بھیجا اور نبی کو بھی رحمۃ اللعالمین بناکر مبعوث فرمایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر کام میں نرمی اور سہولت کا لحاظ فرمایا اور امت کو بھی اصلاح وتربیت کے سلسلے میں خصوصیت کے ساتھ آسانی کا حکم دیا تو اب اس کے بعد کسی کی مجال کیا ہے کہ وہ آسانی اور سہولت کو اختیار نہ کرے، خواجہ شمس الملک (جو خواجہ نظام الدین اولیاء رحمہ اللہ کے استاذ ہیں) کا کوئی شاگرد اگر ناغہ کرتا تو فرماتے: مجھ سے کیا قصور ہوا کہ آپ نہیں آئے۔

اگر کسی شاگرد سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہوگئی کہ جس کی اصلاح تنہائی میں زیادہ مفید ہو تو تنہائی میں کردینی چاہیے، سب کے سامنے نہیں کہ اس کو شرم آئے گی، اس نصیحت کا تذکرہ البتہ بغیر نام لئے کیا جاسکتاہے تاکہ دوسرے بھی اس نصیحت سے فائدہ حاصل کرسکیں۔

طلبہ کی تربیت کے سلسلے میں سلف صالحین نیک بندوں کے واقعات اور ان کی طالب علمی کے حالات میں سے کوئی نہ کوئی واقعہ سنادینا بھی بے حد مفید ہے۔

اگر طلبہ سے کوئی بات خلاف طبیعت پیش آئے اور ناگواری کا باعث ہو تو معاف کردیں اور اپنے دل کو آئینے کی طرح پاک وصاف رکھیں، کسی طالب علم سے ناخوش ہوکر کینہ نہ رکھیں کہ اس سے دل سیاہ ہوتاہے۔

آئین ماست سینہ چوں آئینہ داشتن
کفر است در طریقت ما کینہ داشتن

یہ شعر ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیے۔

طلبہ کے وقت کا لحاظ رکھنا:

ہمیشہ وقت مقررہ پر اپنی کلاس میں جانا چاہیے تاکہ جب اساتذہ اپنے طلبہ کو وقت کی پابندی کی نصیحت کریں تو انہیں اس پر حیرانی نہ ہو۔

پوری محنت کے ساتھ گھر سے اچھی طرح اسباق کی تیاری کرکے آئیں تاکہ وقتِ مقررہ پر کامیابی کے ساتھ پڑھاسکیں، اگر اپنے پاس نوٹس رکھنا مناسب ہو تو ضرور رکھ لیں تاکہ اپنے سبق اور موضوع سے نہ ہٹیں، جن اساتذہ کو اپنا مضمون پڑھانا آتا ہو طلبہ ہمیشہ دل سے ان کا احترام کرتے ہیں۔

طلبہ کا یہ تعلیمی وقت انتہائی قیمتی ہے یہ کسی صورت ضائع نہیں ہونا چاہیے بلکہ پوری طرح تعلیم وتعلم میں صرف ہونا چاہیے۔

طلبہ کے سامنے کسی کی برائی بیان نہ کرنا:

اساتذہ طلبہ کے لئے آئیڈیل اور نمونہ ہوتے ہیں، ان کے شایانِ شان نہیں کہ ان طلبہ کے سامنے کسی کی برائی بیان کریں، بعض حضرات اپنے مضمون کی برتری کی خاطر طلبہ سے دُوسرے مضامین اور ان کے اساتذہ کی اچھائی بیان نہیں کرتے، یہ اچھی بات نہیں ہے، غیبت ویسے بھی کبیرہ گناہ ہے، اس سے خود بچنا اور دوسروں کو ممکن حد تک بچانا نہایت ضروری ہے۔

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ یہ بات تو ہم ان کے منہ پر بھی کہہ سکتے ہیں، ایسے حضرات کی خدمت میں صاف عرض کردیا جائے کہ پھر ان ہی کے سامنے کہہ دیجئے گا، جو لوگ خود کسی کی برائی بیان کرنے اور غیبت سے باز نہیں آتے وہ کس منہ سے اپنے طلبہ یا دوسروں کو اس عمل سے باز رہنے کی تلقین کرسکتے ہیں، کبھی کسی سے ایسا سلوک نہیں کرنا چاہیے، جو اپنے لئے پسند نہ کرے۔

کبھی بھول کر کسی سے نہ کرو سلوک ایسا
اگر تم سے کوئی کرتا تمہیں ناگوار ہوتا

سبق پڑھاتے وقت طلبہ کی سمجھ کے مطابق بات کرنا:

اساتذہ کو طلبہ کی سمجھ صلاحیت اور استعداد کو سامنے رکھ کر بات کرنی چاہیے، بعض لوگ اپنی قابلیت ظاہر کرنے کے لئے بہ تکلف مشکل ترین الفاظ کا چناؤ کرکے اپنی تقریر کو انتہائی مشکل بنادیتے ہیں اور بعد میں جب طلبہ سے پوچھا جاتا ہے کہ سمجھ آئی؟ تو وہ صاف کہہ دیتے ہیں کہ تقریر اوپر سے گذرگئی، تدریس سے مقصود بھی تو فہم و تفہیم ہے اور اس سلسلے میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اور نمونہ ہمیشہ اساتذہ کے پیش نظر رہنا چاہیے، ارشاد فرمایا: ہمیں یہ حکم ہے کہ لوگوں کے مراتب کا لحاظ رکھیں اور ان کی عقل اور سمجھ کے مطابق ان سے گفتگو کریں، جب کوئی کسی قوم کے سامنے ایسی بات کرتا ہے کہ جس کو وہ نہیں سمجھ سکتے تو وہ فتنہ کا سبب بن جاتی ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام بالکل صاف اور واضح ہوتا تھا، امام مالک رحمہ اللہ کا ارشاد ہے کہ: علم کے لئے مناسب نہیں ہے کہ کسی شخص کے سامنے ایسی بات کرے جس کا سمجھنا اس کے بس میں نہ ہو۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ کا ارشاد ہے کہ: مبتدی طلبہ سے منتہی طلبہ جیسی گفتگو کرنا مناسب نہیں۔

طلبہ سے ذاتی خدمت لینے میں احتیاط:

طلبہ کی سعادت تو اسی میں ہے کہ اپنے اساتذہ کی خدمت میں کوتاہی نہ کریں لیکن خود اساتذہ کو اس سلسلے میں بہت احتیاط کرنی چاہیے:

مولانا قاری عبد الرحمن محدث پانی پتی رحمہ اللہ ایک مرتبہ خط لکھ کر لیٹر بکس میں ڈالنے کے انتظار میں تھے کہ ایک طالب علم نے کہا: حضرت مجھے دے دیں، میں جاکر ڈال دوں، آپ خاموش رہے جب اس نے اصرار کیا تو فرمایا: بھائی! میں طالب علم سے اپنا ذاتی کام نہیں لینا چاہتا۔

امام ابن طاہر فن حدیث پڑھنے کے لئے امام حبال کی خدمت میں حاضر ہوئے دیکھا کہ خود ہی اپنا سب کام کرتے ہیں، ایک مرتبہ ابن طاہر نے بہت اصرار بھی کیا مگر آپ نہ مانے، اس وقت ان کی عمر

اناسی سال تھی۔

ابوالأسود الدوکلی جو نحو کے امام تھے آخر عمر میں فالج کا شکار ہوئے مگر انتہائی احتیاط کا یہ عالم کہ جتنا کام ممکن تھا خود ہی کرتے اور پاؤں گھسیٹتے ہوئے بازار چلے جاتے حالانکہ ان کے ہزاروں شاگرد تھے۔

امام بخاری رحمہ اللہ بھی اپنا کام خود کرتے تھے، جب انہوں نے شہر بخارا کے باہر ایک مہمان سرائے بنوائی تو اس کی تعمیر میں خود بھی مزدوروں کے ساتھ شریک رہے، ایک شاگرد نے آپ کو اس کی کیا ضرورت ہے؟ تو فرمایا: یہ میرے لئے مفید ہے، هذا الذي ينفعني۔

عمل کا اہتمام کرنا:

اساتذہ کو چاہیے کہ شاگردوں کے سامنے عمل کا نمونہ ہوں، ایسے علم سے جس پر عمل نہ ہو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پناہ مانگی ہے: اللّٰهُمَّ إني أعوذبك من علمٍ لا ينفع، اے اللہ! میں ایسے علم سے پناہ مانگتا ہوں جو نفع نہ دے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: إنَّ مِن أشرِّ الناس عند اللهِ منزلة يوم القيامة عالمٌ لاينفع بعلمه، سب سے بدترین شخص مرتبہ کے اعتبار سے اللہ تعالی کے نزدیک وہ عالم ہے جس کے علم سے نفع نہ ہو، ایک حدیث میں ہے: ألا إنَّ شر الشر شرار العلماء، وإنَّ خير الخير خيار العلماء، سب سے بدتر برے علماء اور سب سے بہتر اچھے علماء ہیں۔

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کا کہنا ہے کہ اس خوف سے لرز رہا ہوں کہ قیامت کے دن حساب دینے کے لئے کھڑا کیا جاؤں او رپوچھا جائے کہ تو نے علم تو حاصل کیا تھا مگر اس سے کام کیا لیا؟، ایک جگہ فرماتے ہیں: جو نہیں جانتا اس کے لئے ایک ہلاکت ہے اور جو جانتا ہے اور اس پر عمل نہیں کرتا اس کے لئے سات ہلاکتیں ہیں۔

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ سے سوال کیا گیا قرآنِ پاک میں اللہ پاک نے ارشاد فرمایا ہے: {أدعوني أستجب لكم} مجھ سے مانگو میں قبول کروں گا، مگر کیا سبب ہے کہ ہم دُعا کرتے ہیں اور قبول نہیں ہوتی؟ فرمایا پانچ سبب سے تمہاری دُعا قبول نہیں ہوتی:

(۱) تم نے اللہ تعالیٰ کو پہچانا مگر اس کا حق ادا نہ کیا۔

(۲) قرآن پاک پڑھا مگر اس پر عمل نہ کیا۔

(۳) محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ کیا مگر سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی نہ کی۔

(۴) ابلیس پر لعنت کی مگر اس کی فرمانبرداری بھی کرتے رہے۔

(۵) اپنے عیبوں سے آنکھیں بند کرکے دوسروں کے عیب ڈھونڈتے رہے۔

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ باتیں بنانا سب جانتے ہیں لیکن اچھا وہی ہے جس کا قول وفعل یکساں ہو۔

حضرت علی رضی اللہ کا ارشاد ہے: اے اہل علم! اپنے علم پر عمل کرو؛ کیونکہ عالم وہی ہے جو علم حاصل کرکے عمل کرتا ہے اور جس کے علم وعمل میں اختلاف نہیں ہوتا، عنقریب ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو علم تو رکھیں گے مگر علم اُن کے حلق سے نیچے نہ اترے گا، ان کا باطن ان کے ظاہر سے مختلف ہوگا، ان کا عمل ان کے علم کے خلاف ہوگا، مجلسیں جما کر بیٹھیں گے، آپس میں فخر کریں گے اور لوگوں سے اس لئے ناراض ہوجایا کریں گے کہ ان کی مجلسیں چھوڑ کر دوسرے کی مجلس میں کیوں جا بیٹھے؟ ایسے لوگوں کے عمل اللہ تک نہیں پہنچیں گے۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے: کہ لوگوں کو ان کے اعمال سے پرکھو، نہ کہ اقوال سے، اللہ تعالیٰ نے ایسا قول نہیں چھوڑا جس کی تصدیق یا تکذیب کے لئے کوئی عمل نہ ہو، کسی کی میٹھی میٹھی باتوں سے دھوکہ نہ کھاؤ بلکہ یہ دیکھو کہ فعل کیسا ہے؟۔

ان ہی کا ارشاد ہے کہ: علم کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ جو قلب میں ہے وہ نفع دینے والا علم ہے اور ایک وہ علم جو صرف زبان پر ہے یہ اس پر حجت ہے۔

حضرت قاسم بن محمد رحمہ اللہ کا قول ہے کہ: میں نے ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جنہیں قول پسند نہ تھا صرف عمل سے خوش ہوتے تھے۔

حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: علم عمل کو پکارتا ہے اگر جواب نہیں پاتا تو رخصت

ہوجاتا ہے۔

حضرت مالک بن دینار رحمہ اللہ کا ارشاد ہے کہ آدمی کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی عذاب نہیں کہ اس کا دل سخت ہوجائے، بے عمل عالم کی نصیحت کا اثر دل پر ایسے ہوتا ہے کہ جیسے بارش سنگلاخ چٹان پڑ۔

عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ نے فرمایا: تم بغیر علم کے متقی نہیں ہوسکتے، اور جب تک عمل نہ کرو حسین وجمیل نہیں بن سکتے۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جو شخص علم میں لوگوں پر فوقیت وبرتری رکھتا ہو اُسے چاہیے کہ عمل میں بھی سب سے برتر ہو۔

حضرت سید رفاعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ خبردار! چھلنی کی طرح نہ ہونا کہ وہ عمدہ آٹا تو نکال نکال کر دوسروں کو دے دیتی ہے اور بھوسی اپنے پاس رکھتی ہے، اس طرح تمہارا حال نہ ہونا چاہیے کہ اپنے منہ سے دوسروں کے لئے تو حکمت کی باتیں نکالتے رہو اور خود تمہارے دلوں میں کھوٹ رہ جائے۔

علامہ شعرانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ کسی امام نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ صرف علم سے پاک ہوگیا اور نہ یہ کہ علم ہی سے اس کی مغفرت ہوسکتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ محض علوم میں نفسانیت شریک ہوتی ہے، جب تک عمل نہ کیا جائے نفس برے اخلاق سے پاک نہیں ہوتا۔

حضرت صالح مری رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ طالب دنیا عالم کے پاس بیٹھنے سے بچتے رہو؛ کیونکہ وہ اپنی چکنی چپڑی باتوں سے اور محض زبانی جمع ـ خرچ سے علم کی تعریف کرکے تم کو فتنہ میں ڈال دے گا اس لئے کہ تم اس کی باتوں سے اس دھوکے میں پڑجاؤ گے کہ عمل کی چنداں ضرورت نہیں صرف معلومات بڑھالینا ہی کافی ہے۔

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میرا گزر ایک پتھر پر ہوا جس پر لکھا تھا: مجھ کو پلٹ کر دیکھو عبرت حاصل کروگے، میں نے اسے پلٹ کر دیکھا تو اس پر یہ لکھا ہوا تھا: تم نے معلوم شدہ باتوں پر تو عمل نہیں کیا پھر نئی معلومات کرنے کی کس لئے فکر ہے؟۔

یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ علم کو عمل کے لئے حاصل کرو، اس پر بہت لوگ غلطی کر رہے ہیں اس لئے ان کا علم تو پہاڑوں کے برابر ہے اور عمل چیونٹیوں کے برابر، ہم نے پہلے لوگوں کی تو یہ حالت دیکھی تھی کہ جس قدر جس کسی کا علم بڑھتا تھا اسی قدر دنیا سے بے رغبتی ہوتی تھی مگر اب معاملہ مختلف ہے۔

مالک بن دینار رحمہ اللہ یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

یا معشرَ العلماء! یا مِلْحَ البلد!

ما یُصلِح المِلحَ إذ المِلحُ فسدَ

اے علماء کی جماعت! تم شہر میں نمک کی طرح ہو، بتاؤ اگر نمک ہی خراب ہوجائے تو اُسے کیا چیز درست کرسکتی ہے؟، عوام کی حالت تو علماء کے ذریعے درست ہوتی ہے، اگر علماء ہی بگڑ جائیں تو ان کو کون درست کرے گا۔

ایک حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ سب سے برا آدمی کون ہے؟ فرمایا بگڑا ہوا عالم۔

قرآن مجید میں اچھے اعمال کے کرنے پر اتنا زور دیا گیا ہے کہ ہر جگہ ایمان کے بعد اعمالِ صالحہ کا تذکرہ ہے بلکہ زندگی ملی ہی اس لئے ہے: {لیبلوکم أیکم أحسن عملا} تاکہ اللہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سب سے اچھا عمل کون کرتا ہے۔

علم خوفِ خدا پیدا کرتا ہے، قرآن پاک میں ہے: {إنما یخشی اللہ من عبادہ العلماء} اللہ کے بندوں میں اس سے ڈرنے والے تو بس علماء ہی ہیں، ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: میں تم میں سب سے زیادہ علم رکھتا ہوں اور تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہوں۔

اساتذہ کرام میں بھی اس کی جھلک ضرور نظر آنی چاہیے، ہو نہیں سکتا کہ اساتذہ تو علم وتقوی والے ہوں اور ان کے عمل کا اثر ان کے طلبہ پر صاف دکھائی نہ دے، لہذا علم برائے عمل اور تعلیم برائے تعمیل ہے۔

دُعا کا اہتمام:

اساتذہ جس طرح اپنے اور اپنی آل واولاد کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگتے ہیں بالکل اسی طرح انہیں اپنے شاگردوں کے لئے بھی دعائیں مانگنی چاہئیں، ہمارے اسلاف میں سے ایک بزرگ استاذ کے بارے میں راقم الحروف نے پڑھا ہے وہ لکھتے ہیں کہ مجھے اپنی زندگی کا کوئی ایسا دن یاد نہیں کہ جس میں اپنے اساتذہ اور پھر اپنے شاگردوں کے حق میں اللہ تعالیٰ سے دُعا نہ مانگی ہو۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے مسلم شریف کی روایت میں اللّٰهُمَّ فقِّهه في الدين کے الفاظ آئے ہیں، اے اللہ! اسے دین کی سمجھ عطا کر، دین کی سمجھ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے، ابن ماجہ میں ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مَن يرد اللّٰهُ به خيرًا يفقِّه في الدِّين، جس شخص کے ساتھ اللہ تعالیٰ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے اُسے دین میں سمجھ عطا کرتا ہے۔

ابن ماجہ کی ایک حدیث میں ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فقيهٌ واحدٌ أشدُّ على الشيطانِ من ألفِ عابدٍ، ایک فقیہ شیطان پر ایک ہزار عبادت گزاروں سے زیادہ بھاری ہے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عنقریب تمہارے پاس لوگ تعلیم حاصل کرنے کے لئے آئیں گے جب تم انہیں دیکھو تو انہیں خوش آمدید کہنے والی دعائیں دو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو ان الفاظ میں دُعا دیتے ہیں: اللّٰهُمَّ علِّمه الكتابَ، اے اللہ! انہیں کتاب کا علم عطا فرما، (بخاری کتاب العلم)۔

ابن ماجہ ہی کی ایک روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فرحِّبوا بهم وحيُّوهم وعلِّموهم، انہیں خوش آمدید کہنا، ان کے لئے دُعا کرنا اور انہیں علم سکھانا۔

اساتذہ کو بھی اس کا پورا اہتمام کرنا چاہیے۔ (ماہنامہ الفاروق ربیع الاول ۱۴۲۹ھ)

افادات

شہید اسلام محدث وقت حضرت مولانا محمد امین اورکزئی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ

درس و تدریس کے سلسلہ میں پیش آمدہ مشکلات سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔

اولاً: اسباب کے درجہ میں مطالعہ کے بغیر سبق پڑھانا تو درکنار اس کا تصور تک نہ کیا جائے، جتنا پڑھانا ہے اور جو کچھ بتلانا ہے پہلے خود اس کو خوب ضبط کرلیں قابو یافتہ معلومات کا افادہ اسہل بھی ہوتا ہے اور انفع بھی، خود شرح صدر نہ ہو اور مضمون ضبط نہ ہو تو قدرتی طور پر سامعین نہ محظوظ ہوتے ہیں اور نہ مستفید، مزید برآں اس راہ کے نو وارد کے لئے کتاب کے ایک حاشیہ یا شرح پر اکتفا زیادہ مفید ہوتا ہے، ہاں جہاں اس حاشیہ یا شرح سے متن حل نہ ہو، یا کسی شبہ کا جواب نہ ملے تو وقتی طور پر دیگر شروح کی طرف مراجعت کی جائے، متعدد شروح کے مطالعہ سے فکری انتشار پیدا ہوتا ہے، نتیجۃً درس کے دوران تقریر مربوط نہیں رہتی۔

ثانیاً: قلبی اذعان واعتقاد کے ساتھ "سبحانك لا علم لنا إلا ما علمتنا إنك أنت العليم الحكيم" کا استحضار کرکے درس میں جانا چاہئے، مضامین کے ساتھ ساتھ الفاظ و تعبیرات تک کو فیضان الٰہی کا نتیجہ سمجھئے۔

ثالثاً: ہر فرض نماز کے بعد ابتداً دایاں ہاتھ سر پر رکھ کر سات مرتبہ یا گیارہ مرتبہ "یا قوي" پڑھ کر اسی ہاتھ پر دم کرکے سر پر ہاتھ پھیر لیا کریں، اور درس جاتے وقت قلب پر بطریق مذکور ہاتھ رکھ کر یہی عمل، عمل میں لائیں، تین مرتبہ سورہ کوثر پڑھ کر ہاتھوں پر دم کرکے سینہ پر ملنا بھی بہترین نتائج کے حصول کا ذریعہ ثابت ہوتا ہے۔

دوسرا حصہ

بہترین اسالیب تدریس

امام بخاری رحمہ اللہ کے تدریسی منہج کے اُصول

ایک تحقیقی مضمون اسالیب تدریس کے متعلق امام بخاری رحمہ اللہ کے تراجم کی روشنی میں

مولانا سعید الحق جدون صاحب

امام بخاری رحمہ اللہ امت کے ان عظیم محسنوں میں سے ہیں جن کی محنت سے آج بھی امت مسلمہ فائدہ اٹھارہی ہے، آپ کا پورا نام محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرہ جعفی بخاری، کنیت ابو عبد اللہ، اور لقب بخاری ہے، ۱۳/شوال ۱۹۴ھ کو بخارا میں پیدا ہوئے، اور ۲۵۶ھ میں فوت ہوئے، امام بخاری رحمہ اللہ کو اللہ تعالیٰ نے بلا کا حافظہ اور علم میں ملکہ تامہ عطا فرمایا تھا، مطالعہ آپ کے دل ودماغ کی غذا تھی، درس وتدریس آپ کی فطرتِ ثانیہ بن گئی تھی، علمی مشاغل آپ کا اوڑھنا بچھونا تھا، پوری عمر حدیث پڑھی اور پڑھائی، حدیث لکھی اور لکھوائی، احادیث میں انتہائی مہارت کی بنا پر اس فن کے امام جانے جاتے ہیں۔

جو ہستی احادیث کی تدریس میں امامت کے بلند درجہ پر فائز ہو، عظیم محدث بلند پایہ مربی واتالیق اور منجھے ہوئے استاذ بلکہ استاذ الاساتذہ ہو، اس کے تدریسی تجربات تعلیمی میدان میں ایسی حیثیت رکھتے ہیں جیسے ادب میں ضرب الامثال، امام بخاری رحمہ اللہ جیسے مثالی استاذ کے تدریسی اُصول وقواعد تعلیمی میدان میں معلمین اور متعلمین کے لئے قابل تقلید نمونے ہیں۔

اس لئے وقت کا تقاضا ہے کہ ہم امام بخاری رحمہ اللہ جیسے مثالی استاذ کے تدریسی منہج اور اُصول کو ذکر کریں، تاکہ دینی وعصری تعلیمی اداروں کے اساتذہ امام بخاری رحمہ اللہ کے تدریسی منہج اور اُصول وقواعد سے باخبر ہوں اور ان اُصولوں سے فائدہ اُٹھاکر اپنے تدریسی اسلوب کو بہتر سے بہتر بناکر طلبہ کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچاسکیں، اس مضمون سے طلبہ کو یہ فائدہ ہوگا کہ وہ جان لیں گے کے وہ استاذ کی تدریس سے کس طرح بہتر انداز میں مستفید ہوسکیں گے، اس لئے اس مقالے میں امام بخاری رحمہ اللہ کی شہرہ آفاق کتاب صحیح "بخاری" میں "کتاب العلم" سے ان کے تدریسی منہج کے اصول وقواعد پیش کئے جاتے ہیں:

درس سے پہلے طلبہ کے علمی شوق کو اُبھارنا:

امام بخاری رحمہ اللہ کے تعلیمی نظریات کے مطابق معلم سب سے پہلے شاگردوں کو سبق کی طرف راغب کرے گا، ان کے علمی شوق کو مختلف فضائل اور سابقہ علمی واقفیت سے ابھارے گا، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے باب باندھا ہے: "باب فضل العلم" اس باب کے انعقاد سے امام بخاری رحمہ اللہ کی غرض یہ ہے کہ معلمین اور متعلمین میں علمی شوق اور علمی رغبت پیدا ہو۔

درس کے درمیان سوال نہ پوچھنا:

استاذ سے درس کے دوران اگر کوئی شاگرد سوال پوچھے تو معلم اپنے درس کو پورا کرنے کے بعد جواب دے، درس کے دوران سوال کرنا آدابِ گفتگو کے خلاف ہے، شاگرد کو سبق کے دوران سوال نہیں کرنا چاہئے، اگر کسی شاگرد نے دورانِ درس غلطی سے کچھ پوچھ لیا اور استاذ نے جواب نہ دیا تو یہ قابل ملامت بات نہ ہوگی، امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کے اثبات کے لئے "حدیثِ اعرابی" کو بطورِ استدلال پیش کیا ہے، اعرابی نے بیان کے دوران آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان ختم ہونے کے بعد سائل کے سوال کا جواب دیا۔

یہاں یہ قید ملحوظ رہے کہ وہ سوال کچھ اہم اور ضروری نوعیت کا نہ ہو، اگر ایسا ہو تو فورا سوال کرنے کی گنجائش ہے اور معلم کو فوری طور پر جواب دینا چاہئے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خطبے کے دوران ایک دیہاتی نے سوالات کئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم منبر سے نیچے اترے، اس دیہاتی کو جوابات دئے، اور بعد میں خطبہ مکمل کیا۔

سائل کو نہ جھڑکنا:

مذکورہ حدیثِ اعرابی اور ترجمۃ الباب سے امام بخاری رحمہ اللہ یہ ادب سکھلا رہے ہیں کہ اگر استاذ کے اشتغال کے وقت ان سے سوال کیا جائے تو سائل کو ڈانٹنے اور جھڑکنے کی ضرورت نہیں۔

طلبہ کے استفسار پر ناراض نہ ہونا:

حدیثِ اعرابی میں سائل امانت کے ضائع ہونے کا مطلب نہ سمجھ سکا، اس نے کہا: کیف إضاعتها؟ اس سے معلوم ہوا کہ اگر متعلم کی سمجھ میں کوئی بات نہ آئے تو وہ استاذ سے استفسار کرسکتا ہے اور اس کے استفسار پر معلم کو ناراض نہیں ہونا چاہئے، البتہ اگر سوال کا مقصد استاذ کا امتحان لینا یا اس کو پریشان کرنا ہو تو پھر استاذ کی ناراضگی بجا ہے۔

بلند آواز سے درس دینا:

معلم کو بلند آواز سے درس دینا چاہئے، بعض اوقات اساتذہ دھیمی آواز سے درس دیتے ہیں جس کی وجہ سے طلبہ کو سننے میں دقت پیش آتی ہے یا سرے سے طلبہ سبق سن ہی نہیں سکتے، اس بات کی تائید کے لئے امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت پیش کی ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ ہم ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، نماز کا وقت ہونے کی وجہ سے ہم جلدی جلدی وضو کررہے تھے، ہم گیلا ہاتھ پاؤں پر پھیرنے لگے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پکار کر فرمایا: ایڑیوں کے لئے آگ کی وعید ہے، دو مرتبہ تین مرتبہ یہ فرمایا۔ گویا اس حدیث سے امام بخاری رحمہ اللہ اساتذہ کو ادب بتلا رہے ہیں کہ علمی بات بلند آواز سے بیان کی جائے تاکہ سب لوگ سن سکیں۔

تدریس کو دلچسپ بنانا:

تدریس کو دلچسپ بنانا چاہئے، اساتذہ اگر تشحیذ اذہان کے طور پر طلبہ کے سامنے کوئی مسئلہ پیش کرنا چاہیں تو کرسکتے ہیں اس میں کوئی مضائقہ نہیں، امام بخاری رحمہ اللہ نے استدلال کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک عمل پیش کیا ہے جس کی روایت حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کی ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ درختوں میں ایک درخت ایسا ہے جس کے پتے خزاں میں نہیں جھڑتے، وہ درخت مومن کی طرح ہے، مجھے یہ بتائیں کہ وہ کونسا درخت ہے؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا دھیان جنگلی درختوں کی طرف گیا، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ

عنہما فرماتے ہیں کہ میرے دل میں آیا کہ وہ کھجور کا درخت ہے، لیکن مجھے شرم آئی کہ بڑوں کے سامنے کچھ کہوں تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ ہی فرمائیں کہ وہ کونسا درخت ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ کھجور کا درخت ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تدریس کو دلچسپ بنانے کے لئے بعض اوقات موقع کی مناسبت سے مثال دینا اور کبھی کبھار طلبہ سے پوچھنا چاہئے۔

طلبہ کی علمی آزمائش کرنا:

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس عنوان سے باب قائم کیا ہے: "باب طرح الإمام المسئلة على أصحابه ليختبر ما عندهم من العلم"، یعنی ایک استاذ اپنے رفقاء کی علمی آزمائش کے لئے کوئی سوال کرے، اس عنوان کے تحت امام بخاری رحمہ اللہ نے وہی مذکورہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی کھجور والی روایت بطور استدلال پیش کی ہے، گویا یہ حدیث مکرر ہے، مگر عنوان الگ الگ ہے اور سند بھی جدا ہے، پہلے باب میں تدریس کو دلچسپ بنانے کے لئے بطور مثال اس حدیث کو پیش کیا گیا، جب کہ اس باب میں طلبہ کی ذہنی صلاحیت کا اندازہ لگانے کے لئے یہ حدیث دوبارہ لائی گئی ہے، ترجمۃ الباب سے امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ استاذ کو چاہئے کہ کبھی کبھی طلبہ کا امتحان لے، تاکہ استاذ کو درسگاہ میں طلبہ کے علمی معیار کا اندازہ ہوسکے، اساتذہ کا اپنے شاگردوں سے سوالات کرنا بہتر ہے تاکہ تلامذہ بیدار رہیں، اور غفلت میں وقت ضائع نہ کریں۔

تدریس کے طریقے:

امام بخاری رحمہ اللہ تدریس کے دو طریقوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں: ایک یہ کہ استاذ درس دے اور شاگرد سنے، اور دوسرا یہ کہ شاگرد عبارت پڑھے اور استاذ سنے، امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بعض محدثین نے عالم کے سامنے قراءۃ پر ضمام بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: اللہ نے آپ کو یہ حکم دیا کہ ہم نماز پڑھیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جی ہاں! تو یہ گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پڑھنا ہے، اور ضمام

رضی اللہ عنہ نے اس بات کی اپنی قوم کو اطلاع دی اور اُن کی قوم نے اس خبر کو کافی سمجھا۔

درس گاہ کے آداب:

"باب مَن قعدَ حيث ينتهي به المَجلس"، میں امام بخاری رحمہ اللہ درسگاہ کے دو آداب بتلارہے ہیں:

ایک یہ کہ اگر درس گاہ میں طلبہ زیادہ ہوں تو بعد میں آنے والے طلبہ کو جہاں جگہ ملے وہیں بیٹھ جائیں اور اگر قریب بیٹھنے کی خواہش ہو تو پہلے آیا کریں۔

دوسرا یہ کہ اگر پہلے بیٹھنے والے اس طرح بیٹھے ہوں کہ اگلی صف میں یا بیچ میں جگہ خالی چھوڑدی ہو تو بعد میں آنے والا انہیں پھلانگ کر آگے جاسکتا ہے، اگرچہ تخطی رقاب سے منع کیا گیا ہے، تاہم یہ اس لئے جائز ہے کہ پہلے سے بیٹھنے والوں نے ہی خود بے تمیزی کی کہ آگے جگہ خالی چھوڑدی۔

اپنے سے کم سے علم حاصل کرنا:

"باب قول النّبي صلى الله عليه وسلم رُبَّ مبلّغٍ أوعى من سامعٍ"، سے امام بخاری رحمہ اللہ یہ تنبیہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی طالب علم بڑا فہیم وذکی ہو اور استاذ اس جیسا ہوشیار نہ ہو تو اس کو اس استاذ سے حصول علم میں اعراض نہیں کرنا چاہئے کہ میں تو اتنا فہیم ہوں، بھلا میں اس سے علم حاصل کروں؟ ایسا ہرگز نہ کریں، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: رُبَّ مبلّغٍ أوعى من سامعٍ، بسا اوقات وہ جسے حدیث پہنچائی جائے براہ راست سننے والے سے زیادہ حدیث کو یاد رکھتا ہے، اس باب میں یہ ترغیب دینا ہے کہ اپنے سے کم سے بھی علم حاصل کرنے کا اہتمام کرنا چاہئے۔

بلا امتیاز ہر کسی کو پڑھانا چاہئے:

"رُبَّ مبلّغٍ أوعى من سامعٍ" سے ایک بات یہ بھی معلوم ہورہی ہے کہ معلم کسی کو پڑھانے سے انکار نہ کرے، ہر کسی کو پڑھائے، کیا معلوم کون زیادہ سمجھنے والا ہے، بعض اوقات شاگرد سمجھ بوجھ کے لحاظ سے اپنے استاذ سے آگے نکل جاتا ہے، اور وہ اس سبق سے ایسے فوائد اور معلومات کا ادراک

کرلیتا ہے جو استاذ نہیں کرسکتا، تو ربَّ مبلَّغٍ میں اس طرف اشارہ ہے۔

درس وتدریس کے بغیر محض مطالعہ سے علم حاصل نہیں ہوتا:

ترجمۃ الباب کے تحت فرمان نبوی: "إنما العلم بالتعلم" سے یہ بات معلوم ہوئی کہ علم تعلم سے حاصل ہوگا، محض مطالعہ سے کوئی عالم نہیں بن سکتا، استاد سے باضابطہ تعلیم حاصل کرنا چاہیے، یہ بالکل دھوکہ ہے کہ صرف کتب وشروح دیکھ کر استاد سے پڑھے بغیر علم حاصل ہوسکتا ہے، اس حدیث کی بناء پر فقہاء نے لکھا ہیں کہ جو آدمی ماہر اربابِ فتویٰ سے تربیت مکمل کئے بغیر صرف کتابیں دیکھ کر فتوے دے، اس کی بات کا اعتبار نہیں کرنا۔

تدریس میں تدریجی طریقہ:

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس باب کے تحت علماء ربانیین کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا: ويقال الرَّبَّاني الذي يُربِّي الناس بصغار العلم قبل كباره، یعنی ربانی اس شخص کو کہاجاتا ہے جو بڑے مسائل سے پہلے چھوٹے مسائل سمجھا کر لوگوں کی علمی تربیت کرے۔

گویا ان الفاظ سے امام بخاری رحمہ اللہ کے تدریسی منہج کے وہ اُصول معلوم ہورہے ہیں کہ تدریس میں اجمال سے تفصیل، آسان سے مشکل اور کم سے زیادہ کی طرف آہستہ آہستہ سکھایا جائے، تدریس میں اہم بات یہ ہے کہ استاد اپنے شاگردوں کو علم کے پیچیدہ مسائل میں شروع سے نہ الجھائیں کہ وہ اُنہیں میں پھنس کر رہ جائیں، بلکہ آسان چیزیں پہلے ہی سکھادیں، تاکہ شاگردوں کے اندر علم سے محبت بڑھے اور اُن کے حوصلے میں اضافہ ہو۔

تدریس میں طلبہ کی نفسیات کو مدنظر رکھنا:

ایک معلم کو طلبہ کی نفسیات کو مد نظر رکھتے ہوئے سبق پڑھانا ضروری ہے، تدریس میں نہ اتنی طوالت ہو کہ طلبہ میں بوریت پیدا ہو اور نہ اتنا اختصار ہو کہ غبی طلبہ سمجھ نہ سکیں، امام بخاری رحمہ اللہ نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے باب قائم کیا ہے: "ما كان النبي صلى الله عليه وسلم

يتخولهم بالموعظة والعلم كي لا ينفر "یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کی رعایت کرتے ہوئے کبھی کبھی نصیحت فرماتے اور تعلیم دیتے تاکہ ان کو ناگوار نہ گزرے، حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آسانی کرو اور سختی نہ کرو، اور خوش کرو اور نفرت نہ دلاؤ۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں کچھ دن نصیحت فرمانے کے لئے مقرر کردیتے تھے، ہمارے پریشان ہوجانے کے خیال سے، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر روز نصیحت نہ فرماتے۔

تدریس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ استاد سبق پڑھاتے وقت کچھ لطیفے یا اشعار وغیرہ بھی سنادیا کرے، اس طرح ذہن تروتازہ ہوجاتا ہے اور طلبہ بیزاری اور اکتاہٹ محسوس نہیں کرتے ہیں، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مزاح فرمایا کرتے تھے۔

تدریس میں طلبہ کی گروہ بندی کرنا:

"فهمٌ في العلم" سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ لوگ فہم فی العلم میں مختلف ہوتے ہیں، کوئی ذہین تو کوئی متوسط اور غبی، لہذا استاد کو سب کی رعایت کرنی چاہئے، ایک اچھے معلم کی یہ خوبی ہے کہ وہ ان تین قسموں میں گروہ بندی کرے، اور ہر ایک گروہ کو علیحدہ علیحدہ پڑھائے، یا ایک درس دے، لیکن ان میں سے ان تینوں قسم کے طلبہ کے معیار کا خیال رکھا جائے۔

تعلیم بالغاں:

"تفقَّهوا قبل أن تسودوا" "سردار بنائے جانے سے پہلے تفقہ حاصل کرو، یا یہ سواد لحیہ سے ماخوذ ہے، یعنی بالوں کی سفیدی سے پہلے علم حاصل کرو۔

امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول سے یہ نہ سمجھا جائے کہ سیادت کے بعد علم نہ حاصل کیا جائے، وقد تعلَّم أصحابُ النَّبيِّ صلَّى الله عليه وسلَّم في كبر سنِّهم، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے کبر سنی میں تعلیم حاصل کی ہے، لہذا ہوجیئر عمر والوں

کے لئے ان کی کبرسنی علم حاصل کرنے سے مانع نہیں، ان کو بھی پڑھانا چاہیے۔

طلبہ کے درمیان مناظرہ کا اہتمام کرنا:

امام بخاری رحمہ اللہ نے قصہ خضر وموسیٰ علیہما السلام میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حر بن قیس کا مناظرہ ذکر کیا ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما حر بن قیس کے مقابلہ میں جیت گئے۔

اس سے امام بخاری رحمہ اللہ کے تدریسی منہج کے یہ اُصول مستنبط ہورہے ہیں کہ استاد بعض اوقات طلبہ کے درمیان درس گاہ میں کسی موضوع پر مباحثہ کرائے، تاکہ طلبہ کی دلچسپی پیدا ہوجائے، اور سبق سننے کے لئے بیدار ہوجائیں۔

درس دیتے وقت مثال دے کر طلبہ کو سمجھانا:

امام بخاری رحمہ اللہ نے "باب مَن علِمَ وعلَّم" میں ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے اِس علم وہدایت کے ساتھ بھیجا ہے اس کی مثال زبردست بارش کی سی ہے جو زمین پر خوب برسے، بعض زمین پر خوب برسے، بعض زمین جو صاف ہوتی ہے وہ پانی کو پی لیتی ہے اور بہت سبزہ اور گھاس اگاتی ہے اور بعض زمین جو سخت ہوتی ہے وہ پانی کو روک لیتی ہے، اس سے اللہ تعالیٰ لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے، وہ اس سے سیراب ہوتے ہیں اور سیراب کرتے ہیں اور کچھ زمین کے خطوں پر پانی پڑا، وہ بالکل چٹیل میدان ہی تھے، نہ پانی کو روکتے ہیں اور نہ سبزہ اگاتے ہیں، تو یہ مثال ہے اس شخص کی جو دین میں سمجھ پیدا کرے، اور نفع دے اس کو وہ چیز جس کے ساتھ میں مبعوث کیا گیا ہوں، جس نے علم دین سیکھا اور سکھایا اور اس شخص کی مثال جس نے سر نہیں اٹھایا جو ہدایت دے کر میں بھیجا گیا ہوں اسے قبول نہیں کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ نے جو علم وحکمت عطاء فرمائی، اس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی اچھی مثال سے واضح فرمایا کہ: تین طبقے ہیں:

ایک طبقہ ایسا ہے جس نے خود بھی فائدہ اٹھایا اور دوسروں کو بھی نفع پہنچایا۔

دوسرا طبقہ وہ ہے جنہوں نے خود تو فائدہ نہیں اٹھایا مگر دوسرے اس سے مستفید ہوتے ہیں، یہ

دونوں جماعتیں بہر حال بہتر ہیں، پہلی کو دوسری پر فضیلت حاصل ہے۔

تیسری جماعت وہ ہے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر کان ہی نہ دھرا، یہ سب سے بدتر جماعت ہے۔

اس روایت سے امام بخاری رحمہ اللہ کے تدریسی طریقۂ کار کا اندازہ ہوتا ہے کہ درس دیتے وقت طلبہ کو سمجھانے کے لئے مثال دینا چاہیے، جس طرح پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو سمجھانے کے لئے مثال دیتے تھے، کیونکہ بعض اوقات ایک مثال ہزار الفاظ سے بہتر ہوتی ہے۔

طلبہ کو واجب المنزل یعنی گھر میں کرنے کا کام دینا:

امام بخاری رحمہ اللہ کا نظریہ یہ ہے کہ معلم فقط پڑھانے پر اکتفا نہ کرے بلکہ اسباق کو طلبہ سے یاد بھی کرائے، اور دوسروں تک منتقل کرنے کی ترغیب بھی دے تاکہ تعلیم وتعلم کا سلسلہ جاری رہ سکے، اہل علم اور مدرسین کو چاہیے کہ متعلم کو اسباق یاد کرنے اور ان اسباق کی تبلیغ کرنے کی تاکید میں قصور نہ کریں۔

تعلیم وتربیت کے لئے استاد بعض اوقات اظہار غضب کرسکتا ہے:

امام بخاری رحمہ اللہ نے باب قائم کیا ہے: "باب الغضب في الموعظة والتعليم"، اس باب سے امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ یسّروا ولا تعسّروا، اور ان جیسی روایات کو دیکھ کر یہ نہ سمجھا کہ تعلیم وتدریس میں غضب کی گنجائش نہیں ہے، بلکہ بعض مواقع میں غضب اور شدت نہ صرف جائز ہے بلکہ مستحسن ہے۔

تدریس میں اعتدال پسندی:

تدریس میں اعتدال سے کام لینا چاہیے، تدریس جب طویل ہو تو طلبہ میں تھکان اور بوریت پیدا ہوجاتی ہے، امام بخاری رحمہ اللہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا ہے کہ: أيها الناس إنّكم منفّرون فمن صلّى بالنّاس فليُخفّف، اے لوگو! تم لوگ نفرت پھیلاتے ہو، جو شخص

لوگوں کو نماز پڑھائے وہ تخفیف کرے، اس جملے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ استاد اتنا طویل درس نہ دے جس سے طلبہ میں نفرت پیدا ہو۔

درس گاہ میں بیمار اور حاجت مند طلبہ کا خیال رکھنا:

اس غرض کے لئے امام بخاری رحمہ اللہ نے مذکورہ کتاب الصلاۃ والی روایت کتاب العلم میں لائی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امام کو طویل نماز سے بچنے کی تنبیہ ان الفاظ میں فرمارہے ہیں: "فإنَّ فيهم المريض والضَّعيف وذا الحاجة" اس لئے کہ ان نمازیوں میں بیمار، کمزور اور حاجت مند لوگ ہیں۔

کتاب العلم میں اس روایت سے ہم یہ استدلال کرسکتے ہیں کہ درس گاہ میں استاد کو چاہیے کہ وہ بیمار، کمزور اور حاجت مند طلبہ کا خیال رکھے۔

رُک رُک کر درس دینا:

امام بخاری رحمہ اللہ کا تدریسی منہج یہ ہے کہ استاد درس ہمیشہ رُک رُک کر سمجھاتے ہوئے واضح الفاظ میں دے، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے باب قائم کا ہے: "من أعادَ الحديثَ ثلاثًا ليُفهمَ عنه" اس باب میں انہوں نے استدلال کے لئے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے: إنَّه إذا تكلَّم بكلمةٍ تكلَّم ثلاثًا ليُفهمَ عنه، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم گفتگو فرماتے تو تین مرتبہ دہراتے تھے، تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات اچھی طرح سمجھ میں آجائے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر جگہ تکرار کی عادت نہیں تھی، بلکہ یہ تکرار وہاں ہوتی جہاں افہام کی ضرورت پیش آتی، مثلا یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اندیشہ ہوتا تھا کہ ایک مرتبہ سن کر بات ذہن نشین نہیں ہوئی یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس موقع پر تکرار فرماتے جہاں ابلاغ و تعلیم مقصود ہو یا کہیں مجمع زیادہ ہوتا اور آواز نہیں پہنچ پاتی یا زجر مقصود ہوتا تو تکرار فرماتے۔

نتائج

۱۔ تعلیم دینے کے لئے استاد کی تربیت کا اہتمام ضروری ہے، جو استاد تربیت یافتہ نہ ہو وہ طلبہ کو اچھے انداز میں تعلیم نہیں دے سکتا۔

۲۔ محدثین، مفسرین اور علمائے دین نے تعلیم وتربیت کے لئے ایسے اصول وقواعد وضع فرمائے ہیں جن کی افادیت آج کے جدید دور میں بھی مسلم ہے۔

۳۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے احادیث نبویہ علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کی روشنی میں معلمین کی تربیت کے لئے قابل تقلید ایک مکمل خاکہ پیش کیا ہے۔

کامیاب مدرس اور طریقہء تدریس

محدث العصر

حضرت مولانا محمد یوسف بنوری صاحب رحمہ اللہ

مدارس عربیہ کا نصاب تعلیم جس طرح محتاج اصلاح ہے اس سے کہیں زیادہ "نظام تعلیم" کی اصلاح کی حاجت ہے، نظام تعلیم سے میری مراد ایک وسیع مفہوم ہے جس میں طلبہ کی تربیت ونگرانی، طلبہ کا علمی معیار، طلبہ کا اخلاقی معیار، تدریس کا طریقہ، (کن کن مضامین پر زیادہ توجہ کی ضرورت) طلبہ کی ذہنی تربیت کے لئے کیا کیا وسائل ہونے چاہئیں؟ طلبہ میں علمی استعداد پیدا کرنے کے لئے ترغیب وترہیب کے کیا کیا وسائل ہونے چاہئیں؟ غرض صلاح وتقوی، علمی معیاری قابلیت، اخلاص وعمل کی روح پیدا کرنے کے لئے کن کن تدابیر کو کام میں لایا جائے؟۔

جب تک طلبہ کے قلوب میں امراض نہیں تھے، دماغوں میں جد وجہد کا جذبہ موجود تھا، طبیعتیں علمی مسابقت سے سرشار تھیں، اساتذہ میں اخلاص وتعلق مع اللہ کی روح جلوہ گر تھی اور تعلیم وتعلم دونوں کا مقصد خدمت علم وخدمت دین تھا یا کم از کم حصولِ علم میں تو ان تدابیر کی حاجت نہیں تھی، لیکن نقطۂ خیال بدل گیا تعلیم کا مقصد حصولِ سند ہے یا حصولِ ملازمت، اساتذہ میں وہ روح نہ رہی، ان کا مقصد مشاہرہ کا حصول یا مہتمم کو خوش کرنا یا پھر طلبہ سے خراج تحسین کی سند حاصل کرنا، جب یہ امراض پیدا ہوگئے تو اب ضرورت ہے کہ انتہائی دل سوزی اور جان فشانی کے ساتھ اس کے علاج کی طرف توجہ کرنی چاہئے، سابق الذکر امور میں سے ہر ایک کافی تفصیل طلب ہے، لیکن "نظام تعلیم" کی اصلاح کے لئے یہاں چند اہم ترین امور کی اصلاحی تدابیر کا اجمالی خاکہ پیش کرنا ہے۔

(۱) مدرسین حضرات کا طریقۂ تدریس یہ ہونا چاہئے کہ:

(الف) کتاب کے مشکلات کو سادے الفاظ میں اور اختصار کے ساتھ حل کرنے کی کوشش۔

(ب) تعبیر کے لئے عمدہ دل نشین واضح طریقہ اختیار کریں۔

(ج) کتاب کے حل کرنے میں قطعاً سستی سے کام نہ لیا جائے۔

(د) حل کتاب کے بعد فن کی مہمات پر طلبہ کو متوجہ کیا جائے۔

(و) جس مشکل کی شرح کسی نے عمدہ کی ہے ان کا حوالہ دیا جائے اور طلبہ کو ان مآخذ سے روشناس کرایا جائے تاکہ مستعد وذہین طلبہ اپنی معلومات کو آگے بڑھا سکیں۔

(م) فضول وبیکار مباحث میں طویل تقریر کرکے طلباء سے داو تحقیق حاصل کرنا، یہ تدریس کا سب سے بڑا فتنہ ہے اس کو ختم کرنا چاہئے۔

(۲) کتابوں کے اختتام، اور اول سے آخر تک تعلیم میں تطابق (یکسانیت ہو)، جو کتابیں ایسی ہیں جن کا ختم کرنا ضروری ہے پوری توجہ کرنی چاہئے کہ کتاب ختم ہوجائے، کوئی بحث رہ نہ جائے، جب تک کتاب ختم نہ ہو اس کا امتحان نہ لیا جائے بلکہ تا اختتام کتاب سالانہ امتحان مؤخر کیا جائے، اور اس مشکل پر قابو پانے کے لئے کتابوں کو تین حصوں پر تقسیم کرنا چاہئے، کہ سہماہی، ششماہی، سالانہ امتحان تک کہاں سے کہاں تک کتاب پہنچ جانی چاہئے، اس کا شدت سے انتظام کیا جائے، ایسا نہ ہو کہ ابتداء میں ماہ دو ماہ بڑی بڑی تقریریں ہوں اور آخر میں صرف ورق گردانی (جیسا کہ ہدایہ، مشکوۃ، اور درجہ ثامنہ کی کتابوں کے ساتھ کیا جاتا ہے) جس نے علم کی ریڑھ کی ہڈی توڑ دیں۔

(۳) جو اساتذہ جن کتابوں کے لئے زیادہ موزوں ہوں علمی استعداد اور طبعی رجحانات کے اعتبار سے تقسیم اسباق میں اس کا خیال ضرور رکھا جائے۔

(۴) ابتدائی دو سال کی تعلیم میں نتائج امتحانات میں نہایت سختی کی جائے، ناکام کو قطعاً کسی مراعات کی بناء پر کامیاب نہ بنایا جائے، وسط اور انتہائی تعلیم میں معقول اعذار کی بنا پر تسامح قابل برداشت ہے لیکن ابتدائی تعلیم میں ہرگز ایسا نہ کیا جائے۔

(۵) ابتدائی تعلیم اچھے اور تجربہ کار کے حوالہ کرنی چاہئے، جو مسائل کو عمدہ اور مفید ترین طریقے پر

ذہن نشین کرنے کی قابلیت رکھتے ہوں، الغرض ابتدائی تعلیم کی عمدگی وپختگی پر بے انتہا توجہ کی ضرورت ہے، اگر اعلیٰ تعلیم کے اساتذہ کو ابتدائی درجہ کا کوئی سبق بھی دیا جائے تو اس میں بہت فوائد ومصالح ہیں۔

(۶) مدرسین کو اسباق اتنے دیے جائیں تاکہ وہ مطالعہ وتدریس کی ذمہ داری پر صحیح طریقے سے عہدہ برآ ہوسکیں، جس کا اجمالا اندازہ یہ لگایا جاسکتا ہے کہ ابتدائی درجہ کے اساتذہ کے پاس زیادہ سے زیادہ پانچ گھنٹے تعلیم کے لئے ہوں، متوسط درجات کے لئے چار گھنٹے اور آخری درجات کے لئے تین گھنٹے۔

(۷) اساتذہ ایسے رکھے جائیں جو ہمہ تن مدرسہ سے وابستہ ہوں، ایسا نہ ہو کہ صرف دو تین گھنٹے کا رسمی تعلق ہو یا کہیں اور ملازم ہوں، مدرسہ کے مصالح کے پیش نظر یہ صورت بہت اہم وقابل توجہ ہے۔

(۸) اساتذہ کے انتخاب میں حسب ذیل معیار انتخاب ہوں:

(۱) اخلاص۔ (۲) تقویٰ وصلاح۔ (۳) اعلیٰ قابلیت۔ (۴) تدریس سے شوق۔ (۵) اس فن سے مناسبت جو استاد کے حوالہ ہوں۔ (۶) مدرسہ کے نظام سے وابستگی۔ (۷) طلبہ کے تعلیمی واخلاقی معیار کو بلند کرنے کا جذبہ۔

مقررہ کتابوں کی تدریس میں اعلیٰ درجہ کی مہارت رکھتے ہوں جس کا حاصل یہ ہے کہ استعداد بہت اعلیٰ ہو اور جن علوم کو پڑھاتے ہوں ان سے شغف وطبعی مناسبت ہو، غرض یہ کہ محض وقت گذار نا یا معاش کی ضرورت کو پورا کرنا مقصد نہ ہو، یہ سب باتیں بہت اہم ہیں، ان میں سے کسی ایک بات کی بھی کمی ہو تو صحیح کام نہ ہوسکے گا۔

(۹) اساتذہ کو فن کی اعلیٰ کتابوں کی طرف مراجعت کرنی چاہئے تاکہ عمدہ معلومات طلبہ کے لئے فراہم کرسکیں، الغرض مطالعہ وجدوجہد ضروری ہے تن آسانی وراحت کوشی سے صرف سابقہ معلومات پر اکتفا نہ کرنا چاہئے، طلبہ کے اندر اعلیٰ علمی معیار پیدا کرنے کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ

اساتذہ اس معیار کے ہوں۔

(١٠) جہاں تک مقدرت ہو طلبہ کو راحت وآسائش پہنچائی جائے اور طلبہ اتنے رکھے جائیں جن کی عمدہ خدمت ہوسکے، لیکن اس کے ساتھ ان کی علمی نگرانی، درس میں حاضری، رات کا مطالعہ، امتحان میں سختی، ان سب باتوں میں کوئی رعایت یا سستی اختیار نہ کی جائے، باقاعدہ طلبہ کے احوال کا معائنہ رکھا جائے، اور اس کے لئے انتظام ہو، اگر کوئی طالب علم سہ ماہی میں ناکام ہو تو اس کا کھانا بند کردیا جائے، اور اگر ششماہی میں بھی ناکام ہو تو آخر سال تک مزید موقع دیا جائے، اگر سالانہ امتحان میں بھی نتیجہ ساقط رہا تو اس کو علیحدہ کردیا جائے، ان امور میں سستی کرنا علم کو دفن کرنے کے مترادف ہے۔

(١١) ابتدائی درجہ عربی کے طلبہ کا ماہانہ امتحان لازمی قرار دیا جائے، مقدار خواندگی متعین کی جائے، کوشش ہو کہ اس حد تک کتاب پہنچ جایا کرے۔

(١٢) ہر درجہ کے مناسب مطالعہ کے لئے کوئی نہ کوئی کتاب منتخب کرکے متعلم کو دی جائے، اس کتاب کا امتحان سالانہ لازمی قرار دیا جائے۔

(١٣) طلباء کی اخلاقی نگرانی، عادات کی اصلاح اور دینی وضع کی پابندی بے حد ضروری ہے، باجماعت نماز کی پابندی، سیرت وصورت کی تربیت واصلاح کی طرف پوری توجہ ہونی چاہئے، ان امور میں سستی زہر قاتل ہے، غیر ذکی طالب علم اگر محنتی ہو وہ صالح ہو اس کو برداشت کیا جاسکتا ہے لیکن ذکی بدشوق وبداطوار ہرگز رعایت کے مستحق نہیں۔

(١٤) مدرسہ کے ضوابط ایسے ہوں کہ طلباء خود بخود دینی وضع، صالحین کے شعار، پوشاک، خورد ونوش ومعاشرت وعبادت میں پابند ہوجائیں۔

(١٥) امتحانات میں مسابقت وتقدم کے لئے ترغیبی وظائف رکھے جائیں، سالانہ امتحان میں اعلیٰ کامیابی پر انعامات مقرر کئے جائیں، انعامات میں بجائے نقد رقوم کے عمدہ عمدہ کتابیں دی جائیں اگر انعامی کتب میں ان کی علمی استعداد وطبعی خصوصیت کی رعایت رکھی جائے تو اور سونے پہ سہاگہ کا کام

دے گی، مثلاً حدیث میں اعلیٰ کامیابی پر حدیث کی کوئی عمدہ کتاب، تفسیر میں اعلیٰ کامیابی پر تفسیر کی اعلیٰ کتاب دی جائے۔

(۱۶) ہر سال کے امتحانات میں ایک پرچہ امتحان کا ایسا ہو جس سے عام اہلیت وقابلیت وعلمی استعداد کا پتہ چلے، کسی خاص کتاب سے تعلق نہ ہو، آخری فراغت علوم کے امتحان میں یہ تشخیص بہت ضروری سمجھی جائے۔

(۱۷) عربی ادبی زبان کی قابلیت مقاصد تعلیم میں شامل کرنی چاہئے، ابتداء سے عربی انشاء نویسی کی مشق وتمرین کا سلسلہ جاری رکھنا چاہئے ایک گھنٹہ مخصوص تحریر عربی کا ہو، جو ہر درجہ میں لازمی ہو، تین سال تعلیم حاصل کرنے کے بعد چوتھی جماعت میں تدریس کی زبان عربی ہو، مدرس عربی میں پڑھائے، طلبہ واساتذہ کے سوالات وجوابات کا سلسلہ بھی عربی میں ہونا چاہئے۔

(۱۸) طلباء میں عربی ادب کا ذوق پیدا کرنے کے لئے عربی مجلات وصحف وجرائد کا اجراء لازمی ہے اور ایک "دار المطالعہ" کا قیام اس مقصد کے لئے ضروری ہے۔

(۱۹) طلبہ میں تقریر وخطابت کی روح پیدا کرنے کے لئے ہفتہ وار جمعہ کی رات تقریر کرنے کے لئے مجلسیں قائم کی جائیں، ہر درجہ کے طلبہ کے لئے علیحدہ مجلس تربیت ہو اور ہر ایک مجلس کی نگرانی وتربیت ایک استاذ کی سپرد ہو، آخری تقریر استاذ کی ہو، ہر جلسہ کے لئے تقریر کا موضوع متعین ہو، اور آخری استاذ کی تقریر میں تقاریر پر تنقید وتبصرہ ہو، ہر ہفتہ وار مجلس کا وقت کم از کم تین گھنٹہ ہو۔

(۲۰) مدرسہ میں طلبہ کی تکثیر جماعت وتکثیر افراد کی کوشش نہیں کرنی چاہئے، کمیت قابل التفات نہ ہو بلکہ کیفیت پر توجہ مرکوز رکھی جائے، مستعدین کی قلیل جماعت غیر مستعد نااہل کے جم غفیر سے زیادہ قابل قدر سمجھی جائے، دس صحیح طالب علموں پر سالانہ بیس ہزار کا خرچ قابل برداشت ہونا چاہئے، لیکن سو نااہلوں پر بیس ہزار کا خرچ بھی قابل مواخذہ ہے۔

الغرض خطرناک وبا کی شکل میں مدارس عربیہ دینیہ میں یہ مرض پیدا ہوگیا، اس کے علاج

وتدارک کی طرف پوری توجہ کی ضرورت ہے۔

(۲۱) "نظامِ تعلیم" میں عوام کو مدرسہ کی امداد پر مائل کرنے کے بجائے علم ودین کی خیر خواہی مقدم ہونی چاہئے، خالق کی رضا مخلوق کی رضا سے مقدم ہونی چاہئے، مخلوق کی رضامندی کی کوشش اور حق تعالی کی رضاجوئی سے غفلت کے نتائج دینی ودنیوی خسران ہے۔

(۲۲) مدرسہ کے سالانہ بجٹ میں امتیازی وظائف وانعامی کتب کی مد ضرور رکھی جائے۔

(۲۳) ہر زمانہ کے ایک فن ہوتا ہے، اس زمانہ کا مخصوص فن تاریخ وادب ہے، اس پر توجہ زیادہ کرنی ہوگی۔

(۲۴) قرآن کریم کا ترجمہ ابتداء سے شروع کرنا چاہئے اور تین چار سال میں ختم کرنا چاہئے، بغیر کسی تفسیر کے محض ترجمہ ابتداء زیر درس ہونا چاہئے، اور قابلیت بڑھانے کے لئے مخصوص اجزاء اور سورتوں کا انتخاب کرنا چاہئے، جنہیں لغوی وادبی تحقیق کے ساتھ پڑھانا چاہئے۔

(۲۵) بہت غور وخوض کے بعد ہم جس نتیجہ پر پہنچے ہیں وہ یہ ہے کہ اس موجودہ پُرفتن دور میں جب تک حاملین علم میں حسب ذیل صفات نہ ہوں وہ کبھی بھی حفاظت دین کی خدمت کے اہل نہیں بن سکتے، وہ صفات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ اخلاص۔ ۲۔ صلاح وتقوی۔ ۳۔ کامل علمی استعداد۔ ۴۔ صبر واستقلال۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اگر اخلاص نہ ہوگا تو اللہ تعالی کے یہاں سے قبولیت کی خلعت عطا نہ ہوگی جو برکت کا ذریعہ ہے۔ اگر تقوی نہ ہو تو عوام پر اس کا اثر نہ ہوگا۔ اور علمی استعداد نہ ہو تو مرض کا علاج نہ ہوسکے گا۔ اگر صبر واستقلال نہ ہوگا تو کامیابی نہیں ہوسکتی۔ (تحفۂ مدارس ۲/۳۴۳-۳۴۴)

طریقہ تعلیم درجاتِ عربیہ

استاذ العلماء حضرت مولانا خیر محمد جالندھری صاحب رحمہ اللہ

نحمده ونصلي على رسوله الكريم، وعلى آله وصحبه أجمعين، أما بعد:

میرا ناقص تجربہ شاہد ہے کہ نصابِ تعلیم میں زیادہ تغیر وتبدل کرنا اس درجہ مفید نہیں جس درجہ "طریقۂ تعلیم" تبدیل کرنا مفید ہے، اور اساتذہ کو خود عملی نمونہ بننا، اور طلبہ کے اخلاق واعمال کی تربیت واصلاح کی جانب توجہ فرمانی تو مفید تر ہے، لہذا اساتذہ کی خدمت میں چند معروضات اور بعض امور متعلقہ طریق تعلیم عرض کئے جاتے ہیں، اگر ان پر عملاً التزام کیا گیا تو انشاء اللہ قوی امید ہے کہ طلبہ کو علوم وفنون اور کتابوں سے بہت جلد مناسبت اور استعداد پیدا ہوجائے گی، نیز ان کی عملی اور اخلاقی حالت بھی سدھر جائے گی، یہی تعلیم کا اصلی مقصد ہے۔

۱۔ دینی تعلیم مع اپنے مبادی کے عبادت وطاعت ہے اور اس کا ثمرہ آخرت میں اجر عظیم ہے، لہذا تمام اساتذہ عبادت وطاعت اور اجر وثواب ہی کی نیت سے دینی تعلیم کو اپنا فریضہ سمجھیں اور معاشی ضروریات تنخواہ وغیرہ کو اس کے حصول کا وسیلہ وذریعہ خیال فرمائیں۔

۲۔ اساتذہ تعلیم وتدریس کے علاوہ طلبہ کی دین داری اور اعمال واخلاق کی نگرانی کو بھی اپنا فرض سمجھیں اور حسب ضرورت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض بھی ادا کریں، اور بوقت ضرورت زجر وتوبیخ سے بھی کام لیا کریں، خصوصا زی صلحاء (نیک لوگوں کا سالباس اور ہیئت) نماز باجماعت، ابتداء بالسلام اور جواب سلام کی خود بھی پابندی کریں اور طلباء سے بھی پابندی کرائیں، داڑھی منڈانا یا کترانا، انگریزی وضع کے بال رکھنا اور لباس پہننا سگریٹ نوشی وغیرہ منکرات مکروہات کو قطعا روانہ رکھیں، جو طلبہ اس سے باز نہ آئیں ان کو فوراً مدرسہ سے خارج کردیں، اسی طرح فاسد العقیدہ طالب علم کا وجود بھی مدرسہ کے لئے سخت مضر ہے، اگر افہام وتفہیم کے باوجود باز نہ آئے تو اس کو

بھی مدرسہ سے نکال دیں۔

۳۔ اساتذہ اپنے مطالعہ کے وقت اپنے ذہن میں ہر ہر سبق کی ایسی ترتیب قائم کرلیا کریں جسے طلبہ کے ذہن بآسانی قبول وضبط کرسکیں اور پڑھاتے وقت وضاحت اور سہولت کا خاص طور پر لحاظ رکھا کریں، الزامی جواب کے بعد تحقیقی جواب بھی ضرور دیا کریں۔

۴۔ اگر طالب علم کوئی معقول بات کہے اس کو مان لیں اگرچہ اپنی تحقیق یا تقریر کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

۵۔ کم محنت اور بد محنت طلبہ سے محنت کرانے اور یاد کرانے کا بھی ایسا حسن طریقہ اختیار کریں کہ طالبعلم محنت کا عادی اور تحصیل علم وہنر کا شائق بن جائے۔

۶۔ ہر کتاب کے شروع میں اس فن کے مبادیٔ ثلاثہ (حد، موضوع، غایت) اور ترجمہ مصنف اور کتاب کی خصوصیات اور طرز تعلیم بھی طلبہ کے ذہن نشین کروایا کریں۔

تعلیمی حیثیت سے کتب درسیہ کے تین طبقے قرار دیئے گئے ہیں۔ اولی، وسطی، علیا۔

اولی: میزان الصرف سے کافیہ تک۔

وسطی: شرح جامی سے ہدایہ اولین تک۔

علیا: تفسیر جلالین سے دورہ حدیث شریف تک۔

ہر طبقہ سے متعلق طریقہ تعلیم درج ذیل ہے۔

طریقۂ تعلیم طبقہ اولی:

۱۔ اس طبقہ میں حتی الوسع ترجمہ لفظی اور مطلب خیز، تقریر مختصر اور ذہن نشین، اندازِ بیان سادہ اور سہل، تفہیم مضمون آسان الفاظ میں ہونی چاہیے، نفس مسئلہ طالبعلم کے ذہن نشین کرانے کے بعد اس کی زبان سے اعادہ بھی کرانا چاہیے، سبق سے فارغ ہونے کے بعد طلبہ کو اپنی نظروں کے سامنے بٹھلا کر اس سبق کو یاد کرایا جائے، دوسرے دن پچھلا سن کر اگلا سبق پڑھایا جائے، اور روزانہ حسب حال زبانی اور تحریری سوالات کرکے جوابات دینے کی بکثرت مشق کرائی جائے تاکہ ٹھوس

استعداد پیدا ہو سکے۔

۲۔ "میزان الصَّرف" کو خوب اچھی طرح سمجھا کر تھوڑا تھوڑا باترجمہ پڑھایا جائے، اور اس کے ساتھ "علم الصرف" حصہ اول، مصنفہ مولانا مشتاق احمد چرتھاولیؒ سبقاً سبقاً یاد کرایا جائے، اس طرح کہ "میزان الصرف" کی ترتیب کے موافق صیغوں اور گردانوں کے نام خوب یاد ہو جائیں، اسم ظرف، اسم تفضیل مذکر ومؤنث میں تصغیر کے صیغے بڑھادئے جائیں، اور بحث اسم آلہ میں اسم آلہ صغری، وسطی، کبری کے ۱۲ صیغے "ابواب الصرف" کی ترتیب کے موافق یاد کرائے جائیں، اور صحیح ابواب کے صیغے نکالنے اور بتلانے کی خوب مشق کرائی جائے، اس مشق کے لئے تختہ سیاہ (بلیک بورڈ) سے مدد لی جائے۔

۳۔ "منشعب" میں سے صرف ۲۴ باب ۶ ثلاثی مجرد، ۱۴ ثلاثی مزید، ۴ رباعی مجرد ومزید فیہ کی صرف صغیر جدید بامداد "تیسیر الأبواب جدید" مع نام وعلامتِ باب خوب یاد کرائی جائے، یا بجائے "منشعب" کے "تیسیر الأبواب" ہی کو خوب یاد کراکے مشق کرادی جائے، یہ بھی کافی ہے، بعد ازاں "میزان الصرف" کی ترتیب پر صرف کبیر مع ترجمہ یاد کرائی جائے اور "عربي صفوة المصادر" کی مدد سے صحیح ابواب کی صرف صغیر وکبیر گردانوں کی خوب مشق کرائی جائے، اسی لئے سہ ماہی اول میں صرف ایک کتاب "میزان ومنشعب" نصاب میں رکھی گئی ہے۔

۴۔ "علم الصرف" حصہ سوم میں ہفت اقسام کی صرف صغیرہ وکبیرہ باترجمہ "عربي صفوة المَصادر" کی مدد سے نیز تعلیلات کی خوب اچھی طرح مشق کرائی جائے، "صرف میر" اور "علم الصیغہ" میں بھی اس مشق کو جاری رکھا جائے۔

تنبیه: صرف کے تمام اسباق ایک ہی استاذ کے پاس ہونے چاہئیں، جو کہنہ مشق اور آزمودہ کار ہو، نوآموز مدرس کے یہ کام ہرگز نہ سپرد کرنا چاہئے۔

۵۔ "نحو میر" میں مسائل زبانی یاد کرانے کے ساتھ ساتھ ہر ہر جملہ کی ترکیب بھی کرائی جائے، نیز کتاب کی مثالوں پر اکتفاء ہرگز نہ کیا جائے، بلکہ قرآن وحدیث نیز دیگر کتب ادب سے

بکثرت مثالیں دی جائیں اور ترکیبیں کرائی جائیں کہ تکثیر امثلہ اس باب میں بے حد مفید ہے، انواع اعراب کو خصوصاً خوب ہی یاد کرایا جائے، اور "عوامل النحو منظوم فارسی" حفظ کرادی جائے۔

۶۔ "شرح مائۃ عامل" میں ایک دن صرف عبارت مع ترجمہ ومطلب پڑھائی جائے، دوسرے دن ترکیب کرائی جائے اس طرح کہ نوع اول تک اولاً چھوٹی ترکیب ہو، ثانیاً اسی کی بڑی ترکیب ہو، نوع اول سے نوع ثانی تک صرف بڑی ترکیب ہو، اور نوع ثانی سے آخر تک صرف چھوٹی ترکیب، ہاں اسی اثنا میں گاہے بگاہے بڑی ترکیب کا بھی امتحان لیتے رہیں۔

۷۔ "روضۃ الأدب" میں یا کسی بھی آسان ادبی کتاب میں ترجمتین اور صیغوں کی مشق کے ساتھ ساتھ ترکیب نحوی بھی کراتے رہیں اور عربی تحریر وبول چال کی بھی مشق کرائی جائے۔

۸۔ "هداية النحو" اور "مرقات" میں اصطلاحی الفاظ کی تعریفات اصل عربی میں یاد کرائی جائیں بر مسائل اردو زبان میں خوب حفظ کرائے جائیں اور شب وروز کی گفتگو میں مسائل منطق ان کے لئے اجنبی چیز نہ رہے۔

۹۔ "نورالإيضاح" اور "قدوری" میں مسائل جزئیہ آسان الفاظ میں طلبہ کے ذہن نشین کراکے سوال وجواب کے طرز پر ان سے اعادہ کرایا جائے اور سبقاً سبقاً سنا جائے۔

۱۰۔ "تهذيب" کو اس طرح وضاحت اور سادگی سے پڑھایا جائے کہ بغیر کسی پیچیدگی اور دشواری کے "شرح تہذیب" کے تمام مباحث آجائیں اور اس کے پڑھنے کی ضرورت نہ رہے۔

طریق تعلیم طبقہ وسطی:

۱۔ عبارت بقدر ضرورت ایک ایک مسئلہ کی پڑھوائی جائے، لفظی اور اعرابی غلطیوں پر متنبہ کیا جائے، لفظاً یا اعراب غلط پڑھنے کی وجہ سے مطلب اور معنی میں جو نقص یا اہمال پیدا ہوتا ہے اس کو خوب واضح کیا جائے، تاکہ طلبہ کو عبارت غلط پڑھنے کی قباحت وشناخت کا احساس ہو، حتی الامکان طالب علم سے خود لفظاً یا اعراب صحیح پڑھوایا جائے، جب طالب علم تصحیح سے عاجز ہوجائے تو استاذ غلطی اور اس کی وجہ سمجھائے اور عبارت صحیح کرائے، جو طالب علم عبارت پڑھ رہا ہے

دوسرے طلبہ سے کہا جائے کہ جہاں یہ لفظیا عبارت غلط پڑھے تم ٹوکو اور عبارت کی تصحیح کرو، روزانہ ایک ہی طالب علم سے عبارت نہ پڑھوائی جائے اور نہ باری مقرر کی جائے بلکہ خود استاذ جس طالب علم کو مناسب سمجھے عبارت پڑھنے کے لئے کہے، کمزور طلبہ سے زیادہ عبارت پڑھوائی جائے، اسی طرح جو طلبہ عبارت پڑھنے سے بچتے ہیں ان سے ضرور عبارت پڑھوائی جائے، یہ اور اس کے علاوہ جو بھی مناسب تدبیریں طلبہ کو مطالعہ دیکھنے اور عبارت صحیح پڑھنے کا عادی بنانے کی ہوسکتی ہیں اختیار کی جائیں، عبارت میں صرف ونحو سے متعلق جو لفظی اشکالات ہوں ان کو سمجھا کر ان کا حل پوری وضاحت کے ساتھ بتلایا جائے، دفع دخل مقدر کی تقریر کرکے کتاب کے جواب کو واضح الفاظ ہیں منطبق کیا جائے، اس طرح مسئلہ کی تقریر کرکے عبارت باترجمہ اور مسئلہ کا انطباق خود طالب علم سے کرایا جائے، اور ایسے طرز پر مطالعہ دیکھنے کی تاکید کی جائے کہ طلبہ خود مطالعہ میں ان امور کے حل کرنے کے عادی ہوجائیں، اگرچہ اس طریق پر پڑھانے سے سبق کی مقدار کچھ کم ہوگی مگر یہ چند روز کی بات ہے اس کے بعد خود طلبہ عادی ہوجائیں گے اور علمی استعداد پختہ ہوجائیگی اور تلافی مافات ہوسکے گی، آغاز سال میں کم ازکم یہ طریق ضرور اختیار کیا جائے، کبھی کبھی گزشتہ سبق کے متعلق بھی اچانک سوال کرلیا کریں، تاکہ طلبہ پڑھے ہوئے سبق کے اعادہ اور تکرار پر مجبور ہوں۔

اس طبقہ میں طلبہ کے مطالعہ کی طرح تکرار کا عادی بنانا بھی نہایت ضروری ہے اور اس کی تدبیر یہ ہے کہ استاذ طلبہ کو بتلائے کہ ہمارے بزرگوں نے سبق کے اعادہ کے لئے تکرار کا طریقہ اس لئے جاری کیا ہے کہ طالب علم میں علمی استعداد کے ساتھ ساتھ تفہیم وتدریس کی صلاحیت بھی آہستہ آہستہ نشوونما پاتی رہے، بالفاظ دیگر یہ تکرار درحقیقت مدرسی کی تربیت ہے، چنانچہ مشاہدہ ہے کہ جو طلبہ طالب علمی کے زمانے میں تکرار کرانے کے عادی ہوتے ہیں، وہ فارغ ہونے کے بعد نہایت آسانی سے نہ صرف مدرس بلکہ کامیاب مدرس بن کرنکلتے ہیں، تکرار کی اس افادیت کو سن کر انشاء اللہ تعالیٰ طلبہ میں تکرار کرنے کرانے کا شوق ضرور پیدا ہوگا، ہر استاذ اپنے سبق کے

طلبہ کو دو دو یا تین تین جماعتوں پر تقسیم کردے اور باری باری ہر طالب علم کو تکرار کرانے کی تاکید کرے تاکہ تکرار کا فائدہ تمام طلبہ کو یکساں طور پر پہنچے، نیز استاذ خود تکرار کے اوقات مقرر کرے، اور گاہ بگاہ ان اوقات میں خود جاکر نگرانی بھی کرے تاکہ طلبہ تکرار کی بجائے گپ بازی میں وقت ضائع نہ کریں۔

۲۔ "كنز الدقائق"، "أصول الشاشي" وغیرہ فنی کتابوں میں فن کی اصطلاحات اور الفاظِ اصطلاحیہ کی تعریفات تو اصل عربی الفاظ میں یاد کرائی جائیں، اور مسائل کو اس طرح ذہن نشین اور یاد کرایا جائے کہ اصل فن سے مناسبت پیدا ہوجائے۔

۳۔ "ترجمہ قرآن عظیم" میں علوم ومعارف قرآن کے بجائے "عربیت" پر زیادہ توجہ کی جائے، "صرفی ونحوی" امور کا لحاظ رکھتے ہوئے پہلے مفردات کے لغوی اور مرادی معنی اور محل اعراب کو بتلایا جائے، پھر "سادہ اور مطلب خیز لفظی ترجمہ" کرایا جائے، شانِ نزول اور بیان واقعات وقصص میں قدر ضروری پر اکتفاء کیا جائے، ربطِ آیات پر ضرور توجہ کرنی چاہئے اور "سادہ مطلب خیز ترجمہ" تو خوب ہی رٹایا جائے۔

۴۔ "ہدایہ اولین" کامل تحقیق وتدقیق وعرق ریزی کے ساتھ اس طرح پڑھایا جائے کہ اول ہر مسئلہ اور اس کی دلیل عقلی کا ماخذ جو "اصول کلیہ" میں سے ہو، طالب علم کے ذہن نشین کرایا جائے، پھر اس مسئلہ کو متفرع کیا جائے تاکہ طالب علم کے اندر اصل کلی معلوم کرتے اور اس پر مسئلہ کو متفرع کرنے کا ملکہ پیدا ہوجائے۔

۵۔ علوم وفنونِ عقلیہ میں ہر علم وفن کی اصطلاحات کو بعبارتہا یاد کرایا جائے اور اس کے مادی اصول موضوعہ سے آگاہ کرکے مسائل کو اس طرح ذہن نشین کرایا جائے کہ اس علم وفن سے مناسبت اور استخراجِ مسائل کا ملکہ پیدا ہوجائے۔

طریقہ تعلیم طبقہ علیا:

۱۔ اس طبقہ کی بیشتر کتابیں علوم وفنون کی آخری اور منتہی کتابیں ہیں، بسا اوقات طلبہ کو اس کے بعد کی کتابیں پڑھنے کا موقع بھی نہیں ملتا، اس لئے اساتذہ کو پوری محنت وکاوش کے ساتھ نہ صرف کتاب کا بلکہ اس کے مستند حواشی وشروح نیز اس علم وفن کی دیگر محققانہ معاون کتابوں کا بھی مطالعہ کرنا چاہئے، اور پڑھاتے وقت صرف کتاب کے حل پر اکتفاء نہ کرنا چاہئے بلکہ اپنے طویل وعریض مطالعہ میں سے فن کی ضروری اور اہم تحقیقات ومسائل پر بھی نہایت مختصر مگر جامع الفاظ میں روشنی ڈالنی چاہئے، تاکہ ایک طرف کتاب بھی پوری ہوجائے، اور دوسری طرف طالب علم کے کان فن کی اہم اور ضروری تحقیقات سے بھی آشنا ہوجائیں، اور مستند کتابوں کے نام بھی اسے معلوم ہوجائیں، تاکہ فارغ ہونے کے بعد جب وہ خود اس فن یا اس کے مسائل کو پڑھانے بیٹھیں یا کوئی مقالہ یا مضمون لکھنے کا قصد کریں تو ان مآخذ کی مراجعت کرسکیں، نیز عہد حاضر کے دینی مسائل پر بھی ضرور تبصرہ فرمائیں، تاکہ طلبہ کو فارغ ہونے کے بعد جب ان مسائل سے سابقہ پڑے تو وہ خالی الذہن اور بے خبر نہ ہوں، اور اساتذہ کے بتلائے ہوئے مآخذ کی مراجعت کرکے ان کی جواب دہی کرسکیں، مثلاً:

۲۔ "تفسیر جلالین" پڑھانے کے وقت کتاب کے حل کرنے کے لئے تو "حاشیہ جمل" یا کم از کم "صاوی" کا اور ربط آیات ودیگر علوم ومعارفِ قرآن کے لئے تفسیر "بیان القرآن" اور "سبق الغایات" کا اور اصولِ تفسیر سے آگاہ کرنے کے لئے "الفوز الکبیر" اور "تفسیر الاتقان" کا اور تفسیر قرآن کے سلسلہ میں احادیث ومسائل فقہیہ کی تحقیق کے لئے "تفسیر مظہری" کا حسب ضرورت مطالعہ کرتے رہا کریں۔

۳۔ علم اصولِ حدیث، حدیث کا اہم ترین موقوف علیہ ہے اور نصاب میں صرف "مقدمہ مشکوٰۃ" اور "شرح نخبہ" یا "خیر الاصول" کو رکھا گیا ہے، حضرات اساتذہ کو چاہئے کہ وہ ان کتابوں میں سے مصطلحاتِ حدیث کو خوب حفظ کرائیں، مگر خود "مقدمة ابن صلاح" یا "تدریب

الراوي"کا مطالعہ کریں، اور حسب ضرورت وموقع فن کے اہم مسائل پر ان کتابوں کی مدد سے سیر حاصل تبصرہ کریں۔

۴۔ "مشکوۃ شریف" پڑھاتے وقت سادہ اور مطلب خیز حدیث کا ترجمہ کرانے کے بعد ہر حدیث سے مستنبط فقہی مسئلہ میں ائمہ مجتہدین کے اقوال ومذاہب مع ادلہ تو نہایت اختصار کے ساتھ اور حنفی مذہب اور اس کے دلائل ذرا تفصیل وتحقیق کے ساتھ بیان کریں اور اگر حدیث بظاہر مذہب حنفی کے خلاف ہو تو اس کا آخری اور تحقیقی جواب بصورت ترجیح یا تطبیق یا توجیہ وتاویل ضرور بیان کریں، اس سلسلہ میں ابن رشد کے "بداية المُجتهد" سے مدد لیں اور "لمعات شرح مشکوۃ" یا "التعليق الصبيح" کا بالالتزام مطالعہ کریں۔

۵۔ دورہ حدیث شریف کی کتب عشرہ بالخصوص "بخاری شریف" پڑھانے کے وقت "فتح الباري"، "عيني" ورنہ حواشی حضرت مولانا احمد علی رحمہ اللہ کے "الأبواب والتراجم" کا بالالتزام مطالعہ کریں۔

اور "جامع ترمذی" پڑھانے کے وقت "معارف السنن" یا "الكوكب الدري" کا اور سنن ابی داود پڑھانے کے وقت "بذل المَجهود" کا۔

علی ہذا القیاس باقی کتب عشرہ پڑھانے کے وقت ان کے حواشی وشروح کا ضرور مطالعہ کریں، مگر ان طویل وعریض شروح میں سے اہم ترین مباحث نہایت اختصار کے ساتھ بیان کریں، تاکہ کتاب بھی ختم ہوسکے اور جس کتاب حدیث کو بھی شروع کرائیں اول بطور مقدمہ تاریخ تدوین حدیث، حجیت حدیث، اصحاب صحاح وسنن کے تراجم اور ان کے شرائط ومراتب اور خصوصیات کتب عشرہ پر اجمالا، اور زیر درس کتاب اور مصنف سے متعلق امور مذکورہ پر تفصیلا محققانہ تبصرہ کریں، اس کے بعد کتاب شروع کرائیں اور نہایت متانت ووقار اور احترام کے ساتھ ایک ایک باب وحدیث کے لفظی ومعنوی حل طلب امور اور اس سے مستنبط احکام ومسائل پر سیر حاصل تقریر کریں، اور اس مختلف فیہ مسائل میں ائمہ مجتہدین کے اقوال ومذاہب اور ان کے

مستدلات نہایت عزت واحترام کے ساتھ بیان کرکے مذہب حنفی اور اس کے دلائل پر انتہائی محققانہ مگر منصفانہ بحث کریں اور وجوہ ترجیح بیان کریں، مناظرانہ اور مجادلانہ طرز ہرگز نہ اختیار کریں، اور اختلاف کو حتی الامکان ختم یا کم کرنے کی کوشش کریں، نہ کہ حدیث کو مذہب کے مطابق کرنے کی، کہ اصل حدیث ہے، اور مذہب اس سے ماخوذ ومستنبط، حدیث میں تاویل اور صرف عن الظاہر کرنے کے بجائے رجال وسند پر محققانہ کلام کرنا زیادہ مفید اور بہتر ہے، اس لحاظ سے امام طحاوی رحمہ اللہ کی "شرح معانی الآثار" حنفیہ کے لئے نعمت غیر مترقبہ ہے، اختلافی مسائل پر کلام کرتے وقت اس کو اور "موطا امام محمد" کو پیش نظر رکھنا حنفیہ کے لئے ازبس ضروری ہے۔

قدیم "فرقہ زائغہ" اور زمانہ حال کے "فرق باطلہ" کی محققانہ تردید کریں، اور "اعلاء کلمۃ الحق" کا فرض ادا کریں، اسی کے ساتھ ساتھ طلبہ کو "تصحیح عقائد ونیات" اور "تزکیہ اخلاق واعمال" کی بھی ترغیب دلائیں تاکہ تعلیم کے ساتھ تربیت کا فرض بھی ادا ہو، اس باب میں استاذ کو ورع وتقوی اور خوف وخشیتِ الٰہی کا عملی نمونہ بننا ازبس ضروری ہے، اور محدث کے شایانِ شان بھی یہی ہے، وفقنا اللہ تعالی أجمعین۔

نیز اپنی بحث وتحقیق کو متعارف اختلافی مسائل ومباحث تک محدود نہ رکھیں بلکہ علوم ومعارفِ حدیث علی صاحبہا التحیۃ والتسلیم کو بھی تحقیق ووضاحت کے ساتھ بیان فرمائیں کہ طلبہ کے ذہنوں میں حدیث کی شایانِ شان اہمیت اور دین میں اُس کا حقیقی مرتبہ ومقام راسخ ہوجائے تاکہ وہ عہد حاضر کے "عظیم تر لادینی فتنہ انکارِ حدیث" کی جواب دہی اور بیخ کنی پر پورے طور پر قادر ہوجائیں۔

عام طور پر حدیث پڑھانے والے اساتذہ سال کا بیشتر حصہ صرف ارکان اربعہ کے مسائل اختلافیہ کی بحث وتحقیق پر صرف کردیتے ہیں اور آخر میں صرف کتاب کی تلاوت رہ جاتی ہے، اور اس کے باوجود بھی بیشتر کتابیں ختم نہیں ہوتیں، یہ طریقہ سخت مضر اور حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ

وسلم کا حق ادا کرنے کے باب میں تقصیر کے مترادف ہے، أعاذنا الله منه، اس لئے استاذ کو روزِ اول سے کتاب کے ختم کرنے کو پیش نظر رکھنا چاہئے، خود بہت کچھ دیکھنا اور مطالعہ کرنا چاہئے اور طلبہ کے سامنے کم سے کم مگر بے حد ضروری اور اہم باتیں علی وجہ البصیرۃ بیان کرنی چاہئیں۔

۶۔ حدیث کی طرح اس طبقہ کے بقیہ علوم وفنون کے اساتذہ کو بھی اسی طریق کار کے مطابق اپنا مطالعہ زیرِدرس کتاب تک محدود نہ رکھنا چاہئے، مثلاً "ہدایہ اولین، اخیرین" پڑھاتے وقت "فتح القدیر" اور "حاشیہ مولانا احمد حسن سنبھلیؒ" ورنہ کم از کم "عنایہ" کا۔

اور "شرح عقائد" پڑھاتے وقت "اشارات المرام للبیاضي"، ورنہ کم از کم "مسامرۃ" اور "المرام في عقائد الإسلام" مصنفہ مولانا عبد العزیز پرہارویؒ کا۔

اور "حماسہ" پڑھاتے وقت اس کی شرح "فیضی وتبریزی"، ورنہ کم از کم "حاشیہ مولانا اعزاز علی رحمہ اللہ" کا، اور "متنبی" پڑھاتے وقت "شرح برقوقی"، ورنہ "حاشیہ مولانا اعزاز علیؒ" ضرور زیر مطالعہ رہنا چاہئے۔

۷۔ سیرت وتاریخ وہ جدید علوم ہیں جو اسی سال وفاق نے نصابِ تعلیم میں اضافہ کئے ہیں، ان کے اساتذہ کو درسی کتابیں شروع کرانے سے پہلے ہر دو علموں کی وسیع معلومات کا ذخیرہ مہیا کرلینا چاہئے، تاکہ پڑھاتے وقت ہر دو علموں کے اہم ترین مباحث کی طلبہ کو نشان دہی کرسکیں اور یاد کراسکیں، ہر دو علموں پر عربی اور اردو دونوں زبانوں میں مستند محققین کی تصانیف موجود اور دستیاب ہیں، مثلاً "سیرت مغلطائی" کے ساتھ "سیرت ابن ہشام"، "نور الیقین"، "إتمام الوفاء" کا، اور "تاریخ ابو الفداء" کے ساتھ "محاضرات خضری" (عہد بنو امیہ، بنوعباس) کا مطالعہ کرنا چاہئے، اردو میں "أوجز السیر"، "تاریخ خلافت راشدہ" مصنفہ عبدالشکور لکھنویؒ اور خضری کی محاضرات کا اردو ترجمہ اور اس کے علاوہ جو بھی کتابیں تاریخ وسیرت کی میسر آئیں، ان کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے۔

تاریخ وسیرت کے استاذ کے لئے عہدِ رسالت، عہدِ خلافتِ راشدہ، عہدِ بنوامیہ، عہدِ بنوعباس، اور عہدِ حاضر کے اسلامی ممالک کے جغرافیے، خواہ عربی میں ہوں خواہ اردو میں، جس طرح ممکن ہو حاصل کرکے اس میں بصیرت حاصل کرلینی چاہئے، اس لئے کہ وفاق کے مجوزہ نصاب میں تاریخ کے ساتھ جغرافیہ بھی لازمی مضمون ہے، مدرسہ کو اس سلسلہ میں مدرس کی پوری امداد کرنی چاہئے کہ اس کے بغیر مدرس ان نئے علموں کو نہ کما حقہ پڑھا سکتا ہے اور نہ امتحان کی تیاری کراسکتا ہے۔

۸۔ علم کلام جدید اور علم اخلاق بھی جدید علوم ہیں، ان کے پڑھانے والے استاذ کے لئے متعلقہ کتاب شروع کرانے سے قبل علم اخلاق میں امام غزالیؒ کی "احیاء العلوم" کا، ورنہ کم از کم "کیمیائے سعادت" کا، اور علم کلام جدید میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کی "حجۃ الاسلام"، "انتصار الاسلام"، "قبلہ نما" کا، اور حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کی تصانیف کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔

اس طبقہ کے استاذ کو چار سے زیادہ اسباق ہرگز نہ دئے جائیں ورنہ وہ کتاب اور فن کا حق ہرگز ادا نہ کرسکے گا، اور طلبہ تشنہ کام اور ادھورے رہ جائیں گے اور مدرس کا اس میں کچھ قصور نہ ہوگا، خصوصاً علوم جدیدہ، کہ ان سے تو عموماً مدارس عربیہ کے اساتذہ خود ناآشنا ہیں، درحقیقت استاذ کو پہلے خود پڑھنا پڑے گا پھر پڑھاسکے گا، اور اس پر طرہ یہ ہے کہ ان کتابوں کے حواشی اور شروح بھی نہیں، مغزاً کتابیں ہوتی ہیں، مدرسہ کو اس کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہئے۔

وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین۔

(ماہنامہ وفاق المدارس ذوالقعدہ ۱۴۲۹ھ)

فریضہ تدریس کے مختلف اور مفید اسالیب

حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب دامت برکاتہم

مدیر

جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہمارے لئے بہترین نمونہ ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعلیم وتربیت میں مختلف اسالیب اور انداز استعمال فرماتے تھے، اور سامعین کی رعایت فرماتے، اور ان کی حالت کے مطابق اسلوب بھی تبدیل فرماتے، یہ ایک مستقل موضوع ہے جس پر مستقل ایک رسالہ لکھا جاسکتا ہے، لیکن یہاں اختصار کے ساتھ چند اسالیب کا ذکر کیا جاتا ہے:

ا۔ نصوص اور عبارات کا یاد کرنا:

بعض مضامین ایسے ہوتے ہیں جن کی نصوص اور عبارات کا یاد کرنا اور ان کے الفاظ کی حفاظت ضروری ہوتی ہے، جیسے قرآن کی آیات اور ماثور دعائیں، اس سلسلہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کا انداز یہ تھا کہ آپ منبر پر بیٹھ کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے قرآن کریم یا ماثور دعاؤں کا ایک ایک جملہ پڑھ کر سناتے اور صحابہ کرام اسے سُن کر دُہراتے اور اُسے یاد کرتے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعلّم النّاسَ التشهُّدَ علی المنبر کما یعلّم المَکتبُ الصبیانَ۔(فتح ملہم الحلبیہ: ۱۲۳/۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر بیٹھ کر لوگوں کو تشہد اس طرح سکھاتے تھے جیسے مکتب والے بچوں کو یاد کراتے ہیں۔

اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کانَ رسول اللہ صلی اللہُ

عليه وسلم يُعلِّمنا الاستخارةَ في الأمر كما كانَ يعلِّمنا السورةَ من القرآن۔(جامع سنن اللہ الاعظم للترمذی:١/٣٨٥)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں دعاءِ استخارہ اس طرح سکھاتے تھے جس طرح آپ ہمیں قرآن کی سورت سکھاتے تھے۔

اور عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ: أنَّ النَّبيَّ صلى الله عليه وسلم كانَ يعلِّمهم الدعاء كما يعلِّمهم السورةَ من القرآن، يقول: قولوا: اللّٰهُمَّ إنِّي أعوذبك من عذاب جهنَّم، وأعوذبك من عذاب القَبر، وأعوذبك من فتنة المَسيح الدجال، وأعوذبك من فتنة المَحيا والمَمات۔(مسند الامام احمد بن حنبل:٣/٢٧)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دعاء اس طرح سکھاتے تھے جس طرح ان کو قرآن کریم کی سورت سکھاتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے کہو: اے اللہ! میں جہنم کے عذاب سے آپ کی پناہ چاہتا ہوں، اور میں قبر کے عذاب سے آپ کی پناہ چاہتا ہوں، اور مسیح دجال کے فتنہ سے آپ کی پناہ چاہتا ہوں، اور زندگی اور موت کے فتنہ سے آپ کی پناہ چاہتا ہوں۔

تعلیمی میدان میں جن مضامین کی عبارت اور نصوص کا یاد کرنا ضروری ہوتا ہے اس کے لئے یہی اسلوب زیادہ مناسب اور مفید ہے، جیسے آج بھی اسکولوں میں پہاڑے اور گنتی یاد کرائی جاتی ہے۔

۲۔ تعلیم بذریعہ سوال وجواب:

تعلیم کا ایک اسلوب یہ بھی ہے کہ استاذ ایک طالب علم کو سب کے سامنے کھڑا کرے اور اس سے سوال کرے، اور وہ سب کے سامنے اس کا جواب دے، یا دو طالب علموں کو کھڑا کرے اور ایک ان میں سے سوال کرے اور دوسرا جواب دے۔

اس انداز تعلیم میں طلبہ کی توجہ زیادہ رہتی ہے، اور اس سے ان کے دلوں میں شوق پیدا ہوتا ہے، اور طلبہ اپنی آنکھ، کان اور فکر کے ساتھ ہمہ تن متوجہ ہوجاتے ہیں، اس طرح وہ علمی مضمون دل میں اچھی طرح بیٹھ جاتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ انداز عموماً دین کے مہمات کی تعلیم کے وقت اختیار فرماتے تھے جیسے عقائد اور غیبیات وغیرہ، جس کی مثال حضرت جبریل علیہ السلام کی وہ مشہور حدیث ہے جس میں ایمان، اسلام، احسان اور علامات قیامت کا ذکر کیا گیا ہے، روایت میں ہے کہ ایک نوجوان ایک طالب علم کی صورت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں حاضر ہوا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بیٹھے تھے وہ نوجوان باادب بیٹھ گیا اور اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دین کے بارے میں چند سوالات کئے اور آپ نے ان کے جوابات دیے، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یہ سارا منظر دیکھ اور سن رہے تھے اور علم سے مستفید ہورہے تھے، جس کا خلاصہ یہ ہے:

سوال: آپ مجھے بتائیں کہ اسلام کیا ہے؟

جواب: اسلام یہ ہے کہ تم اس بات کی گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، اور تو نماز قائم کرے، اور زکوۃ ادا کرے، اور رمضان کے روزے رکھے، اور بیت اللہ کا حج کرے، اگر تو وہاں جانے کی استطاعت رکھتا ہے۔

سوال: آپ مجھے ایمان کے بارے میں بتائیں؟

جواب: تم ایمان لاؤ اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر، قیامت کے دن پر، اور تم ایمان لاؤ اچھی اور بُری تقدیر پر۔

سوال: آپ مجھے احسان کے بارے میں بتائیں؟

جواب: تم اللہ کی عبادت اس طرح بجا لاؤ کہ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، اور اگر تم اُسے دیکھ نہیں سکتے تو یہ خیال کرلو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

سوال: قیامت کب آئیگی؟

جواب: جس سے تم پوچھ رہے ہو وہ سائل سے زیادہ اس بارے میں نہیں جانتا۔

سوال: آپ مجھے قیامت کے علامات بتائیں؟

جواب: باندھی اپنی مالکہ کو جنے، اور تم دیکھو ایسے لوگوں کو جو ننگے پاؤں والے، ننگے بدن والے، غریب

اور بکریاں چرانے والے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر لمبی لمبی عمارتیں بنانے لگیں۔
یہ آنے والا طالب علم آپ سے سوال وجواب کے بعد مجلس سے اُٹھ کر چلا گیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: جانتے ہو یہ کون ہے؟ انہوں نے عرض کیا: اللہ اور اُس کے رسول زیادہ جانتے ہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ جبریل ہیں، وہ اس لئے آئے تھے تاکہ تمہیں تمہارا دین سکھائیں۔(حدیث کی اصل عبارت کو صحیحین میں دیکھا جائے)۔
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان میں غور کریں: إنّه جبريل أتاكم يعلّمكم دينكم، کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے صحابہ کو دین سکھانے کے سوال وجواب کا انداز اختیار کیا۔

۳۔ تعلیم بذریعہ عمل:

اسلام کی زیادہ تر تعلیمات عمل سے تعلق رکھتی ہیں، اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان تعلیمات کو عملاً صحابہ کرام کے سامنے پیش فرماتے تھے، اور صحابہ کرام آپ کو عمل کرتے ہوئے دیکھ کر آپ کی اتباع کرتے تھے، چنانچہ جب نماز فرض ہوئی اور {أقيموا الصلاة} کا حکم نازل ہوا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً صحابہ کرام کے سامنے نماز ادا کی، اور فرمایا: صلّوا كما رأيتموني أصلّي، تم اسی طرح نماز ادا کرو جس طرح تم مجھے ادا کرتے ہوئے دیکھتے ہو۔
اسی طرح جب حج کی فرضیت نازل ہوئی: {ولله على الناس حج البيت من استطاع إليه سبيلا} تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کیا، اور اونٹنی پر بیٹھ کر مناسک حج ادا کئے تاکہ ہر شخص آپ کو دیکھ کر ویسا ہی عمل کرے جیسے آپ عمل فرما رہے ہیں، اور آپ نے اعلان فرمایا: خذوا عنّي مناسككم۔
احادیث میں اس طرح کی بہت سی مثالیں ہیں، اور عملی احکام کو سکھانے کے لئے یہی کامیاب طریقہ ہے، اور جدید علمی اداروں میں عملی مضامین میں یہی اسلوب اختیار کیا جاتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ

فقہاء کرام اور علماء اُصول کے ہاں تواترِ عملی ایک اہم شرعی دلیل شمار کی جاتی ہے۔

۴۔ تعلیم بذریعہ قول و عمل:

اس کی صورت یہ ہے کہ متعلقہ مضمون کی عبارت اور نصوص کے معانی اور مطالب کو پہلے اس طرح بیان کردیا جائے کہ سب طلبہ اس کو اچھی طرح سمجھ جائیں، اگر اُس کا تعلق عمل سے بھی ہو تو پھر استاذ ان کے سامنے اسے عملاً پیش کرے، اس اندازِ تعلیم سے طلبہ کے لئے علم اور عمل دونوں کا سیکھنا آسان ہوجاتا ہے، حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دس آیات سیکھ لیتے تو اس وقت تک بعد والی دس آیات نہ سیکھتے جب تک ان دس پر عمل کرنا نہ سیکھ لیتے۔ (المستدرک للحاکم:۱/۵۵۷)

۵۔ تعلیم میں نقشہ اور تختہ سیاہ کا استعمال:

بعض مضامین ایسے ہوتے ہیں جن کو سمجھانے کے لئے تختہ سیاہ اور نقشہ کی ضرورت پڑتی ہے، جس کے ذریعہ بعض حقائق کا طلبہ کو سکھانا آسان ہوجاتا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض معنوی حقائق کو سمجھانے کے لئے یہ انداز بھی اختیار فرمایا ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک روز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مربع خط کھینچا، پھر اس مربع خط کے درمیان میں ایک خط کھینچا، پھر اس درمیانے خط کے دونوں جانب چھوٹے چھوٹے خط کھینچے، اور ایک مربع خط کے باہر کھینچا، پھر صحابہ کرام سے فرمایا: جانتے ہو یہ کیا ہے؟ سب نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کے رسول زیادہ جانتے ہیں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا: یہ درمیانہ خط انسان کی مثال ہے، اور اس کے دائیں بائیں چھوٹے خطوط وہ عوارض ہیں جو اُسے زندگی میں پیش آتے ہیں اگر ایک سے چھوٹ گیا تو دوسرا پکڑ لیتا ہے، اور جو مربع خط ہے یہ اس کی اجل ہے، اور اس کے ساتھ جو خط باہر جارہا ہے وہ اس کی امیدیں اور آرزوئیں ہیں۔
(مسند للامام احمد:۵/۲۳۷)

۶۔ تعلیم بذریعہ ضرب المثل:

کسی معنوی اور غیر محسوس حقیقت کو سمجھانے کے لئے اچھا طریقہ یہ ہے کہ استاذ طلبہ کے سامنے اسکی ایک حسی مثال پیش کرے اور پھر اس معنوی حقیقت کو اس پر قیاس کر کے طلبہ کے اذہان کے قریب کردے، کتب حدیث میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں، یہاں اُن میں سے ایک مثال پیش کی جاتی ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اچھے اور بُرے ہمنشین اور ساتھی کے اثرات کو بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

اچھے ہمنشین اور بُرے ہمنشین کی مثال ایسی ہے جیسے مشک بیچنے والا اور بھٹیارہ، پس مشک بیچنے والا یا تو کہیں مشک پیش کرے گا یا تم خود اس سے مشک خریدوگے، یا (کم از کم) اس کے پاس سے خوشبو سونگھوگے، اور بھٹیارہ یا تو تمہارے کپڑے جلادے گا، یا (کم از کم) اس سے بدبو تم سونگھوگے۔

۷۔ سوال کے ذریعہ اذہان کو مشغول کرنا:

تعلیم کا ایک انداز یہ بھی ہے کہ استاذ پڑھاتے وقت طلبہ کے سامنے ایک یا ایک سے زائد سوال پیش کرکے سب کے اذہان کو مشغول کردے، تاکہ وہ جواب سوچیں، پھر ان سے جواب سنے، اور ان کی تصویب کرے، اگر جواب صحیح ہے، ورنہ صحیح جواب کی طرف ان کی راہنمائی کرے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کی تعلیم میں یہ اسلوب بھی اختیار فرماتے تھے، خصوصا جب کسی کا امتحان لینا مقصود ہو، نیز اس انداز سے طلبہ میں سوچنے اور حقائق میں غور وفکر کرنے کی عادت پڑتی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو جب یمن کا گورنر اور قاضی بناکر بھیجنا چاہا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے سوال کیا کہ لوگوں کے مقدمات کا فیصلہ کیسے کروگے؟ اس پر حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے تفصیلی جواب دیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا جواب سُن کر ان کی تصویب فرمائی اور اس پر اللہ کا شکر ادا کیا۔

تعلیم وتدریس کے ان اسالیب کے علاوہ اور بھی مختلف انداز ہیں جن کا تعلق تعلیم کے اعلی مراحل سے ہے، اس لئے اُن کو یہاں ذکر نہیں کیا گیا، لہذا عربی کے اساتذہ کرام کو چاہیے کہ مذکورہ بالا

اسالیب میں سے جو اسلوب بھی مناسب سمجھیں اسے موقع و محل اور مخاطب کے اعتبار سے استعمال کریں۔

درس کی تیاری:

عربی پڑھانے والے اساتذہ کرام اگر چاہتے ہیں کہ وہ کامیاب مدرس ہوں اور طلبہ ان سے خوب فائدہ اُٹھائیں تو انہیں چاہیے کہ ہر سبق پڑھانے سے پہلے اسے خوب دیکھیں اور اچھی طرح اس کا مطالعہ کریں، اگر کسی عبارت یا لفظ میں طباعت کی غلطی دیکھیں تو اُسے درست کریں، اور پڑھاتے وقت طلبہ سے بھی وہ غلطی درست کرالیں، نیز ذہن میں اس کا ایک نقشہ بنالیں کہ کس طرح آپ اسے طلبہ کو پڑھائیں گے۔

تنبیہ: یاد رہے کہ علمی کتابوں میں بعض دفعہ آیت کریمہ کے لکھنے میں یا حدیث شریف یا کسی عبارت میں طباعت کی غلطیاں ہوجاتی ہیں، کبھی کاتب کی غلطی سے جو عموماً غیر علماء ہوتے ہیں یا حروف جوڑتے وقت یا ٹائپ کرتے وقت، لہذا اس غلطی کو درست کرلینا چاہیے، نہ یہ کہ اس غلطی کو مصنف کی طرف منسوب کرکے اسے تحریف کا مرتکب قرار دیا جائے، خصوصاً جب کہ وہ عالم اور مسلمہ شخصیت ہو، ایسا کرنا ایک مومن کی دیانت کے خلاف ہے۔

(عربی زبان غیر عرب کو آپ کیسے پڑھائیں؟)

آپ تدریس کیسے کریں۔۔۔؟

مولانا ابن الحسن عباسی صاحب استاذ جامعہ فاروقیہ کراچی

نظام تعلیم میں تدریس اور طریقۂ تعلیم کی جو اہمیت وافادیت ہے،وہ محتاج وضاحت نہیں،دینی مدارس میں تدریس کا اسلوب اور طریقۂ کار کیا ہے؟ذیل میں اوّلاً اس کا ذکر کیا جاتا ہے،اس کے بعد تدریس کے لئے بنیادی اصول ومبادی کی وضاحت کی جائے گی۔

تدریس کے مروجہ طریقے:

تدریس اور کتب پڑھانے کے مختلف طریقے رائج ہیں اور ہر استاذ اپنے ذوق اور مزاج کے مطابق ان میں سے کسی کو اختیار کرتا ہے،چند اسلوب یہ ہیں:

(۱) استاذ شاگرد کو کتاب کاایک خاص حصہ مطالعہ کرنے اور سمجھنے کے لئے دیتا ہے، طالب علم اس حصے اور بحث کا مطالعہ اور اسے حل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اگلے دن استاذ کو وہ سبق سناتا ہے،استاذ کا کام صرف اس کے سبق کی تصحیح یا تصدیق کرنا ہوتا ہے یعنی اگر اس سے حلِّ سبق میں کوئی غلطی ہوئی ہے تو اس کی اصلاح کر دیتا ہے اور اگر وہ صحیح سمجھا ہے تو اس کی صحت کی تصدیق کر لیتا ہے۔

تعلیم کا یہ طریقہ بڑا مفید ہے،اس میں چوں کہ زیادہ کام طالب علم کے ذمہ ہوتا ہے اس لئے بہت جلد کتاب سمجھنے کی صلاحیت اور فن سے مناسبت اس میں پیدا ہو جاتی ہے، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا رحمہ اللہ نے اکثر کتابیں اسی انداز سے پڑھی ہیں،اس میں یہ بھی ضروری نہیں کہ ساری ختم کی جائے بلکہ جب دیکھا جائے کہ طالب علم میں کتاب حل کرنے کی پوری استعداد پیدا ہو گی ہے تو فن کی دوسری کتاب اسے شروع کرا دی جائے،البتہ تعلیم کا یہ طریقہ بالکل ابتدائی طلبہ کے لئے مفید نہیں،درمیانی درجے کی کتابوں میں یہ طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے،ان

مدارس میں جہاں طلبہ کی تعداد زیادہ ہو، ظاہر ہے کہ وہاں یہ طریقہ نہیں چل سکتا، یہ صرف وہاں جاری ہو سکتا ہے جہاں طلبہ کی تعداد بہت کم ہو آج دیہات وغیرہ کے جن مدارس میں فی درجہ تین چار طلبہ ہوتے ہیں، وہاں یہ طریقۂ تعلیم اختیار کیا جا سکتا ہے۔

(۲) تدریس کا ایک عمومی طریقہ یہ ہے کہ استاذ کے سامنے طالب علم کتاب میں متعلقہ سبق کی پوری عبارت پڑھتا ہے، استاذ اوّلاً اُس عبارت میں بیان کردہ مضمون کی تشریح اور اس پر زبانی تقریر کرتا ہے، اس تشریح میں بسا اوقات وہ سبق کا تجزیہ بھی کرتا ہے مثلاً وہ کہتا ہے، آج کے سبق میں چار بحثیں ہیں: پہلی بحث، دوسری بحث، تیسری بحث، چوتھی بحث ـــــــــ پھر متعلقہ عبارت کا ترجمہ کرتے ہوئے اپنی تشریح اور تقریر کو اس پر منطبق کرلیتا ہے، یہ ایک کامیاب طریقۂ تدریس ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ استاذ کی تشریحی تقریر اور زبانی تجزیہ یا بیان کردہ خلاصہ متعلقہ عبارت کے مطابق ہو اور ترجمہ کرتے ہوئے استاذ اپنی تشریحی تقریر کا عبارت کے ساتھ انطباق اس انداز سے کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہو کہ طالب علم کے سامنے عبارت اور نفس مسئلہ دونوں اچھی طرح واضح ہو کر آجائیں، اگر استاذ کی ہوائی تقریر کا کتاب کی عبارت کے ساتھ جوڑ نہ ہو تو ایسی صورت میں طلبہ کا ذہن الجھ جاتا ہے اور تدریس کے حوالے سے ایسے استاذ کا کوئی اچھا اثر اور فائدہ مرتب نہیں ہوتا۔

(۳) ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ طالب علم سارے سبق کی عبارت نہیں پڑھتا، بلکہ ایک بحث یا ایک مسئلہ کی عبارت پڑھتا ہے، استاذ اس کی تشریح کرنے کے بعد عبارت کا ترجمہ کرتا ہے، پھر وہ اگلی بحث سے متعلق عبارت پڑھتا ہے، استاذ اس کی تشریح اور ترجمہ کرتا ہے، اس طرح سبق پورا ہونے کے بعد استاذ ساری عبارت کا عربی پڑھے بغیر صرف ترجمہ دہرا دیتا ہے، اس طریقہ میں طالب علم کی عبارت ہی سے سبق کا تجزیہ ہو جاتا ہے، یہ طریقہ بھی تقریباً پہلے طریقہ سے ملتا جلتا ہے، سوائے اس کے کہ اس میں طالب علم ساری عبارت ایک ساتھ اور استاذ سارے سبق کی تشریح اور خلاصہ ابتداء میں ایک ساتھ بیان نہیں کرتا، بلکہ عبارت اور تشریح حصہ وار

چلتی ہے، یہ بھی ایک عمدہ طریقۂ تدریس ہے اور خاص کر فقہ اور اصول فقہ کی کتابوں کی تعلیم میں بہت مفید ہے۔

(۴) ایک اسلوب یہ بھی ہے کہ طالب علم کے عبارت پڑھنے کے بعد استاذ زبانی تشریح یا خلاصہ بیان نہیں کرتا، بلکہ وہ عبارت کا ترجمہ اور تشریح ساتھ ساتھ کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے اور پورا درس اسی انداز میں انتہاء تک پہنچایا جاتا ہے، ادب کی کتابوں کی تدریس میں عموماً یہی طریقہ رائج ہے لیکن ادب کے علاوہ دوسرے فنون کی کتابوں میں یہ طریقۂ تدریس کوئی زیادہ مقبول نہیں۔

• درس کی کیفیت کے اعتبار سے بعض اساتذہ کا مزاج اور طریقہ ابتدائے سال میں لمبی تقریر اور خوب سے خوب تر تشریح اور تفصیل کرنے کا ہوتا ہے، اِدھر جوں جوں سال گزرنے لگتا ہے، اُدھر ان کی تقریر میں بھی اختصار آنے لگتا ہے، ابتداء میں اطناب اور آخر میں ایجاز کے اس طریقۂ تدریس کے پس منظر میں یہ تعلیمی فلسفہ کار فرما ہے کہ شروع میں کتاب اور فن سے مناسبت پیدا ہونے اور مصنف کا اسلوب اور مزاج سمجھنے میں کچھ وقت لگتا ہے، استاذ کے تفصیلی دروس سے رفتہ رفتہ طالب علم میں فن اور کتاب سے مناسبت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے، اس لئے آخر میں وقت کی تنگی کی وجہ سے اختصار اختیار کرنا کوئی ایسا مضر نہیں، لیکن اس کے بر عکس بعض اساتذہ کا طریقۂ تدریس آخر تک یکساں رہتا ہے، اُن کے ہاں نہ ابتداء میں لمبی چوڑی تفصیلات ہوتی ہیں اور نہ ہی آخر میں اغلاق وایجاز ہوتا ہے، بلکہ کتاب میں موجود ضروری اور اہم مباحث کی بقدر ضرورت تشریح وتفصیل سال کی ابتداء اور آخر میں یکساں جاری رہتی ہے اور یہی طریقہ زیادہ مفید اور مقبول سمجھا جاتا ہے۔

دورۂ حدیث کی کتابوں کی تدریس میں عموماً ذکر کردہ پہلا طریقہ رائج ہے کہ ابتداء میں تفصیلی مباحث اور طویل تقریریں ہوتی ہیں اور آخر میں یہ تشریح یا تو بالکل ختم ہو جاتی ہے، صرف عبارت کا "سَرد" ہوتا ہے اور یا بہت مختصر ہو جاتی ہے، صحاح ستہ میں مکرر احادیث کی وجہ سے آخر سال میں تشریح کو مختصر کر دینا یا صرف احادیث کی تلاوت پر اکتفا کر دینا کوئی نقصان دہ

نہیں،البتہ دورۂ حدیث کے اسباق میں اگر فنی مباحث کو اساتذۂ حدیث کے درمیان تقسیم کر دیا جائے تو زیادہ مفید رہے گا،چنانچہ بعض مدارس میں تقسیم مباحث کے فارمولے پر عمل کیا جاتا ہے،مثلاً کتاب الأیمان اور کتاب البیوع کی تفصیلی فقہی اور حدیثی بحثوں کو "صحیح مسلم شریف" کے حصہ تدریس میں رکھدیا جائے اور صرف "مسلم شریف" پڑھانے والا استاذ ان پر تفصیلی کلام کرے، کتاب الطھارۃ، صلاۃ، زکاۃ کو "ترمذی شریف" کے درس کے لئے مختص کیا جائے اور "ترمذی" کا استاذ ہی ان پر تفصیلی بحث کرے،اس طرح تمام اہم مباحث کی اس تقسیم کا یہ فائدہ ہوگا کہ طلبہ اس تکرار اور یکساں مباحث کے اعادے سے بچ سکیں گے جو دورۂ حدیث کے اسباق میں عموماً ہوتا ہے۔

صحاح ستہ کی ابتداء میں چونکہ اکثر کتاب الایمان، طھارۃ، صلاۃ، زکاۃ وغیرہ ہیں،اس لئے ہر استاذ ان پر تفصیلی محدثانہ کلام کرتا ہے جس کی وجہ سے ابتداء میں تو یکساں مباحث کا تکرار ہو جاتا ہے اور ان کتب کے آخری حصوں میں ابواب پر سال آخر ہونے کیوجہ سے صرف سرد عبارت پر قناعت کرنی پڑتی ہے، اساتذۂ حدیث کے درمیان تقسیم مباحث سے اس تکرار کا ازالہ کرکے احادیث پر تشریحی کلام میں یکسانیت قائم کی جاسکتی ہے۔

تدریس کے چار بنیادی اصول :

یہ تو ان طریقوں اور اسالیب کا ذکر تھا جو درس نظامی کی کتابوں کی تدریس میں عام طور سے رائج ہیں،اب ذیل میں ان چار بنیادی اصول کا ذکر کیا جاتا ہے جن کے بغیر اچھی تدریس اور عمدہ طریقۂ تعلیم کا تصور نہیں کیا جا سکتا،ذکر کردہ طریقہ ہائے تدریس میں جو بھی طریقہ اختیار کیا جائے جب تک ان چار بنیادی اصول کے ستون فراہم نہیں ہوں گے، عمدہ تدریس کی عمارت کھڑی نہیں ہو سکے گی، وہ چار اصول یہ ہیں:

(۱) مضمون درس اور نفس سبق پر قدرت!

جو سبق آپ نے پڑھانا ہے، ضروری ہے کے پہلے آپ خود اچھی طرح سمجھے ہوں، اس کے لئے ضروری معلومات آپ کے پاس ہوں، اس کے متعلق جو شبہات اور سوالات ایک طالب علم کے ذہن میں آسکتے ہیں، ان کی اور ان کے حل اور جوابات کی تفصیل آپ کے ذہن میں ہو، اور ظاہر ہے یہ چیز اسی وقت حاصل ہوسکتی ہے جب آدمی نے متعلقہ سبق کے لئے بھر پور مطالعہ اور تیاری کی ہو، مطالعہ کو مختلف تدریجی مراحل میں تقسیم کیا جا سکتا ہے اور ہر آدمی اپنے ذوق اور وقت کے اعتبار سے ان میں طوالت اور اختصار سے کام لے سکتا ہے، لیکن اس قدر تیاری ہر استاذ کے لئے لازمی ہے کہ اوّلا عبارت کا حل ہو، درس نظامی کی کتابیں اکثر مغلق اور پیچیدہ ہیں، ان کی عبارتوں کو حل کرنے اور سمجھنے میں کافی محنت کی ضرورت ہوتی ہے، نفس سبق کے حل میں عبارت کا درست تلفّظ، اعرابی حالت کی درستگی، مشکل الفاظ کے معانی، عبارت کا مفہوم اور مقصد کو سمجھنا داخل ہے، بسا اوقات کوئی لفظ محذوف ہوتا ہے، یا عبارت کسی شبہے کا جواب ہوتی ہے، کسی خاص بات سے احتراز کے لئے کوئی قید بڑھادی جاتی ہے، حل عبارت میں ان تمام متعلقہ چیزوں سے واقف ہونا ضروری ہے، عموماً "بین السطور" اور حواشی نے حل عبارت سے متعلق ان تمام یا اکثر باتوں کی وضاحت کی ہوتی ہے، ثانیا حل عبارت کے ساتھ مضمون سے واقفیت اور اس فن میں ضروری مطالعہ ہونا چاہئے۔

(۲) تعبیر!

اچھی تدریس کی دوسری بنیاد "تعبیر اور اظہار ما فی الضمیر" پر قدرت ہے، یعنی جس سبق کا آپ نے مطالعہ کیا ہے، تیاری کی ہے، آپ خوبصورت اسلوب اور دل نشین انداز میں وہ طلبہ کے سامنے بیان کر سکیں، صحیح، واضح اور دلنشین تعبیر اور انداز بیان کے بغیر عمدہ تدریس کا تصور نہیں کیا جا سکتا، ایک مدرّس اور استاذ وسیع مطالعہ رکھتا ہے، سبق کے مضمون اور متعلقہ بحثوں پر عبور اور گہری نظر رکھتا ہے، لیکن اپنے ما فی الضمیر کے اظہار اور طلبہ کے سامنے اپنے مطالعہ کے نچوڑ پیش کرنے کے لئے اس کے پاس لفظوں کی مناسب زبان نہیں، ایسے استاذ کے سبق اور علم سے طلبہ زیادہ استفادہ نہیں کر سکتے اور وہ ایک اچھا

مدرّس نہیں کہلا سکتا۔

وہ فضلاء جو نئے نئے میدان تدریس میں آتے ہیں ما شاء اللہ ان کے جذبات تازہ، خون گرم اور شوق جوان ہوتا ہے، زیر تدریس کتاب کے لئے اکثر وہ خوب مطالعہ کرتے ہیں، لیکن عموماً تعبیر اور اسلوب کی طرف توجہ نہیں دیتے، ایسے حضرات کی خدمت میں گزارش ہے کہ اگر وہ تعبیر میں کمزور ہیں تو بجائے اس کے کہ ایک کتاب کے لئے پانچ چھ شروح کا مطالعہ کرنے اور غیر متعلقہ مباحث کو ذہن میں محفوظ کی مشقت کو برداشت کریں، وہ تدریس کے لئے اپنی تعبیر کی درستی اور اظہار مافی الضمیر کی عمدہ صلاحیت حاصل کرنیکی طرف توجہ مبذول فرمائیں، "اظہار ما فی الضمیر کی صلاحیت" سے مراد وہ خطیبانہ صلاحیت نہیں ہے جو وعظ وارشاد، جلسوں اور جمعہ کے خطبوں میں کام آتی ہے، وہ ایک مختلف چیز ہے اور اس کے اصول اور تقاضے بھی الگ ہیں، بلکہ اس سے مراد وہ مدرّسانہ صلاحیت ہے جس کا اظہار مسند درس پر بیٹھ کر ہوتا ہے یعنی جس سبق کی آپ نے رات کو تیاری کی ہے، اس کو عام فہم اسلوب، آسان الفاظ اور دلنشین انداز میں طلبہ کے سامنے آپ میں بیان کرنے کی ایسی صلاحیت ہو کہ درس میں وہ سبق بھی طلبہ کی سمجھ میں آجائے اور اسلوب کی شیرینی اور کلام کی مٹھاس سے بھی سامعین محظوظ ہوں، تعبیر کی حلاوت وشیرینی مشکل اور طویل سبق میں بھی انہیں اکتانے اور بور ہونے نہ دے۔

اس طرح کی عمدہ تعبیر پانا کوئی ایسا آسان نہیں کہ وہ مشق وریاض کے بغیر حاصل ہو جائے گی بلکہ اگر کہا جائے کہ سبق سمجھنے اور اس کے لئے متعلقہ امور کی تیاری سے یہ کام زیادہ مشکل ہے تو مبالغہ نہیں ہوگا، چنانچہ اس کے لئے صحیح طرح کی ریاض اور محنت کی ضرورت ہے، اس مشق اور محنت کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جو سبق آپ نے اگلے دن پڑھانا ہے، آپ پہلے تنہائی میں اسے اس تصوّر کے ساتھ دہرائیں کہ آپ درسگاہ میں طلبہ کے سامنے بیٹھ کر پڑھا رہے ہیں، تنہائی کہ اس تجرباتی عمل میں آپ ایک مفہوم کی مختلف تعبیرات میں ترجمانی کی مشق کریں، اس مشق میں آپکے سامنے ایک مفہوم کے لئے مختلف تعبیرات آئیں گی، آپ کا ذہن متنوّع اسالیب اور اظہار کی متعدد شکلیں بنائے گا جس سے رفتہ رفتہ سبق پڑھانے کی عمدہ تعبیر کی صلاحیت اور مشکل سے مشکل مسئلہ چٹکیوں میں سمجھانے کا ملکہ آپ میں انشاء

اللہ پیدا ہو جائے گا اور کچھ عرصہ کے بعد پھر تنہائی کی اس تجرباتی تدریس کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔

اس اصول کی طرف اہتمام کے ساتھ توجہ اس لئے مبذول کرائی گئی ہے کہ بعض نو واردان بساط تدریس، علمی دھاک بٹھانے یا آتش شوق بجھانے کے لئے رات رات بھر مطالعہ کرتے ہیں، نوادرات حفظ کرتے ہیں، نکات یاد کرتے ہیں، لیکن اگلے دن درس میں اس مطالعہ، ان نکات اور ان نوادرات کو طلبہ کے سامنے بیان کرنے کے لئے ان کے پاس مناسب ترجمان نہیں ہوتا، ٹوٹی پھوٹی تعبیر میں اگر رات بھر کی محنت کو لفظوں کی زبان مل بھی گئی تو طلبہ پر اس کا اثر اس مہمان کے تاثر سے زیادہ مختلف نہیں ہوتا جس کی خدمت میں "عسل مصفی" ٹوٹے جام یا میلے پیالے میں پیش کیا گیا ہو۔

(۳) نظم وترتیب!

عمدہ تدریس کے لئے تیسرا بنیادی اصول "نظم وترتیب" ہے، یعنی آپ نے درس کے لئے جو مطالعہ کیا ہے اور سبق کے متعلق جو کچھ آپ طلبہ کہ سامنے کہنا چاہتے ہیں، ضروری ہے کہ اس میں آپ نے ذہنی خاکہ بنا کر ایک ترتیب اور نظم قائم کرلی ہو کہ کونسی بات کہاں کہنی ہے اور کون سی بحث کس بحث سے پہلے یا بعد میں کرنی ہے، اگر آپکو نفس درس اور اس کے اظہار دونوں پر تو عبور ہے لیکن اس میں بے ترتیبی کا نقص موجود ہے تو آپ کا سبق طلبہ کو ذہن نشین نہیں ہو سکے گا، پہلے سے ذہن میں نظم وترتیب قائم نہ کرنے کی وجہ سے اکثر ایک نقصان یہ ہوتا ہے کہ درس میں مطالعہ کی ہوئی مختلف باتوں کا ذہن پر یکدم ہجوم ہونے سے آدمی تشویش کا شکار ہو جاتا ہے، جو بات آخر میں کہنے کی ہوتی ہے، وہ اوّل میں کہہ دی جاتی ہے اور جو اوّل میں کہنے کی تھی، وہ سرے سے یاد ہی نہیں رہتی، یا وہاں کہنا پڑتی ہے جہاں اس کا موقع نہیں ہوتا، بد نظمی اور بے ترتیبی کا شاخسانہ اسی طرح ہوتا ہے، اس لئے عمدہ تدریس کے لئے ذہن میں عمدہ نظم اور ترتیب بہر حال ضروری ہے۔

(۴) طلبہ کے معیار ومستوی کی رعایت!

تدریس میں طلبہ کے معیار ومستوی کا خیال رکھنا بھی ایک ضروری امر ہے، ابتدائی طلبہ کے لئے آسان اسلوب، عام فہم الفاظ اور علمی اصطلاحات کی بجائے عمومی زبان اختیار کرنی چاہئے، ایک بات کو بار بار دہرانا

بھی ان کے لئے مفید ہوتا ہے، جب کہ اگلے درجوں میں علمی زبان اور فنّی اصطلاحات کو بے تکلف استعمال کیا جا سکتا ہے۔

اگر کوئی مدرّس "نحو میر" کے طلبہ کے سامنے "شرح جامی" کی تحقیقات بیان کرنا شروع کر دے یا "شرح جامی" کے طلبہ کی خدمت میں اسم کی تعریف بار بار دُہرانے اور سمجھانے پر زور صرف کرنے لگ جائے، ظاہر ہے کہ اس کی یہ محنت نہ صرف یہ کہ بے فائدہ ہے بلکہ مضر ہے، اس کے لئے بھی اور طلبہ کے لئے بھی، اسی طرح درجۂ سابعہ اور دورۂ حدیث کے منتہی طلبہ کے سامنے اگر آپ "قال" اور "حدّثنا" کا ترجمہ بار بار دہرائیں گے، یقیناً یہ آپ ایک ایسے عمل کا ارتکاب کریں گے جس کا نہ کوئی فائدہ مرتب ہوگا نہ کوئی خوشگوار اثر۔

یہاں ایک لطیفہ یاد آگیا جو علامہ دینوری رحمہ اللہ نے اپنی مشہور کتاب "عُیون الأخبار" میں لکھا ہے کہ:

"مشہور عالم "ابن سماک" تقریر کر رہے تھے، ان کی باندی گھر بیٹھے سن رہی تھی، وہ تقریر سے فارغ ہو کر گھر آئے اور باندی سے پوچھا "میری تقریر کیسی رہی؟" اس نے جواب دیا "تقریر تو بہت اچھی تھی مگر ایک بات کو بار بار دہرانا پسند نہیں آیا" ابن سماک نے کہا "میں بار بار اس لئے دہراتا تھا تاکہ جو نہیں سمجھا وہ سمجھ جائے" باندی نے کہا "جب تک نہ سمجھنے والوں کو آپ سمجھاتے رہے، اس وقت تک سمجھنے والے اکتاتے رہے"۔

بہر حال طلبہ کی علمی صلاحیت، اور ان کے درجہ کے معیار اور مستوی کو درس میں پیش نظر رکھنا عمدہ تدریس کا ایک بنیادی اصول ہے اور اس اصول کی رعایت ایک مدرّس کو ضرور رکھنی چاہئے۔

آخر میں "وفاق المدارس العربیہ پاکستان" کے ریکارڈ میں محفوظ اکابر علماء کے مرتب کردہ ضوابط میں سے وہ ضابطہ نقل کیا جاتا ہے جو "طریقۂ تدریس و تعلیم" سے متعلق ہے، اس میں ہے:

"عام طور پر مدرّسین ابتداء سال میں لمبی لمبی تقریریں کیا کرتے ہیں اور نفس کتاب کی عبارت حل کرنے اور اصل مسائل فن طلبہ کو ذہن نشین کرانے کے بجائے نہ صرف حواشی و شروح کے مفید مضامین، بلکہ لایعنی قیل و قال کی الجھنوں میں طلبہ کے ذہنوں کو ماؤف کر دیتے ہیں، اگر کوئی طالب علم

کچھ بولتا ہے تو الزامی جوابات دے کر اسے خاموش کر دیتے ہیں اور اسی کو اپنا کمال سمجھتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ابتدائی مہینوں میں کتاب کے چند ورق سے زیادہ نہیں ہوتے اور آخر میں جب سال ختم ہونے لگتا ہے تو ایسی تیز رفتاری اختیار کرتے ہیں کہ کتاب کی بس تلاوت ہی باقی رہ جاتی ہے، اس لئے کہ اگر ایسا نہ کریں تو کتاب ختم نہ ہو، اگر شہرۂ آفاق صاحب فن ہوتے ہیں تو وہ داد تحقیق دینے اور فن کا حق ادا کرنے کے سامنے کتاب ختم کرنے کی پرواہ ہی نہیں کرتے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کتاب کے اہم ترین مسائل ومباحث اس بے اعتدالی کی بنا پر بے پڑھے رہ جاتے ہیں جو بسا اوقات فن کی دوسری کتابوں میں یا آتے ہی نہیں یا اس تفصیل کے ساتھ نہیں آتے جیسے زیر درس کتاب میں ہوتے ہیں، یہ ایک ایسا نقص ہے کہ اگر اس کا ازالہ نہ کیا جائے تو تعلیم کا ادھورا اور طلبہ کی استعداد کا ناقص رہ جانا یقینی ہے۔

اصولاً مدرس کا اصلی مطمح نظر ہر کتاب کو پڑھاتے وقت، نہایت سادہ اور سہل انداز میں حل عبارت اور تفہیم معانی ومطالب ہونا چاہئے، اگر فن کی ابتدائی کتاب ہے تو صرف مبادی ومسائل فن کو ذہن نشین کرانے پر اکتفا کرنا چاہئے، اور اگر اوسط درجہ کی کتاب ہے تو بقدر ضرورت دلائل وبراہین سے مسائل فن کا اثبات وتفہیم پیش نظر ہونا چاہئے، اور اگر فن کی آخری درسی کتاب ہے تو نہ صرف دلائل وبراہین کے بیان پر اکتفا کیا جائے بلکہ نہایت سلجھے ہوئے انداز میں مسئلہ زیر درس سے متعلق ضروری مباحث وتحقیقات کو بھی ضرور بیان کرنا چاہئے، ہر کتاب کی خصوصیات پر متنبہ کرنا بھی از بس ضروری ہے، بہر صورت طول لا طائل اور خارج از کتاب مباحث سے اجتناب ضروری ہے، تدریجی طور پر فن اور مسائل فن سے آگاہ کرنا مفید ہوتا ہے۔

نیز ہر شریک درس طالب علم کی حالت سے واقف ہونا مدرّس کے لئے از بس ضروری ہے کہ وہ کس حد تک سبق کو سمجھ رہا ہے، اس کا طریقہ یہ ہے کہ وقتاً فوقتاً ہر طالب علم سے ایسے سوالات کرے جن سے سبق کے سمجھنے کا حال معلوم ہو سکے، اسی طرح بلا تعیین مختلف طلبہ سے سوالات کرے تاکہ ہر طالب علم کتاب کو سمجھنے، سبق کو یاد کرنے اور مطالعہ کرنے پر مجبور ہو، عموماً مدرّسین جماعت کے ذہین طلبہ کو پیش نظر رکھ کر درس دیتے ہیں ان ہی سے سوالات کرتے ہیں، یہ طریقہ سخت مضر ہے، اس سے کمزور طلبہ احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور استفادہ سے محروم رہ جاتے ہیں، بلکہ وہ خود کو بالکل ہی مرفوع القلم سمجھ لیتے ہیں اور پھر سننے اور سمجھنے کی جانب توجہ ہی نہیں کرتے اور کورے کے کورے رہ جاتے ہیں، اس لئے مدرّس کا فرض ہے کہ وہ اپنے

معیار علم کے مطابق درس نہ دے بلکہ طلبہ کے ذہنوں کی سطح پر اتر کر درس دے اور ''اقتدِ بأضعفھم''کے اصول پر عمل کرے تاکہ تعلیم کا فرض ادا کر سکے۔''

روحانی اور معنوی تاثیر:

تدریس میں معنوی اور روحانی تاثیر کے لئے یہاں دو چھوٹے چھوٹے اقتباسات نقل کئے جاتے ہیں حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب رحمہ اللہ مدیر دار العلوم دیوبند سے ایک مرتبہ کسی نے نصاب تعلیم میں تبدیلی کے متعلق سوال کیا، انہوں نے جواب میں فرمایا:

''جہاں تک نصاب کا تعلق ہے وہ تو بالکل قابل اطمینان ہے، یہ وہی نصاب ہے جس سے بڑے بڑے اکابر علماء تیار ہوئے، البتہ طریقہ تعلیم تھوڑا سا بدل گیا۔۔۔۔۔وہ یہ کہ قدیم زمانے کے حضراتِ اساتذہ ایجاز واختصار کے ساتھ نفس مطلب عبارت پر منطبق کرکے دلوں میں ایسا ڈال دیتے تھے کہ کتاب ذہن نشین ہوجاتی تھی، اب لوگ اس کو حیلہ بنا کے اپنی معلومات پیش کرتے ہیں، جو کچھ رات کو دیکھا صبح کو بیان کردیا، وہ نقل اور سرد روایت ہوتا ہے اور وہ جو قلبی کیفیت ہے وہ شامل نہیں ہوتی''۔

عالم عرب کے مشہور مفکر علامہ یوسف قرضاوی اس موضوع پر اپنے ایک حالیہ مضمون میں لکھتے ہیں:

''کئی مدارس وجامعات میں آپ بہتر نصاب تو ضرور پائیں گے لیکن اچھا استاذ آپ کو نہیں ملے گا، اگر کوئی علمی نقطۂ نظر سے بہتر بھی ہو، تاہم ایمانی قوت کے لحاظ سے وہ مردہ دل ہوگا، یہاں قطر میں ہمارا اپنا مشاہدہ ہے کہ ہم نے اسلامی علوم میں موضوع کے لحاظ سے بڑی عمدہ کتابیں لکھیں لیکن ان کتابوں کو ایسا استاذ میسر نہیں آیا جو انہیں تروتازگی کے ساتھ زندہ جاوید طلبہ تک منتقل کرسکے، بلکہ مردہ دل اساتذہ نے زندہ موضوعات کو مردہ بنادیا اور جمود سے اس کی حرارت پر افسردگی طاری کردی''۔ (قیمۃ الأمۃ الإسلامیۃ ص:٤٧)

اس لئے یہ بات ملحوظ رہے کہ تدریس کے ذکر کردہ یہ طریقے یہ اصول اور یہ مبادی ایک طرف، ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، لیکن ان طریقوں سے آپ صرف خشک بحث، نرا مضمون اور صرف فنی موضوع طلبہ تک منتقل کرسکتے ہیں، جو ایک مدرس کا بہر حال فرض منصبی ہے، لیکن علم کی

اصل روح، علم کی نورانیت اور علم کی وجد آفرین تاثیر منتقل کرنے کے لئے صرف ان اصولوں کی رعایت کافی نہیں، بلکہ اس کے لئے دل کے اس درد، جگر کے اس سوز وایمان کی اس کیفیت سے متصف ہونا ضروری ہے جو ایمانی زندگی اختیار کرنے کے بعد اللہ جل شانہ کی توفیق سے انسان کو حاصل ہوتی ہے، عمل صالح کی خوشبو سے معطر ایمان والی زندگی، جس میں دعا، وابتہال ہو، رجوع الی اللہ ہو، ندامت کے اشکوں سے روح وقلب کی کثافتوں کی تطہیر کا اہتمام ہو، جس کے اپنانے کے بعد دل کی مردگی، افسردگی، نشاط وتازگی میں بدلے گی، اور دل کی سرد انگیٹھی میں حرارت آئے گی، ایمان کی حرارت، اخلاص کی حرارت، شوق وجذبے کی حرارت، جگر کے سوز وگداز، اور روح کی سیمابی کی حرارت، پھر جو بات زبان سے نکلے گی وہ جا کے دل پر لگے گی اور طلبہ کی زندگیوں میں خوش گوار دینی انقلاب کا ذریعہ بنے گی، اللہ جل شانہ ہمیں اس طرح کی ایمانی زندگی نصیب فرمائیں، ہمارا مرنا اور جینا، پڑھنا اور پڑھانا صرف اسی کی رضا کے لئے ہو، صرف اسی کے لئے ہو۔آمین۔ وصلی اللہ علی النّبي الأمي وعلی آلہ وصحبہ أجمعین۔

(ماہنامہ وفاق المدارس، رمضان المبارک ۱۴۳۶ھ)

طرق تدریس

(مشورے، تنبیہات)

شیخ الحدیث حضرت مولانا نذیر احمد صاحب رحمہ اللہ
بانی جامعہ اسلامیہ امدادیہ فیصل آباد

درسگاہ میں سبق کے شروع میں یا درمیان میں غیر متعلقہ بات ہرگز نہ کریں، اضطراری حالت کے بغیر اس گھنٹے کا کوئی حصہ کسی اور کام یا کلام پر نہ لگایا جائے۔

سبق میں مندرجہ ذیل اہداف پیش نظر ہوں:

ا۔ تصحیح عبارت:

عبارت صحیح روانی کے ساتھ پڑھنے کی عادت ڈالی جائے، اس کا ترجمہ ایسا کیا جائے کہ جس میں نحوی، صرفی، ادبی قواعد کی بھی رعایت ہو، مھما أمکنَ اردو بھی صحیح ہو، بچوں کی یہ عادت بنائی جائے کہ کتاب کھولتے ہی "بسم اللہ" پڑھ کر عبارت پڑھنا شروع کردیں، جب ایک مسئلہ یا قاعدہ کی عبارت ختم ہوجائے تو رُک جائیں، اس کا ترجمہ اور تشریح سمجھنے کے بعد پھر دوسرے مسئلہ کی عبارت پڑھی جائے، سارے باب یا ساری فصل کی عبارت ایک ہی مرتبہ نہ پڑھی جائے، اس کو بھی طالب علم کے مطالعہ کا حصہ قرار دیں، وہ کم از کم یہ تو سمجھ کر آئے کہ مسئلہ یا قاعدہ کہاں ختم ہوتا ہے۔

استاد صاحب ترجمہ بہت اہتمام سے کریں، حروفِ رابطہ، حروف اضافت کی رعایت رکھی جائے، ترجمہ ہی سے کلمات کے ایک دوسرے کے ساتھ تعلق کی نوعیت واضح ہوجائے، کہ کون مسند ہے اور کون مسندالیہ، ان سب امور کی رعایت رکھتے ہوئے ترجمہ کیا جائے، پہلے مفردات کا ترجمہ کیا جائے ان مفردات کے ضمن میں صیغہ وترکیب کی توضیح کی ضرورت ہو تو وہ بھی کی جائے، مفردات سمجھانے کے بعد

سارے فقرہ کا ترجمہ ایک سانس میں کرے، فقرہ لمبا ہونے کی صورت میں مناسب جگہ پر وقف کرے، دورانِ عبارت ترجمہ نہ کرے اور دورانِ ترجمہ عربی یا فارسی کی عبارت نہ پڑھے یعنی ان میں اختلاط نہ کرے، دونوں میں سلاست اور روانگی ہونی چاہئے۔

۲۔نفس مطلب پر غور:

جس مسئلہ یا قاعدہ کی عبارت طالب علم پڑھے اس کا نفس مطلب سہل طریقے سے طلبہ کے ذہن نشین کرایا جائے، سر پر تیل کی مالش کی طرح نفسِ مطلب ان کے ذہنوں میں رچایا جائے، جب تک نفسِ مطلب سمجھانے میں کامیابی نہ ہوجائے، بچوں کو خارجی تقریرات میں نہ الجھایا جائے، بچوں کا ذہن بسیط سا ہوتا ہے اس لئے بڑی حکمت سے تقریر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، ایسی مختصر سی تقریر جس سے مطلب جلدی سمجھ نہ آئے یہ اس ہدف کو پورا کرنے سے قاصر ہے، اور غیر ضروری تطویل بھی بچوں کو پریشان کردیتی ہے، اصل مقصد سنبھالنا مشکل ہوجاتا ہے، ان دونوں خامیوں سے بچنے کی ضرورت ہے۔

نفس مطلب پر اکتفاء کرنا چاہئے، بڑی باتیں بڑی کتابوں میں آتی رہیں گی، لیکن یہ تنبیہ ضروری ہے کہ بعض اوقات خارجی تقریر کی تعیین میں غلطی ہوجاتی ہے، نفس مطلب سمجھانے کے لئے بعض باتوں کا بیان کرنا موقوف علیہ ہوتا ہے، اس لئے ان کا بیان کرنا تو ضروری ہوا، بعض لوگ ایسی باتوں کو خارجی کہہ کر نظر انداز کردیتے ہیں اور صرف ترجمے پر اکتفاء کرلیتے ہیں، یہ بڑا سنبھلنے کا مقام ہے، بہر کیف یہ گفتگو خارجی ہے یا داخلی، اس میں ذوقِ اجتہادی مختلف بھی ہوسکتا ہے، آپ کا ذوق جو بھی ہو تقریر کے وقت اصل نصب العین پر نظر جمی رہنی چاہئے کہ بچوں کو الجھن میں ڈالے بغیر نفسِ مطلب ان کے ذہنوں پر نقش کرنا ہے، جب یہ نصب العین زیر نظر رہے گا تو انشاء اللہ داخلی اور خارجی کا اجتہادی ذوق مقصد میں رکاوٹ نہیں بنے گا۔

چند بچوں سے سن کر جائزہ بھی لیا جائے کہ آپ سمجھانے میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں، نفس مطلب سمجھنے میں جو ابہامات وتلبیسات رہ سکتے ہیں ان کو ختم کرنے کا اہتمام کریں، آخر میں سبق کا خلاصہ ضرور بتائیں تاکہ اس کے پھیلاؤ کا انضباط آسان ہوجائے۔

۳۔ تسہیل فہم:

سبق کی تقریر میں سب سے زیادہ زور تسہیل فہم پر ہو، اس کے لئے تختہ سیاہ استعمال کریں اور معقولات کو محسوسات بناکر سمجھائیں، جیسے نماز باجماعت میں امام کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ نمازیوں میں سے سب سے زیادہ کمزور کی رعایت رکھ کر نماز پڑھائے ایسے ہی اضعف طالب کی رعایت ہونی چاہئے لیکن یہ رعایت ایسی نہ ہو کہ ذہین اور اوسط طالب علم ملول ہوجائیں، جب آپ اسہل تعبیرات تلاش کرکے لائیں گے تو ان شاء اللہ ایک مرتبہ کہنے سے ہی سب کے ذہن میں سبق کی تقریر بیٹھ جائے گی۔

۴۔ سبق سننے کا اہتمام:

سبق سننے کا بہت اہتمام کریں، اس التزام سے طلبہ متیقظ رہیں گے، رابعہ تک تو تمام کتابیں بالاستیعاب سننی ضروری ہیں، اس کے بعد استیعاب مشکل ہے کیونکہ بڑی کتابیں آجاتی ہیں، لیکن پھر بھی بچوں کو آزاد نہ چھوڑا جائے، پڑھائے ہوئے سبق کے اجزائے مختلفہ طلبہ سے پوچھیں بغیر کسی ترتیب کے، ہر طالب علم کو خطرہ رہے کہ شاید مجھ سے پوچھ لیا جائے، اس طرح ان کو سبق یاد کرنے کے لئے فکر بھی ان میں پیدا کریں، جماعت بڑی ہو یا چھوٹی تمام طلبہ سے عبارت پڑھوائی جائے، لیکن بکثرت مختلف طلبہ سے خلاف ترتیب بھی سنا جائے تاکہ ہر ایک کو خطرہ رہے کہ شاید آج مجھ سے سُن لیں۔

استاد کو چاہئے کہ وہ سبق پر چھایا اور حاوی رہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ضرورت کا کوئی گوشہ نظر انداز نہ کرے طلبہ کو مطالعہ کرنے سے بے فکر نہ ہونے دے، تکرار کے ذریعہ سبق یاد کرنے میں سستی نہ کرنے دے، اگر کسی مدرسہ میں اجتماعی طور پر مطالعہ اور تکرار کرنے کی پابندی نہ بھی ہو تو اساتذہ کرام کا یہ حاوی رہنا ہی کافی ہوجائے گا، لیکن اگر اساتذۂ کرام اسے اپنی ذمہ داری نہ سمجھیں سبق میں ان کی گرفت کمزور ہو تو اجتماعی مطالعہ و تکرار کی پابندی کے باوجود بھی مقاصد میں کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی، اعلیٰ درجہ کی کامیابی طلبہ کو تب حاصل ہوگی جب کہ مدرسہ کے ماحول میں اجتماعی مطالعہ و تکرار کی پابندی ہو اور پیچھے سے اساتذہ کرام کی گرفت بھی مضبوط ہو۔ (ندوۃ المدرسین: ۱۶، ۱۷)

معلم کو اپنے درس میں کن آداب کا خیال رکھنا چاہیے؟

امام بدرالدین ابن جماعہ رحمہ اللہ

(۱) معلم اور عالم کو چاہیے کہ مسند تدریس پر بیٹھنے سے قبل ہر طرح کی پاکی حاصل کرے، اور علم دین کی تعظیم اور احترام کی نیت سے شایانِ شان عمدہ لباس زیبِ تن کرے۔

امام مالک رحمہ اللہ کے پاس جب لوگ حدیث سیکھنے کے لئے آتے تھے تو امام مالک رحمہ اللہ پہلے غسل کرکے عمدہ پوشاک پہنتے تھے اور خوشبو لگاتے تھے، دستار باندھتے پھر مسند پر جلوہ افروز اور درسِ حدیث سے فارغ ہونے تک عود خوشبو مہکتی رہتی، آپ فرماتے کہ "میں چاہتا ہوں کہ حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم کروں"۔

پھر اگر وقتِ مکروہ نہ ہو تو دو رکعت نمازِ استخارہ پڑھے اور علم کی نشر واشاعت، شرعی فوائد اور احکام خداوندی کی تبلیغ کی نیت کرے جن احکام کی تبلیغ وبیان کا اس کو مکلف بنایا گیا ہے، نیز علمی ترقی کے لئے دُعا کرے اور حق بات کی طرف رجوع اور اس کا اظہار کرے، اللہ تعالیٰ کے ذکر پر جمع ہو، مسلمان بھائیوں کو سلام کرے اور تمام مسلمانوں اور سلفِ صالحین کے لئے دعائیں کرے۔

(۲) جب گھر سے نکلے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول یہ دُعا پڑھے:

اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ أَنْ أَضِلَّ أَوْ أُضَلَّ، أَوْ أَزِلَّ أَوْ أُزَلَّ، أَوْ أَظْلِمَ أَوْ أُظْلَمَ، أَوْ أَجْهَلَ أَوْ يُجْهَلَ عَلَيَّ، عَزَّ جَارُكَ، وَجَلَّ ثَنَاؤُكَ، وَلَا إِلٰهَ غَيْرُكَ۔

پھر یہ دعا پڑھے:

بسم الله وبالله، حسبي الله توكّلتُ على الله ولاحولَ ولاقوةَ إلاَّ بالله العليِّ العظيمِ، اللّٰهُمَّ اثبت جناني وأدِرِ الحَقَّ على لساني۔

مسند تدریس تک پہنچنے تک اللہ تعالیٰ کا برابر ذکر کرتا رہے، جب درس گاہ میں پہنچے تو حاضرین کو سلام کرے اور اگر مکروہ وقت نہ ہو تو دو رکعت پڑھے، اگر مسجد ہو تو پھر ضرور نماز پڑھے، پھر اللہ تعالیٰ سے دعا مانگے کہ مجھے توفیق عطا فرما، میری مدد فرما، اور ہر بلا سے حفاظت فرما، پھر اگر ہوسکے تو قبلہ رخ ہوکر وقار، سکون، تواضع اور عاجزی کے ساتھ بیٹھ جائے، بیٹھنے میں کوئی ایسی حالت اور ہیئت اختیار نہ کرے جسے برا سمجھا جاتا ہو، مثلاً پنڈلی اور ران کو ملا کر ان کو کھڑا کرکے کولہوں پر نہ بیٹھے، اور نہ اس انداز میں بیٹھے کہ جیسے اٹھنے کے لئے تیار ہو اور نہ ہی ایک ٹانگ کو دوسری ٹانگ پر رکھ کر بیٹھے، اور نہ بلا عذر دونوں پاؤں یا ایک پاؤں پھیلاکر بیٹھے اور نہ ہی اپنے ہاتھ پر ٹیک لگا کر ایک جانب کو جھک کر بیٹھے، نیز معلم کو چاہیے کہ دورانِ درس اپنی جگہ سے ادھر اُدھر نہ ہو، اور اپنے ہاتھوں کو عبث کاموں سے بچائے، ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں نہ ڈالے اور بلا وجہ اپنی نگاہ کو دائیں بائیں نہ پھیرے، اور زیادہ ہنسنے اور مزاح کرنے سے اجتناب کرے، اس سے رعب اور وقار میں کمی آتی ہے، جیسے کسی نے کہا ہے کہ "جو شخص مزاح کرتا ہے ذلیل ہوتا ہے اور جس چیز کا زیادہ ذکر کرے گا اسی چیز میں معروف ہوگا"، اور بھوک پیاس، پریشانی، غصہ یا نیند یا اونگھ یا بے چینی کی حالت میں نہ پڑھے اور نہ پڑھائے، ایسی صورت میں کسی مسئلہ کا جواب یا فتویٰ غلط صادر ہوسکتا ہے، کیونکہ ایسی صورت میں پوری توجہ اور کامل غور وفکر اس کے لئے ممکن نہیں ہوگا۔

(۳) معلم کو چاہیے کہ حاضرین مجلس کے سامنے باوقار اور نمایاں انداز میں بیٹھے اور علم، عمر اور مقام ومرتبہ میں جو اعلیٰ ہو اس کا اکرام کرے اور ان کی توقیر کرے اور باقیوں کے ساتھ بھی لطف ومہربانی سے پیش آئے اور ان کے ساتھ خندہ پیشانی اور حسن سلوک سے پیش آئے، اکابرین کے احترام اور اکرام میں کھڑے ہوجانا مکروہ نہیں ہے، علماء اور طلبائے علم کے اکرام کے بارے میں بہت سی نصوص موجود ہیں، معلم کو چاہیے کہ حاضرین کی طرف حسب ضرورت معتدل طریقے سے التفات اور توجہ کرے، اور جو اس سے کوئی بات کرنا چاہے یا مسئلہ پوچھنا چاہے یا

کسی بات کو سمجھنا چاہے تو اس کو زیادہ توجہ دے اگرچہ وہ عمر میں یا مرتبہ میں چھوٹا ہو، کیونکہ ایسی صورت میں توجہ نہ دینا متکبرین کا شیوہ ہے۔

(۴) معلم کو چاہیے کہ اپنی آواز بلا ضرورت بلند نہ کرے اور نہ اتنی پست کرے کہ اس سے پورا فائدہ بھی حاصل نہ ہو، خطیب نے "الجامع" میں روایت ذکر کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بے شک اللہ تعالیٰ پست آواز کو پسند فرماتے ہیں اور بلند آواز کو ناپسند کرتے ہیں۔ (الجامع لاخلاق الراوی وآداب السامع: ۹۸۶)

ابو عثمان محمد بن امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے والد کو کبھی نہیں سنا کہ آپ نے مناظرہ کے دوران اپنی آواز کو بلند کیا ہو۔

امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ عام عادت سے زیادہ اپنی آواز بلند نہیں کرتے تھے۔

اس لئے زیادہ بہتر یہ ہے کہ اس کی آواز مجلس تک محدود رہے کہ حاضرین مجلس بآسانی سن سکیں، لیکن اگر ان حاضرین میں کوئی اونچا سننے والا شخص موجود ہو تو پھر بقدر ضرورت آواز بلند کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، حدیث میں اس کی فضیلت آئی ہے۔

نیز معلم اپنی گفتگو جلدی جلدی تسلسل کے ساتھ نہ کرے بلکہ آہستہ آہستہ ٹھہر ٹھہر کر گفتگو کرے تاکہ وہ خود بھی اور اس کے سامعین بھی اس میں غور وفکر کر سکیں، احادیث میں مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو میں ہر کلمہ ایسا جدا جدا ہوتا تھا، کہ ہر سننے والا شخص بآسانی سمجھ لیتا تھا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر (اہم) بات تین بار دھراتے تھے تاکہ ہر ایک کی سمجھ میں آجائے۔

جب ایک مسئلہ یا بحث کو بیان کرکے فارغ ہو تو تھوڑی دیر کے لئے سکوت اختیار کرے، (پھر اگلی بات شروع کرے)۔

(درس وتدریس کے آداب ترجمہ تذکرۃ السامع والمتکلم في أدب العالم والمتعلم: ۴۷ تا ۵۳)

مختلف علوم اور فنون کے
پڑھانے کے پڑھانے کے آسان اور مفید طریقے

(۱)

علم تفسیر کی تدریس
کے مفید اور آسان طریقے

علم تفسیر کی تدریس ابتدائی اور انتہائی درجات میں

مولانا شمس الحق صاحب رحمہ اللہ ناظم تعلیمات دار العلوم کراچی

علم تفسیر کی تدریس ابتدائی درجات میں:

ابتدائی درجات کے اندر تفسیر قرآن کریم کا عنوان مت رکھیں، ابتدائی درجات ثانیہ، ثالثہ، رابعہ، خامسہ کے اندر ترجمۂ قرآن کا عنوان دیں، تفسیر کا نہیں، یہ بہت بڑی غلطی ہے، بہت بڑے نقصان کا سبب ہے، وجہ کیا ہے؟ وجہ اس کی یہ ہے کہ درجہ ثانیہ میں جو طالب علم پہلی مرتبہ قرآن کریم کے پارے پڑھ رہا ہے ظاہر ہے کہ اسے اس درجے میں مفسر بنانا مقصود نہیں ہے، بے شمار تفسیری نکات مفسرین کے اقوال، واقعات، شان نزول کی قسمیں اور طرح طرح کے تفسیری مباحث وہ درجہ ثانیہ کے طلباء کے سامنے بیان کررہا ہے، اور طالب علم کا حال کیا ہے کہ اس سے قرآن کریم کی آیت کا ترجمہ پوچھو تو اُسے لفظی ترجمہ نہیں آتا، تو یہ بہت بڑی خطا ہے اور کوتاہی ہے کہ ہم نے اس درجے میں تفسیر کا نام رکھ دیا، خدا کے لئے آپ ان درجات کے اندر اس کا نام ترجمہ قرآن رکھیں، اور یہ ہی عنوان استعمال کریں، اور اس میں اتنا اضافہ کرلیں کہ:

"لفظی ترجمہ قرآن مع مختصر تشریحات"

بالکل یہ بھی نہیں کہ آپ نے خالی ترجمہ کردیا، اسے سیاق وسباق سے کچھ مثلاً علامہ شبیر احمد عثمانی کی تفسیر عثمانی اگر اس کا حاصل بھی آپ طالب علم کو بتادیں تو اس درجے میں اس کے لئے کافی ہوگا، آپ اس درجے میں تفسیر قرطبی دیکھ آئیں اور تفسیر روح المعانی دیکھ آئیں اور اس کے سامنے بیان کریں تو اپنا وقت بھی ضائع کررہے ہیں اور اسے بھی برباد کررہے ہیں، اس لئے عنوان تبدیل کردیجئے، عنوان یہ ہو: لفظی ترجمہ قرآن مع ضروری تشریحات، یہ درجہ ثانیہ میں ہو، اور ثالثہ، رابعہ، خامسہ میں بھی، اس لئے کہ

ہمارے یہاں دس دس پارے تین درجات میں ہیں، جن درجات میں دس دس پارے ہیں وہاں ترجمہ ہو، اصل مقصود بھی یہی ہے، آپ خود اپنے قلوب میں غور فرمائیں آپ کا مقصد یہاں طالب علم کو لفظی ترجمہ سکھانا ہے اگر سارے مباحث بالفرض اس کو پڑھادے، بالفرض اگر ان میں کوئی ذی استعداد ہے اور وہ ان باتوں کو یاد بھی رکھ لے لیکن اسے لفظی ترجمہ نہیں آتا تو آپ کا مقصود حاصل نہیں ہوگا، اصل یہ ہے کہ قرآن کریم کا ترجمہ اور اس کے ساتھ ساتھ ضروری فوائد اور تشریحات ہوجائیں تو بہت ہے۔ایک بات تو یہ ہوئی۔

دوسری بات یہ ہے کہ ترجمہ قرآن جو آپ پڑھارہے ہیں درجہ ثانیہ اور ثالثہ میں دس دس پارے پڑھارہے ہیں، اس میں آپ بنیادی ترجمہ اور لفظی وٹکسالی ترجمہ کا اہتمام کریں، لفظی ترجمہ ہو طالب علم کو معلوم ہو کہ لفظ کے لغوی معنی کیا ہیں؟۔

اللہ تعالیٰ ہمارے اکابر کی قبور کو منور فرمائے، حضرت شاہ عبد القادر رحمہ اللہ کا جو اردو ترجمہ ہے آج تو اس کے سمجھنے والے بہت کم ہیں، شاہ صاحب رحمہ اللہ کا موضح القرآن اور وہ ترجمہ جو چھپا ہوا ہے وہ ایسی ٹکسالی دِلّی کی اردو ہے کہ اس کا سمجھنے والا بہت کم ملے گا، {الطَّیِّبات للطَّیِّبین} ستھریاں ہیں ستھروں کے واسطے، اب اس کا ترجمہ کہ ستھری کسے کہتے ہیں، {الخبیثات للخبیثین} گندیاں ہیں گندوں کے واسطے، اتنا پیارا، اتنا لذیذ، اتنا جامع، اور مختصر ترجمہ، {الطَّیِّبات} کا ستھری سے بہتر ترجمہ کوئی نہیں ہوسکتا، تو اگر آپ اس کی اردو سمجھ سکتے ہیں تو اسی کو دیکھ لیا کریں، اس میں لغوی ترجمہ ایسا ٹکسالی ترجمہ ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس لغت کا اردو میں اس سے بہتر کوئی ترجمہ نہیں ہوسکتا، تو اس کا اہتمام کیجئے کہ لغوی ترجمہ آئے، لغت میں اس کے کیا معنی ہیں اور عبارت میں اس لفظ کے معنی کو کس طرح پرو دیا گیا اور سمویا گیا ہے۔

ایک بات ترجمے کے ذیل میں یہ ہے کہ (میں ترجمے کا عنوان اختیار کررہا ہوں تفسیر کا نہیں)، لغات کے معنی کے ساتھ ساتھ صیغوں کا اہتمام کیجئے، قرآن کریم میں جو صرفی صیغے استعمال کئے ہیں، آپ طالب علم سے پوچھیں:

یہ کس باب سے ہے؟

کس وزن پر ہے؟

کونسا صیغہ ہے؟

اشتقاق کیا ہے؟

قرآن کریم سے زیادہ بہتر کتاب ادب، صرف اور نحو کی تمرین کے لئے اور کوئی نہیں مل سکتی اگر قرآن کریم میں کوئی شخص تمرین کراوے فن صرف واشتقاق کی، فن نحو کی، ادب کی، تو اس کو دوسری کتاب پڑھنے کی حاجت بہت کم پیش آئے گی ــــــ

درجہ ثالثہ میں دوسری بات آپ کو یہ کرنی ہے حل لغات کے بعد کہ آپ اس میں نحو اور صرف کے صیغوں اور ترکیب کا اہتمام کریں، اس کو آیات کی، ہر آیت کی نہیں، جو ترکیب کے لحاظ سے پیچیدہ ہیں کوئی ابہام واشکال ہو اس کی ترکیب ہونی چاہیے، صیغے آئیں ان کے اشتقاق اس میں ہونے چاہئیں۔

بس اتنا کام آپ نے کرنا ہے ترجمہ قرآن مجید برائے درجہ ثانیہ وثالثہ:

لفظی ترجمہ آئے۔

لغات کے معانی آئیں۔

اس کے ساتھ صرفی اشتقاقات۔

نحوی ترکیب۔

خاص طور سے عم سپارہ میں ہمارے طلباء سے لغات پوچھیں، انہیں لغات بہت کم یاد ہونگی، وہ بالکل ابتدائی درجہ میں پڑھایا جاتا ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ وہاں تفسیر بیان کردی لیکن حل لغات نہیں ہوا، آپ نے اس کے صیغوں کا اور ترکیب کا اہتمام نہیں کیا، اس پر آپ خدا کے لئے زور دیجئے، اس کا اہتمام کیجئے، اور اس سے زائد کوئی تفسیری مباحث نہ بیان کیجئے، بس اس کا مفہوم مختصر سی تشریح کے ساتھ ثانیہ میں بھی اسی طرح ثالثہ میں بھی اسی طریقہ سے، پھر رابعہ، قرآن کریم کے دس دس پارے اس طریقہ سے پورے ہوجائیں گے انشاء اللہ۔

دیکھئے!

ان درجات میں قرآن کریم کا جو ترجمہ ہے ثانیہ، ثالثہ میں اس کا مقصود تو یہ ہے کہ:
قرآن کریم کا لفظی ترجمہ آئے۔

دوسرا مقصد یہ ہے کہ قرآن نحو اور صرف کے اعتبار سے جب آپ پڑھیں گے ان کے قواعد کے اجراء کے ساتھ تو نحوی قواعد کا بھی آپ کو استحضار ہوگا، ادب کا، لغات اور الفاظ کا بھی استحضار ہوگا، تو گویا کہ پھر قرآن کا ترجمہ ہی نہیں آیا بلکہ نحوی ضوابط وقوانین بھی پختہ ہوئے، صرفی قواعد بھی پختہ ہوئے۔

اور اس کے ساتھ ساتھ ادب کے تقاضے بھی پورے ہوئے، ادبی لحاظ سے قرآن کریم میں دیکھئے، یہ تینوں چیزیں تابع ہیں لیکن ذریعہ ہیں قرآن کریم کو صحیح طریقہ سے سمجھنے کا، ترجمہ آپ کرلیں لیکن نحو کے قواعد کا اجراء آپ نہ کریں، بات نامکمل رہے گی، ترجمہ آپ مکمل کر ہی نہیں سکتے، جب تک کہ آپ نحوی قواعد کا اجراء نہ کرلیں، اسے پتہ ہی نہیں کہ یہ فاعل ہے، مفعول ہے، حال ہے، ذوالحال ہے، تمیز ہے، وہ ترجمہ کیا کرے گا، جب تک آپ اسے یہ نہ بتلائیں کہ یہ حال ہے یا تمیز ہے کونسا مفعول ہے ترجمہ صحیح نہیں کرسکتا، اس لئے ان قواعد کا اجراء معین بنے گا قرآن کے صحیح ترجمہ کے واسطے۔

ان درجات میں میں نے عرض کیا کہ تفسیر کا عنوان نہ رکھیں، اور ان درجات کی مثال ایسے سمجھ لیجئے جیسے کہ ہمارے یہاں درجہ ثانیہ میں "زاد الطالبین" پڑھاتے ہیں اور درجہ رابعہ میں "ریاض الصالحین" پڑھاتے ہیں، اب "زادالطالبین" اور "ریاض الصالحین" میں حدیثیں ہی ہیں، اور درجہ ثانیہ میں آپ وہ پڑھارہے ہیں تو یہاں "زادالطالبین" پڑھانے سے آپ کا مقصود کیا ہے، یہاں مقصود اس کو محدث بنانا تو ہے نہیں، "زادالطالبین" کی ایک حدیث المُسلمُ مَن سلم المُسلمون من لسانه ویده، اگر وہ پڑھتا ہے اب آپ اس میں مشکوۃ کی اور صحاح ستہ کی اگر تقریر کرنے بیٹھ جائیں اس کے سامنے تو بتلائیں کہ یہ کوئی محل ہوگا اس کا؟ یہاں مقصود محدث بنانا تو نہیں ہے، یہاں اس کے دو مقصود ہیں:

ایک یہ ہے کہ اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مختصر مختصر جوامع الکلم یاد کرالئے جائیں، استحضار ہوجائے ابتدائی درجہ میں چھوٹی چھوٹی حدیثیں ہیں مختصر مختصر جملے ہیں، یہ یاد ہوجائیں گے، اس کو

آگے کام آئیں گے، اس کے معارف وحقائق آگے سمجھے گا۔

دوسرا مقصود اس کا یہ ہے کہ ان ہی احادیث میں آپ اجراء کرائیں کہ یہاں اس جگہ میں مبتداء کون ہے، خبر کون ہے ذوالحال اور حال کون ہے، نحوی اجراء اور صرف کے اشتقاقات، مبادی ماخذ، ان کا اجراء کرانا مقصود ہے، ادبی لغات بھی اس کو معلوم ہونگے، لیکن نحوی صرفی اجراء اصل مقصود ہے "زادالطالبین" کا مقصود محدث بنانا نہیں ہے، اب ایک استاد "زادالطالبین" پڑھا دیتا ہے ترجمہ کردیتا ہے ایک حدیث کا، اور لمبی چوڑی تفصیلی مباحث بیان کردیتا ہے، اس نے "زادالطالبین" کا حق ادا نہیں کیا، اسے چاہیے کہ اس کی مختصر حدیثیں طالب علم کو یاد کرادے اور نحوی ترکیب کا اجراء کرادے، مبتدا ہے، خبر ہے، جملہ انشائیہ ہے، خبریہ ہے، اس کے بغیر اس کا حق ادا نہیں ہوگا۔

یہی بعینہ "ریاض الصالحین" کے اندر ہے، "ریاض الصالحین" کے اندر بھی محدث بنانا مقصود نہیں ہے، وہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے مقصود معاشرت اور معاملات کی تربیت کرنا ہے، مثلا "ریاض الصالحین" کا باب الادب پڑھاتے ہیں، تو باب الادب کے اندر اس کو کیا بتلانا ہے نحوی صرفی تو وہ سیکھ کر آچکا ہے، اور ابتدائی درجہ میں اجراء کرچکا ہے، اب بیان اس سے مقصود:

اس حدیث کے اندر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آداب معاشرت کیا ہیں؟ وہ بیان کرنا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملات کا طریقہ کیا تھا۔

لمبی چوڑی بحثیں مقصود نہیں، بس اس پر آپ معمولی سی تفصیل کے ساتھ اس کو وہ حدیث پڑھادیں، اس کے بعد صحاح ستہ پڑھے گا اس کے مباحث آجائیں گے، اب جو حیثیت "زادالطالبین" اور "ریاض الصالحین" اور ان کے پڑھانے کے مقاصد ہیں وہی مقصد ابتدائی درجات میں قرآن کریم کے ترجمہ پڑھانے کا ہے، وہاں لفظی ترجمہ اور نحوی صرفی قواعد کا اجراء ہو۔ (رموز تدریس ۱۶۷..... بالانتخاب)

علم تفسیر کی تدریس انتہائی درجات میں:

اب آیا ہے درجہ باقاعدہ تفسیر کا، چھٹے درجہ میں ہمارے یہاں "جلالین" پڑھائی جاتی ہے، ساتویں درجہ کے اندر بیضاوی پڑھاتے ہیں، یہ درجات وہ ہیں کہ ان میں طالب علم ذہنی اعتبار سے بھی مضبوط

ہوجاتا ہے، استعداد میں بھی اس کی قوت پیدا ہوجاتی ہے اور مختلف علوم کے مسائل وقواعد بھی اسے مستحضر ہوجاتے ہیں، اب یہاں اس کے لئے قرآن کی تفسیر تفسیر ہونے کی حیثیت سے پڑھنے کے اندر سہولت ہوتی ہے لہذا ان سارے علوم کی روشنی کے اندر جب جلالین پڑھتا ہے تو جلالین کے اندر ہمارے مدارس میں ایک طرز پڑا ہوا ہے کہ جلالین پڑھانے میں بھی یہ ہوتا ہے کہ بس جلال الدین سیوطی نے جلال الدین محلی نے مقدرات نکال دئے ہیں، ان مقدرات کا ترجمہ کردیتے ہیں، تفسیر کے آگے جو مقدر عبارت نکالی جو تفسیری کلمات انہوں نے ذکر کئے ہیں یا قراءت کا جو اختلاف بیان کیا ہے اس کا ترجمہ کردیتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ اتنی بات "جلالین" میں کافی نہیں، "جلالین" کے اندر پڑھانے کے لئے ضروری ہے کہ آپ ان مقدرات کا جو مفسر نے نکالے ہیں آیت کے ساتھ ان کا ربط بیان کریں، کہ یہ مقدر عبارت جو نکالی جارہی ہے اس آیت کے ساتھ اس کی کیا مناسبت ہے، اور اس تقدیر کے بغیر اس عبارت کا مطلب نہیں سمجھا جاسکتا، اس مقدر کا عبارت کے ساتھ گہرا تعلق، اور بغیر اس مقدر کے نکالے ہوئے عبارت کا قرآن کریم کی آیت کا مطلب نہ سمجھنا یہ اس طالب علم کو بتایا جائے، کہ اگر یہ عبارت مقدر نہ نکالی جائے تو آیت کا مطلب نامکمل رہے گا، سمجھ میں نہیں آئے گا، خالی ترجمہ کردینا کافی نہیں، اس مقدر کا آیت کے ساتھ ربط بیان کیجئے، اس کی مناسبت بیان کیجئے، اس پر موقوف ہونا بیان کیجئے، یہ ضروری ہے ورنہ آپ نے مقدر کا ترجمہ کردیا طالب علم کچھ سمجھا نہیں کہ تقدیر مصنف نے کیوں نکالی، بعض وقت مصنف تقدیری عبارت نکالتے ہیں اس کے اندر کسی اشکال کا جواب دینا ہوتا ہے، بعض مرتبہ کسی نحوی ترکیب کی طرف اشارہ ہوتا ہے، مقدر عبارت اس لئے نکالی، آپ نے اس کو بتلایا ہی نہیں۔

دوسری بات "جلالین" میں اس سے زیادہ اہم، وہ یہ ہے کہ وہاں آپ آیات کی ترکیب کا اہتمام کریں اور قرآن کریم کی آیات کے جو مقدرات نکالے ہیں ان کی بھی ترکیب کریں، اور نفس آیات کا بھی ترجمہ کرنے کے ساتھ ساتھ ترکیب نحوی کریں۔

جلالین کے اندر ترکیب کا رواج ہمارے مدارس کے اندر تقریبا معدوم ہے، میں نے الحمدللہ

بہت عرصہ "جلالین" پڑھائی، ساری کتابیں الحمدللہ عرصہ دراز تک ہوتی رہیں تقریباً اٹھارہ سال تک میں جلالین پڑھاتا رہا، اس کا ہمیشہ اہتمام کرتا تھا کہ قرآن کریم کی آیات کی ترکیب اور جو مقدرات وہاں پر ہیں ان کی ترکیب اور یہ جو بات میں نے عرض کی کہ تقدیر کی ضرورت کیا ہے، اور مناسبت اس کی آیت سے کیا ہے، اس کا اہتمام کئے بغیر میں بالکل نہیں چلاتا تھا، چنانچہ اس کا طلبہ کو بہت فائدہ ہوا۔

تیسری بات یہ ہے کہ "جلالین" کا جو حاشیہ ہے اس حاشیہ میں رطب ویابس بہت ہے بعض چیزیں سقیم ہیں اور جمہور کے مسلک کے خلاف تفردات ہیں، تو ان حاشیوں کو طلبہ دیکھتے ہیں اور وہ حاشیہ دیکھ کر طالب علم یہ سمجھتا ہے کہ شاید قرآن کی اس آیت سے ثابت ہے، آپ اس کی فکر کیجئے کہ جلالین کے حواشی میں جو رطب ویابس اور صحیح وسقیم چیزیں ہیں ان میں تمیز بیان کریں، طالب علم کو یہ بتائیں کہ یہ بات یہاں سقیم ہے، یہ بات صحیح ہے اور یہ بات کمزور ہے یہ بات یہاں غلط ہے اس کا کوئی ثبوت نہیں، جیسا کہ ہاروت وماروت کے واقعہ کے اندر اس قسم کی بڑی لمبی چوڑی بحثیں وہاں کی گئی ہیں، اسی طریقہ سے تلك الغرانيق العلى کے اندر سورہ نجم کی تفسیر کے اندر اس قسم کی باتیں حواشی کے اندر ہیں، طلبہ کو یہ بتلانا چاہئے کہ یہاں صحیح یہ ہے سقیم یہ ہے اور آیت کی صحیح توجیہ کرکے بتلائیں کہ یہ ہے اصل توجیہ آیت کی صحیح مراد یہ ہے مرتب کرے[1]، یہ بات آپ کب کر سکتے ہیں؟ یہ جب کر سکتے ہیں کہ جب جلالین کے ساتھ ساتھ دوسری تفاسیر کو بھی دیکھیں۔

"جلالین" کی تدریس کے لئے ضروری ہے کہ آپ دوسری تفسیروں کا مطالعہ کریں تاکہ جو باتیں یہاں اجمال ہیں وہ ذرا تفصیل سے آجائیں، سقیم باتیں حواشی کے اندر ہیں تو اس کی اصلاح ہوجائے، صاوی اور جمل یہ دو حواشی عام طور پر مشہور ہیں، صاوی کے بارے میں تو عام طور پر یہ تاثر ہے اور خود بھی تجربہ ہے کہ اس کی بہت سی باتیں ضعیف ہوتی ہیں کچھ مبتدع بھی معلوم ہوتے ہیں، کچھ میلان اُن کا ابتداع کی

(۱) بلکہ خود علامہ سیوطی اور علامہ محلی رحمہما اللہ سے بھی بعض مقامات پر بڑی عجیب قسم کی تسامحات ہوچکی ہیں جسے بندہ نے **"تفسیر جلالین میں تفسیری نحوی اور قرآنی تسامحات اور اکابرین علماء امت کی تحقیقات کی روشنی میں ان کی اصلاحات"** کے نام سے جمع کرنے کی کوشش کی ہے، مدرسین حضرات نوٹ فرمالیں۔

طرف ہے، اس لئے اس پر تو زیادہ اعتماد نہیں کرنا چاہیے، جمل البتہ ایسی ہے کہ وہ مقدرات اور ترکیب وغیرہ کے بارے میں معتبر ہے۔

لیکن میرا مشورہ آپ حضرات کو یہ ہے کہ آپ تفسیر پڑھانے کے لئے جلالین پڑھائیں تو اس وقت خاص طریقہ پر ان تفاسیر کو اپنے مطالعہ میں رکھیں، اگر آپ کو خالی اردو کے ترجمہ پر اکتفاء کرنے کی عادت نہ ہو، یا خالی روار وی سے گزر جانے کا مزاج نہ ہو، محنت کرنے کا شوق اور جذبہ اللہ تعالی ہم سب کو عطاء فرمائیں، تو:

آپ اپنے مطالعہ میں تفسیر مدارک کو سب سے مقدم رکھیں۔

علامہ نسفی کی تفسیر مدارک سب سے مقدم رکھیں، نہایت ہی مفید اور نہایت ہی جامع اور مختصر اور مسلک کے اعتبار سے بھی حنفی، اس کو اپنے مطالعہ میں بالالتزام رکھے، اس کے بعد دوسری تفسیر جو آپ کو مزید مباحث کے لئے مفید ہوگی وہ:

تفسیر مظہری ہے، قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی، نہایت عمدہ تفسیر ہے۔

اور ان کی خوبی یہ ہے کہ بیک وقت مفسر بھی ہیں، محدث بھی ہیں، فقیہ بھی ہیں، قاضی بھی ہیں، حنفی بھی ہیں، اس لئے یہ تمام مباحث کو ہر حیثیت سے بیان کرتے ہیں اور قابل اعتماد طریقہ پر بیان کرتے ہیں، اگر آپ کو کسی مسئلہ کے اندر فقہی اختلافات یا فقہی دلائل مطلوب ہوں تو مظہری میں آپ کو مل جائیں گے، حدیث کے اعتبار سے اگر آپ نے کوئی کلام دیکھنا ہے کسی آیت کے ذیل کے اندر کسی مسئلہ میں، تو مظہری میں وہ آپ ملے گا، تفسیری نکات آپ کو تلاش کرنے ہیں تو تفسیر مظہری میں آپ کو وہ ملیں گے، اور پھر یہ کہ آیات کے حل کے لئے بڑے مختصر انداز میں جیسا کہ مدارک کا انداز ہے اختصار کا حل آیات کے سلسلے میں بہت ہی سہولت کے ساتھ آسانی کے ساتھ مختصر انداز میں کلام کردیں گے، اس لئے مظہری نہایت عمدہ تفسیر ہے، یہ دونوں تفسیریں میں نے عرض کیں کہ فن تفسیر پڑھانے والے استاد کو ان سے استغناء نہ ہونا چاہیے۔

(رموز تدریس: ٢٢ تا ٢٥)

درجہ ثانیہ تا درجہ خامسہ ترجمہ و تفسیر پڑھانے کے طریقے

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب

حضرت مفتی صاحب نے جہاں دیگر علمی اور اصلاحی میدانوں میں کام کیا ہے وہاں درس نظامی کی کتابوں کی تدریس کے متعلق بھی ایک بیش بہا مقالہ تحریر فرمایا ہے جو میزان الصرف سے ہدایہ تک طریقہ تدریس پر مشتمل ہے جسے مکتبہ نعمانیہ نے بڑے آب و تاب سے "درس نظامی کی کتابیں کیسے پڑھیں اور پڑھائیں؟" کے نام سے چھاپا تھا لیکن ایک بڑے عرصہ سے یہ مقالہ نایاب ہے اس لئے اس سے حضرت مفتی صاحب کے ارشادات بھی شامل کئے جارہے ہیں، حضرت مفتی صاحب مدظلہ کے اس مقالہ کی ایک خوبی یہ ہے کہ ہر کتاب کا مقصد سمجھا کر استاذ اور طالب علم کے سامنے اس کا ہدف متعین کر لیتے ہیں کہ اس کتاب کے پڑھنے سے استعداد کی اس حد تک پہنچنا ہے چنانچہ پڑھنے اور پڑھانے والوں کے لئے نشان منزل انتہائی آسان ہو جاتا ہے دوسری یہ کہ ہر کتاب کے طریقہ تدریس کی تجزی کر کے نمبر ایک نمبر دو کر کے بات بڑی آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے:

ترجمہ پارۂ عم:

ترجمہ کے اس درجہ میں رکھنے کا مقصد یہ ہے کہ:

(۱) روزمرہ پڑھی جانے والی سورتوں کا بنیادی مفہوم طالب علم کے ذہن نشین ہو جائے۔

(۲) قرآن کریم کی لغات کا ایک معتدبہ ذخیرہ طالب علم کو یاد ہو جائے کیونکہ اس عمر میں یاد کرنا آسان ہوتا ہے۔

(۳) قرآن کریم کا ترجمہ کرنے کا سلیقہ پیدا ہو۔

(۴) نحو صرف کے قواعد کا اجراء ہو۔

لہٰذا اس حصے کی تدریس میں طویل تفسیری مباحث بیان کرنے کے بجائے صرف لغات کی مختصر تحقیق، راجح ترین تفسیر مع شان نزول اور جملوں کی نحوی ترکیب پر اکتفا جائے۔

استاذ کو چاہئے کہ وہ "بیان القرآن" کو مستقل مطالعے میں رکھ کر اس کو اپنا ماخذ بنائے اور تحقیق لغات اور ترکیب کے لئے "روح المعانی" کو ماخذ قرار دے۔

چونکہ ان درجات میں نحوی اور صرفی قواعد کے اجراء کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، اس لئے تدریس کے دوران اس

پہلو کو بطور خاص ملحوظ رکھے اور جس آیت میں کسی نحوی قاعدے کا اجراء ممکن ہو، وہ خود طالب علم سے سوالات کے ذریعے نکلوائے۔

تفسیر درجہ ثالثہ تا درجہ خامسہ:

اس تفسیر کا مقصد یہ ہے کہ قرآن کریم اور اس کی تفسیر اور ترجمہ سے طالب علم کو ایسی مناسبت پیدا ہو کہ وہ رفتہ رفتہ تفسیر سے براہ راست استفادہ کر سکے، لہٰذا ان درجات میں قرآن کریم کے ترجمہ کے علاوہ راجح قول کی بناء پر آیات کا شان نزول ان کی راجح تفسیر، آیات کی وجوہ اعراب اور آیات سے مستنبط ہونے والے احکام و آداب کو اختصار کے ساتھ بیان کیا جائے۔

اساتذہ کو ان درجات میں "تفسیر روح المعانی" "تفسیر مظہری" "تفسیر قرطبی" اور "معارف القرآن" سے بطور خاص استفادہ کرنا چاہئے، درجہ خامسہ میں "تفسیر کبیر" کے منتخب مباحث بھی بیان ہو سکیں تو بہتر ہے۔

(درس نظامی کی کتابیں کیسے پڑھیں اور پڑھائیں؟)

تفسیر اور اصول تفسیر کی تدریس

مولانا اشتیاق احمد صاحب استاذ دار العلوم دیوبند

مولانا نے مذکورہ عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جو ماہنامہ وفاق المدارس شمارہ نمبر ۱۰ شوال المکرم ۱۴۳۴ھ میں شائع ہوا ہے، جس کا آخری حصہ قارئین کے سامنے پیش کیا جارہا ہے، مولانا لکھتے ہیں:

دوسرے مرحلہ میں عام طور سے ہمارے مدارس میں جلالین شریف پڑھائی جاتی ہے اس مرحلہ میں طلبہ ایک حد تک قرآن کریم کے مضامین سے واقف ہوتے ہیں، اس لئے اساتذہ محض آیات کی تفہیمی تقریر نہ کریں، بلکہ پوری توجہ کتاب کے حل پر مرکوز رکھیں، جب کتاب ان کے قابو میں ہوگی تو تفصیل وہ خود ہی کرلیں گے، اس کتاب میں درج ذیل باتوں پر توجہ دی جائے:

(۱) **فوائد قیود:** علامہ سیوطی رحمہ اللہ اور محلی رحمہ اللہ کے بڑھائے ہوئے الفاظ کی وجہ بتائی جائے، کہیں اعراب کی تعیین ہے، کہیں ترجمہ ہے، کہیں محذوف کی وضاحت ہے، کہیں تعلیل ہے، کہیں قراءتِ مشہورہ اور کہیں قراءتِ شاذہ کی وضاحت ہے، کہیں مسلک شافعی کا بیان ہے، کہیں شانِ نزول ہے، کہیں قصہ ہے، اور کہیں ناسخ ومنسوخ کی تعیین ہے۔

غرض یہ کہ جہاں جو بات بیان کی گئی ہے، استاذ کی ذمہ داری ہے کہ اُسے حل کریں اور طالب علم کو مطمئن کریں، جب تک اطمینان نہ ہو سبق نہ پڑھائیں اور طلبہ کو ہر تفسیری اضافہ کی وجہ پوچھنے کی اجازت ہو، ان کے سوال پر ڈانٹا نہ جائے اور نہ الزامی جواب پر اکتفاء کیا جائے، بلکہ استاذ سوال کو سنجیدگی سے سنیں، اگر جواب مستحضر نہ ہو تو بعد میں جواب دینے کا وعدہ کریں اور مطالعہ کریں، اس موقع سے یہ خیال رہے کہ سوال کرنے والے طلبہ میرے علم میں اضافے کا سبب ہیں، ذہین طلبہ کی وجہ سے مطالعہ کی توفیق ہوتی ہے، اور علم میں پختگی حاصل ہوتی ہے، جس طرح ہمارے اساتذہ نے ہمارے ساتھ ہمدردی کی ہے، ہمیں بھی طلبہ کے ساتھ

ویسی ہی ہمدردی کرنی چاہیے، یونیورسٹیوں میں تحقیقی مقالات کی نگرانی کرنے والے پروفیسران کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، اندازہ ہوا کہ وہ طلبہ کی الجھنوں کو نہایت ہی ہمدردی سے دور کرتے ہیں اور تحقیق میں طلبہ کا پورا تعاون کرتے ہیں، بلکہ عملی اشتراک سے بھی دریغ نہیں کرتے۔

(۲) **راجح کی تعیین:** علامہ سیوطی رحمہ اللہ اور محلی رحمہ اللہ نے جس تفسیر کو اختیار کیا ہے وہ ہر جگہ راجح نہیں ہے، کہیں کہیں مرجوح بھی ہے، اس کی تعیین کہ ذمہ داری استاذ کی ہے، انہیں پہلے اکابر علماء کی تفسیریں دیکھنی چاہئیں، پھر بڑی تفسیروں کی طرف رجوع کرنا چاہیے، مثلاً ابن کثیر، روح المعانی، مظہری اور مدارک وغیرہ، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دو یا چند اقوال میں سے ہر ایک درست ہوتے ہیں، ان میں فتوی کی طرح کسی ایک کو ترجیح دینے کی ضرورت نہیں۔

(۳) اگر کوئی عقلی اعتراض ہو تو اس کے لئے تفاسیر کی طرف رجوع کرنا چاہیے، تفسیر کبیر بہت مفید ہے، اکثر عقلی اعتراضات اس میں حل ہوجاتے ہیں۔

(۴) کہیں کہیں جلالین میں اسرائیلیات در آئی ہیں، ان کی نشاندہی بہت ضروری ہے، اس جگہ صحیح تفسیر کرنا استاذ کی ذمہ داری ہے، اکابر علماء کی تفسیر کے ساتھ ابن کثیر کا دیکھنا بہت مفید ہوتا ہے، تفسیر بالروایہ میں ابن کثیر سب سے اہم تفسیر ہے۔

(۵) شروع میں ہی طلبہ کو بتادیا جائے کہ علامہ سیوطی رحمہ اللہ اور محلی رحمہ اللہ دونوں شافعی ہیں، آیات سے اپنے مسلک کے مطابق تفسیر اخذ کرتے ہیں، ان تمام مقامات پر سب سے پہلے شافعی مسلک کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کی جائے اور اگر شوافع کی فقہی کتابیں میسر نہ ہوں تو براہِ راست ان میں مسائل دیکھنے چاہئیں، پھر اپنے مسلک کی کتاب سے مسائل دیکھ کر بیان کئے جائیں، شوافع کے استدلال کا جواب دینا بھی ضروری ہے، ورنہ حنفی طلبہ کے ذہن میں اشکال باقی رہ جائے گا اور یہ بہتر نہیں۔

(۶) جلالین کا حاشیہ بہت عمدہ ہے اور اس کی عمدگی کا اعتراف بہت سے علماء نے کیا ہے، مگر حاشیہ لکھنے والے کون بزرگ ہیں؟ اس کا علم نہیں، انہوں نے محض اخلاص کی بنیاد پر اپنا نام تک

نہیں لکھا، لیکن یہ بات طے ہے کہ وہ مسلکا حنفی ہیں، تفسیر کے بہت سے اشکالات اچھی طرح حل کردیتے ہیں لیکن واقعات میں اسرائیلیات بھی خوب لیتے ہیں، اساتذہ کو ایسے مقامات پر بیدار مغزی سے کام لینا چاہیے، ان کی رو میں خود کو بہانا نہیں چاہیے۔

(۷) جلالین میں قراءات بھی ہیں، قراءتِ مشہورہ کے ساتھ شاذّہ کو بھی ذکر کرتے ہیں، اساتذہ کو ذکر کردہ قراءت کو اچھی طرح تحقیق کر کے طلبہ کو بتانا چاہیے، اس کے لئے حاشیۂ الجمل کافی ہے، اس کے علاوہ السراج المنیر، روح المعانی، مظہری وغیرہ کا دیکھنا بھی مفید ہے، ہر قراءت کے لحاظ سے آیت کی مختصر تفسیر ضرور کردینی چاہیے، بلکہ لکھوادینا زیادہ بہتر ہوتا ہے۔

جلالین میں ایک مشکل یہ ہے کہ وہ قراءت میں ترتیب کا لحاظ نہیں کرتے ہیں، قرآن پاک کے رائج نسخہ میں جو آیت ہے، اس کی قراءت کبھی بعد میں اور دوسری قراءت پہلے لکھ دیتے ہیں، ایسی جگہوں پر طالبِ علم تشویش کا شکار ہوتا ہے، اس لئے اساتذہ کو وضاحت کرنا ضروری ہوجاتا ہے۔

جلالین میں ہر جگہ لہجات کو بیان نہیں کرتے ہیں مگر جہاں دو ہمزہ جمع ہوجائیں ان کے لہجات ضرور لکھتے ہیں، ایسی جگہوں میں اساتذہ اگر قراءتِ سبعہ نہ پڑھے ہوں تو کوئی حرج نہیں، کسی جید قاری سے ادائیگی سیکھ لیں، پھر ادا کریں، محض عبارت دیکھ کر الٹا سیدھا ادا نہ کریں، یہ شرعاً جائز نہیں ہے۔

(۸) ناسخ ومنسوخ کے بارے میں طلبہ کے ذہن میں شروع سے ہی یہ بات بٹھا دینا ضروری ہے کہ قرآنِ پاک کی کوئی آیت منسوخ نہیں ہے، پورا قرآن مجید محکم ہے، اپنے بزرگوں میں سے حضرت مولانا عبدالصمد رحمانی رحمہ اللہ کا یہی موقف ہے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ کا رجحان بھی یہی ہے، حضرت مولانا عبیداللہ سندھی رحمہ اللہ کی عبارت سے سمجھ میں آتا ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ اگر ایک لخت کہہ دیتے کہ کوئی آیت منسوخ نہیں، تو لوگ نہ مانتے، اس لئے شاہ صاحب قارئین کو تدریجا اس نظریہ تک لے جانا چاہتے ہیں کہ موجودہ قرآن میں

کوئی آیت منسوخ نہیں ہے۔(الخیرالکثیر:۶۵۷)
الفوز الکبیر کی شرح میں حضرت مفتی سعید احمد پالن پور صاحب شیخ الحدیث وصدر المدرسین دار العلوم دیوبند نے آیات قرآنی کے محکم اور غیر منسوخ ہونے والے موقف کو اختیار فرمایا ہے، حضرت مفتی محمد امین صاحب استاذ حدیث دار العلوم دیوبند نے بھی "الخیر الکثیر" میں اسی موقف کی تائید کی ہے اور جن آیتوں کو علماء نے منسوخ کہا ہے، ان سب کی ایسی واضح تفسیر کی ہے جس سے منسوخ نہ ہونے کا یقین ہوجاتا ہے۔
علامہ سیوطی رحمہ اللہ کے نزدیک اگرچہ اکیس آیتیں منسوخ ہیں مگر جلالین میں ڈھیر ساری آیتوں کو منسوخ بتایا ہے، شاید متقدمین کے نظریہ کے مطابق ایسا کیا ہے، اس لئے پہلے اساتذہ نسخ کی بحث سمجھادیں، متقدمین اور متاخرین کی اصطلاح کا فرق بھی بتادیں اور ان جگہوں میں ایسی تفسیر کریں کہ طلبہ کا اشکال دور ہوجائے۔

(۹) اسی مرحلہ میں یہ بھی بتادینا ضروری ہے کہ ہر آیت کا شانِ نزول ضروری نہیں، صرف انہیں آیتوں کا شانِ نزول جاننا ضروری ہے جہاں بغیر شانِ نزول کے آیت کا سمجھنا مشکل ہو، مثلاً غزوۂ بدر وغیرہ کی آیات۔(انفال:۴۲)۔

جلالین کے لئے معاون کتابیں:

تذکیری آیات کی تدریس قرآنِ پاک کے ترجمے اور اس کی تفسیریں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کو شمار نہیں کیا جاسکتا، ساری تفسیروں کا مطالعہ ممکن نہیں، جب دارالعلوم حیدر آباد میں راقم الحروف سے کتابیں متعلق ہوئیں تو جلالین شریف کے علاوہ کوئی کتاب ایسی نہیں تھی جس میں جی لگتا، میں نے مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری زید مجدہ کو فون پر بتایا کہ ساری کتابیں اول، دوم اور سوم کی ہیں، صرف ایک جلالین مطالعہ کے لائق ہے، میں کیا کروں؟ جی نہیں لگ رہا ہے، حضرت نے برجستہ فرمایا کہ یہ تو بہت اچھا موقع ہے کہ قرآن مجید سے مناسبت پیدا ہوجائے گی اور یہ بہت بڑی نعمت ہے، تم اس کی متعلقات کتب خانہ سے نکال کر ذوق وشوق سے مطالعہ شروع کردو، جی لگنے لگے گا، میں کتب خانہ گیا اور ترسٹھ کتابیں نکال لایا، وہاں

کسی سے کوئی تعلق نہیں تھا، کمرے میں بیٹھا پڑھتا رہتا تھا، مختلف ذوق رکھنے والے مفسرین کی کتابیں دیکھتا تھا لیکن ہدایت کے مطابق طلبہ کے لئے باتیں ترتیب دے کر جاتا، عبارت سے متعلق ضروری باتیں ہی بیان کرتا تھا، اس طرح ذی الحجہ کا مہینہ آگیا اور دیوبند آنا ہوا، یہاں حضرت مفتی صاحب سے پوچھا کہ تفسیر کی کتابیں تو بے شمار ہیں مجھے جلالین کے لئے کون کون سی کتابیں دیکھنی چاہیے؟ فرمایا: "حاشیۃ الجمل" سے "جلالین" حل کیا کرو، پھر اپنے کسی بزرگ کی تفسیر دیکھ لیا کرو، اتنا کافی ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ جلالین کی مشکلات حاشیۃ الجمل میں حل ہوجاتی ہیں، صاوی بھی جمل کے شاگرد ہیں، اس میں جمل کا اختصار ہے، بار بار کے مقابلے سے میں نے یہ سمجھا ہے، کہا جاتا ہے کہ صاوی بدعتی ہیں، ان کے حوالے سے متعدد بدعات کتابوں میں ذکر کی گئی ہیں، راقم الحروف ان کے ساتھ علامہ شوکانی کی فتح القدیر، زمخشری کی کشاف اور خطیب کی سراج منیر کے ساتھ خازن اور مدارک بھی دیکھتا تھا، اور استفادہ کرتا تھا، قرآن مجید کے اردو تراجم میں جتنے تراجم میسر ہوئے سب کو اس لئے دیکھا کہ ایک تقابلی نظر ہوجائے، اس دوران بہت سوں سے عقیدت بڑھی اور بہت سوں سے بدگمان ہوگیا۔

جلالین کے لئے اردو شروحات دیکھنے کی نوبت نہیں آئی، البتہ دو تین مرتبہ مشکل مقام پر "کمالین" کو اٹھایا، اتفاق سے دو جگہ ترجمہ بھی نہیں کیا گیا تھا، اور ایک جگہ ترجمہ تو تھا مگر اس سے عبارت حل ہوتی ہوئی نظر نہ آئی، اس کے بعد سے کبھی نہ دیکھا، جمالین اس وقت طبع ہوئی جب چار پانچ سال جلالین پڑھا چکا تھا، اس سے استفادہ کا موقع نہیں ملا، البتہ ایک بار تعارف لکھنے کے لئے دیکھا بہ ظاہر اچھی شرح معلوم ہوتی ہے، ایسا لگتا ہے کہ شارح نے کتاب کے حل کرنے میں بڑی عرق ریزی کی ہے۔

تفسیر کی منتخب کتابیں:

حضرت مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی نے عربی تفاسیر کی پانچ کتابوں کے بارے میں لکھا ہے کہ اگر کوئی ان کو دیکھ لے تو انشاء اللہ کسی اور کے دیکھنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی، وہ کتابیں درج ذیل ہیں:

۱۔ تفسیر ابن کثیر۔ ۲۔ تفسیر کبیر۔ ۳۔ تفسیر ابی السعود۔
۴۔ تفسیر قرطبی۔ ۵۔ روح المعانی۔

ابن کثیر تفسیر بالروایہ میں لاجواب ہے، یہ احادیث صحیحہ، ضعیفہ اور موضوعہ کی تعیین کردیتے ہیں، اسرائیلیات میں بہت محتاط ہیں۔

تفسیر کبیر میں امام رازی رحمہ اللہ نے نہایت ہی بسط وتفصیل سے کلام کیا ہے، اس میں احکام شرعیہ کا بیان ہے، فرقِ باطلہ کی تردید ہے، ربط آیات کی بھی نہایت ہی بے تکلف بیان فرماتے ہیں، اس تفسیر میں تفسیری اشکالات حل ہوجاتے ہیں، ہاں! یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اس میں رطب ویابس روایات بھی خوب ہیں، چوں کہ واعظ تھے اس لئے روایات میں غضِّ بصر سے کام لیا ہے۔

تفسیر أبي السعود کے مطالعہ کی رہنمائی مجھ کو حضرت الاستاذ مولانا حبیب الرحمن اعظمی مدظلہ استاذ حدیث ومدیر ماہنامہ دار العلوم دیوبند نے کی، یہ تفسیر بھی نہایت عمدہ ہے، مختصر ہے، اس میں ربط آیات، فقہی احکام، ادب اور بلاغت بہت سی چیزیں قارئین کے لئے کشش کا باعث ہیں۔

تفسیر قرطبی بھی کافی عمدہ ہے، اس میں روزہ مرہ کی ہدایات، تذکیری آیات پر کافی تفصیلی گفتگو ملتی ہے، مشکل الفاظ کو حل کیا ہے، اعراب کی تعیین بھی کی ہے۔

روح المعاني کے لئے بس اتنا کہنا کافی ہے کہ اس میں متقدمین کی جملہ تفاسیر کا عطر اکٹھا کیا گیا ہے، اسلامی کتب خانوں میں اس سے عمدہ تفسیر موجود نہیں، لغت، نحو، صرف، قراءت، بلاغت، فقہ، عقائد، فلسفہ، ہیئت اور تصوف ہر چیز کو بیان کیا ہے، روایات میں بہت محتاط ہیں، بعد کے سارے مفسرین ان کے خوشہ چین ہیں۔

اصول تفسیر کی تدریس:

اصول تفسیر میں تفسیر قرآن سے متعلق قواعد اور قوانین بیان کئے جاتے ہیں، اس موضوع کی دو کتابیں ہمارے یہاں داخل نصاب ہیں:

(۱) الفوز الکبیر۔ (۲) مناہل العرفان۔

الحمد للہ! دونوں کتابوں کو کئی بار پڑھانے کا موقع ملا، الفوز الکبیر بڑی مفید کتاب ہے، اس میں فہم قرآن میں پیش آنے والے مشکلات کو نہایت ہی اچھے انداز سے حل کیا گیا ہے، مختصر سی کتاب میں اتنے اصول وضوابط بیان کیے گئے ہیں کہ کوئی اور کتاب اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی، بقول حضرت مولانا ابو الحسن علی ندوی رحمہ اللہ:

"یہ ایک قیمتی اور نادر بیاض ہے، اس کی قدر وہی لوگ جان سکتے ہیں، جن کو ان مشکلات سے واسطہ پڑا ہو، بعض بعض اصول جو شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اپنے ذوق ووجدان اور فہم قرآن کی بناء پر لکھ دیئے ہیں، دوسری کتابوں کے سینکڑوں صفحات کے مطالعہ سے بھی حاصل نہیں ہوسکتے"۔ (الفرقان بریلی شاہ ولی اللہ صاحب نمبر ص:۳۳۱)

—— الفوز الکبیر کو سرسری طور پر نہ پڑھایا جائے، کسی بھی اصول کی کتاب کو سرسری طور پر پڑھانا فائدہ مند نہیں ہوتا، اہم ترین کام ان اصولوں کا اجراء ہے، اس میں سب سے بنیادی چیز قرآنی آیات زُمرہ بندی ہے، شاہ صاحب رحمہ اللہ نے پانچ قسموں میں زُمرہ بندی کی ہے:

(۱) احکام۔ (۲) جدل۔ (۳) تذکیر نعمت۔

(۴) تذکیر واقعات۔ (۵) تذکیر موت وآخرت۔

الفوز الکبیر اور جلالین ایک استاذ سے متعلق ہونی چاہیے، اس کے بغیر فائدہ کم ہوگا، جب الفوز الکبیر ختم ہوجائے اور جلالین شروع ہو تو استاذ نشاندہی کریں کہ یہ فلاں قسم کی آیت ہے اور یہ فلاں قسم کی، پھر اس کے مطابق تشریح کریں، مثلاً احکام کی آیت میں بتائیں کہ اس میں یہ حکم بیان ہوا ہے، اس کا اتنا جزء قرآن میں ہے، اتنا حدیث اور اجماع وغیرہ۔

جدل کی آیتوں میں بھی بتائے کہ مشرکین، منافقین، یہود ونصاریٰ کی فلاں خرابی اس جگہ ہے اور فلاں خرابی یہاں، ان کے استدلال کا اسلوب قرآن نے کیا اختیار کیا ہے؟۔

الفوز الکبیر میں اسباب نزول کی بحث بھی بہت اہم ہے، اس کو تھوڑا تھوڑا نہایت ہی امعان وگہرائی سے پڑھانا ضروری ہے، بہتر یہ ہے کہ ہر فصل کے بعد طلبہ کا آموختہ سنا جائے اور ان سے سوالات کئے جائیں تاکہ اندازہ ہوجائے کہ انہوں نے اچھی طرح سمجھا ہے یا نہیں۔

الفوز الکبیر کے بعد تخصص فی التفسیر میں مناھل العرفان پڑھائی جاتی ہے، یہ علامہ محمد عبدالعظیم زرقانی رحمہ اللہ کے محاضرات کا مجموعہ ہے، جو انہوں نے جامع ازہر میں طلبہ کے سامنے پیش کئے ہیں، یہ درسی کتاب کی طرح نہیں ہے، طولِ بیانی بہت زیادہ ہے، کبھی کبھی پڑھتے پڑھتے طبیعت اکتا جاتی ہے، مگر بہت مفید ہے، اس کے تین مباحث دار العلوم دیوبند میں پڑھائے جاتے ہیں، اس کتاب کو اگر اساتذہ سبقا سبقا نہ پڑھائیں بلکہ طالب علم خود پڑھے اور ہر مبحث کا خلاصہ لکھے اور پھر ان کو اپنی زبان سے بیان کرے تو اس کا فائدہ دوچند ہوسکتا ہے، اصولِ تفسیر پڑھانے والے اساتذہ کو الاتقان، البرھان، اور التبیان وغیرہ کو مطالعہ میں رکھنا چاہیے۔(ماہنامہ دفاق المدارس شوال ۱۴۳۳ھ)

(۲)

کتب احادیث مبارکہ

علی صاحبھا الصّلوات والتّسلیمات

کا انداز تدریس

احادیث مبارکہ کا انداز تدریس

استاذ محترم حضرت مولانا مفتی عبدالرؤف غزنوی صاحب دامت برکاتہم نے بمورخہ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۳ء کو بمقام مدرسہ عثمانیہ بہادر آباد کراچی ایک بہت ہی پر مغز اور قیمتی محاضرہ دیا جس میں انہوں نے احادیث مبارکہ پڑھانے کے اصول وآداب بیان فرمائے، پورا بیان "رموز تدریس" نامی کتاب میں چھپا ہوا ہے، اس کا ضرور مطالعہ کیا جائے، ان باتوں میں سے چار باتیں جو تدریس ہی سے متعلق ہیں نقل کی جاتی ہے جو وہاں چوتھی بات کے عنوان سے شروع ہوتی ہیں:

پہلی بات: حسن تدریس:

یعنی تدریس کے لئے بہت اچھے طریقے سے تیاری کرنا اور اچھی طرح ترتیب سے پڑھانا میں جب دارالعلوم دیوبند میں پہلی ہی بار اکابرین کے حکم سے تدریس پر مامور ہوا تو حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالنپوری جو کہ میرے استاذ ہیں اور الحمد للہ بقید حیات ہیں، تو میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ حضرت کچھ فرمادیجئے، پڑھانے کا سلسلہ ہے اکابرین کے حکم سے، اور میں نے طالبعلمی کے زمانہ میں جو تکرار کراتے ہیں وہ بھی کبھی نہیں کرایا، تو حضرت کچھ پڑھانے سے متعلق راہنمائی فرمادیجئے، حضرت نے بہت سی باتیں بتائیں منجملہ ان کے ایک بات یہ بھی تھی کہ:

جو آپ پڑھائینگے آپ مطالعہ کرکے صرف فہم پر اکتفاء نہ کیجئے، کہ آپ نے وہ سبق سمجھ لیا، اچھی طرح شروحات بھی دیکھ لیں اور جو کچھ اعتراضات وغیرہ ہیں وہ بھی سمجھ چکے اور ان کے جوابات بھی سمجھ میں آگئے اور کوئی اشکال باقی نہیں رہا بلکہ اس مرحلہ کے بعد دوسرا مرحلہ ہے، اپنے ذہن میں ان کو ترتیب دے کر طلبہ جو خالی الذہن ہوں ان کے ذہن کو سامنے رکھ کر ترقیم من الأدنى إلى الأعلى کے طرز پر چلنا ہے یعنی فہم پر اکتفاء نہیں کرنا بلکہ تفہیم کی طرف آنا ہے، یعنی طلبہ کو کہاں سے بات شروع کرکے بتاؤں۔

تو یہ ضروری ہے پڑھانے والے کے لئے خصوصا حدیث پڑھانے والے کے لئے، جب وہ تیاری

کرلے، مطالعہ کرلے دوسرے نمبر پر وہ تمام باتیں کتاب بالکل بند کرکے۔باتیں تو اُن کو یاد ہیں۔ان کو ترتیب دیدیں اور اس کام میں شروع میں تووقت کچھ زیادہ لگتا ہے لیکن بعد میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا تعاون ہوتاہے کہ بہت ہی کم وقت میں آدمی اپنے سبق کو ایسی ترتیب دیدیتاہے، کہ مجھے کہاں سے بات شروع کرنی ہے، کس بات کو پہلے ذکر کرنا ہے کس بات کو بعد میں ذکر کرنا ہے اور کس انداز سے بات کرنی ہے، تاکہ طلبہ کے سامنے اچھے طریقہ سے مقصود واضح ہوجائے کیونکہ وہ خالی الذہن ہوتے ہیں، اس کو کہیں گے حسن تدریس۔

دوسری بات: احادیث کے درمیان تطبیق کرنا:

حدیث پڑھانے والے کے لئے ہر مسئلہ سے متعلق جو احادیث ہوں ان کے درمیان تطبیق کی کوشش کرنی چاہئے، اور دوسری تعبیر یہ ہے کہ ترجیح سے زیادہ تطبیق پر محنت کرنی چاہیے، اور اگر میں یہ عرض کروں کہ یہ دیوبندیت کی خصوصیت ہے اور دیوبندیت کے معنی ہے حنفی مذہب کی صحیح ترجمانی، دارالعلوم دیوبند کے اکابرین کی خصوصیت یہ ہے کہ جس مسئلہ میں جو حدیث یا احادیث ہوں تو وہ صرف بخاری یا مسلم کی حدیثوں پر اکتفاء نہیں کرتے بلکہ اس مسئلہ کے متعلق جتنی حدیثیں جس کتاب میں بھی ہوں ان سب کو سامنے رکھ کر ان میں جو اعلیٰ درجہ کی صحیح ہیں ان کو بھی سامنے رکھتے ہیں، جو صحت میں ان کے بعد کے درجے کی ہیں ان کو بھی سامنے رکھتے ہیں حسن کو بھی سامنے رکھتے ہیں، لذاتہ ہو یا لغیرہ ہو، ہاں جو بالکل ایسی ضعیف ہوں جو کہ فضائل اعمال میں بھی قابل استدلال نہ ہوں صرف ان کو تو چھوڑ دیتے ہیں، جو کہیں بھی کارآمد ہوں ایسی تمام حدیثوں کو سامنے رکھتے ہیں، اور کوشش یہ کرتے ہیں کہ ترجیح کے بجائے تطبیق دیں اور یہ حنفیت کی خصوصیت ہے اور حنفیت کی صحیح ترجمانی دیوبندیت کی خصوصیت ہے، کیونکہ ہمارے اکابر ہمیشہ ترجیح سے زیادہ تطبیق کی کوشش کرتے ہیں۔

ذرا غور فرمایئے!

ایک حدیث جو صحیحین میں موجود نہیں ہے دوسری کتابوں میں موجود ہے اور صحیح اگرچہ نہیں ہے حسن ہے، آپ خود کہتے ہیں کہ دوسرے مسائل میں تو وہ قابل اعتبار ہے اور یہاں پر آپ نے

چھوڑدیا، کیوں چھوڑا؟ آپ کوشش کریں کہ اس پر بھی عمل ہو، دوسرے حضرات کے مقابلے میں احناف کو جو اللہ تعالیٰ نے مقام دیا ہے اس کی ایک وجہ یہی ہے کہ وہ کوشش یہی کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام حدیثوں پر عمل ہوجائے، اور اس کے لئے مدرس کے لئے ضروری ہے کہ جو ان کے زیردرس کتاب ہے صرف اس پر اکتفاء نہ کریں، اس موضوع سے متعلق باقی جو حدیث کی کتابیں ہوں ان کو ضرور سامنے رکھیں اور کسی نتیجہ پر پہنچ جائیں۔

اس سے متعلق ایک مثال اس وقت میرے ذہن میں آئی، وہ میں عرض کردیتا ہوں تاکہ یہ بات بالکل واضح ہوجائے کہ حضرات دیوبند جو کہ ترجمان ہیں احناف کے وہ کس طرح ترجیح کے بجائے تطبیق پر عمل کرتے ہیں:

مثال کے طور پر فجر کے وقت کا مسئلہ ہے، فجر کی نماز کس وقت پڑھی جائے؟ بخاری شریف اور مسلم شریف میں غلس سے متعلق احادیث میں امام بخاری نے تو ابواب بھی منعقد کئے ہیں اور حدیثیں بھی ہیں، مسلم میں بھی حدیثیں ہیں اور بخاری میں بھی ہیں، کہ فجر کی نماز کا صحیح وقت غلس ہے اور دیگر ائمہ نے اس کو اختیار بھی کیاہیں، احناف نے اس مسئلہ سے متعلق تمام احادیث کو سامنے رکھا کہ صرف بخاری اور مسلم میں اسفار کا ذکر نہیں ہے لیکن ترمذی وغیرہ میں اسفار کی حدیث موجود ہے، أسفروا بالفجر؛ فإنّه أعظم للأجر۔

یہ حدیث ترمذی میں صفحہ ۴۰ جلد اول پر موجود ہے، امام ترمذی نے آگے یہ بھی فرمایا ہے هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ، ابو داؤد میں بھی موجود ہے، غالباً صفحہ ۶۴ پر ہے، نسائی میں بھی موجود ہے، صحیح ابن حبان میں بھی موجود ہے، طبرانی میں بھی موجود ہے، دارمی میں بھی موجود ہے، اور ترمذی کا فیصلہ میں نے سنادیا: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ، تو کیا اس کو اس وجہ سے بالکل نظرانداز کر دیا جائے کہ یہ حدیث بخاری میں موجود نہیں اور ترجیح بخاری کی حدیث کو دی جائے، کہ بخاری میں جو ہے وہ زیادہ قوی ہے، یا اگر تطبیق کی صورت بن جائے وہ زیادہ بہتر ہے؟ تاکہ دونوں پر عمل ہو تو ہمارے اکابرین کہتے ہیں کہ دونوں پر عمل ہو، غلس والی پر بھی اور اس پر بھی، کس طرح؟

انہوں نے مافي الباب بلکہ ما في الأبواب احادیث کو سامنے رکھ کر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جماعت کی نماز میں ایک اہم چیز تکثیر جماعت ہے، ویسے تو ہر ہر عمل میں تکثیر بہتر ہے لیکن جماعت کی نماز میں شریعت نے اس کا خیال رکھا ہے کہ تکثیر جماعت کی رعایت ہونی چاہیے، تو اب تکثیر جماعت غلس میں ہے یا اسفار میں ہے؟ تو دیکھنا چاہئے کہ جس میں تکثیر جماعت ہو، جس میں لوگ زیادہ آسکیں اسی پر عمل ہونا چاہئے، اگر غلس میں لوگ زیادہ آسکتے ہیں تو نماز غلس میں پڑھنی چاہئے، اور اگر اسفار میں زیادہ ہوں تو اسفار میں پڑھنی چاہئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تقریبا سو فیصد لوگ تہجد گزار تھے تہجد پڑھنے والے کے لئے آسانی یہی ہے کہ نماز غلس میں پڑھی جائے تاکہ سب لوگ شریک ہوسکے، انتظار کی صورت میں نیند کا غلبہ ہوسکتا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل اور صحابہ کا عمل یہی غلس کا تھا، یہ جو تاویل ہے کہ غلس میں شروع کرنا اسفار میں ختم کرنا یا پھر اور عجیب عجیب تاویلیں بعض حضرات کرتے ہیں کہ مسجد میں کیونکہ چھت ذرا نیچے تھی لوگ نظر نہیں آرہے تھے یہ تمام تاویلیں بے جاں ہیں، اس لئے کہ غلس کا جو ذکر ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز ختم ہونے کے بعد ہی غلس کا ذکر ہے، تو کیونکہ تکثیر جماعت اسی میں تھی تو اسی پر عمل ہونا چاہیے تھا۔

ہمارے اکابرین نے یہی کہا ہے کہ اگر کوئی ایسی صورت حال بن جائے تو غلس ہی میں پڑھنا بہتر ہے اور وہ حدیث اسی حالت پر محمول ہے، چنانچہ رمضان المبارک میں آٹومیٹک صحابہ کا دور بن جاتا ہے، البتہ وہ تہجد کے لئے اٹھتے تھے، ہم کھانے کے لئے اٹھتے ہیں لیکن صورت وہی بن جاتی ہے تو ہر آدمی کے لئے آسانی اسی میں ہے کیونکہ تکثیر جماعت اس میں ہے کہ شروع میں نماز پڑھی جائے تو ہمارے ہی اکابرین کا رمضان میں غلس پر عمل ہے، اگر غلس والی حدیث پر وہ عمل نہ کرتے تو رمضان المبارک میں بھی غلس میں نماز نہ پڑھتے اور اسفار کا انتظار کرتے، اور اگر وہ صورتحال نہ ہو جیسے کہ تہجد میں نہ اٹھنے کی عام حالت آج کل ہے تو ایسی صورت میں تکثیر جماعت اسفار میں ہے، اسفار والی حدیث پر بھی عمل ہوجائے اور اگلا حصہ اس کی دلیل ہے: فإنه أعظم للأجر، اور أعظم للأجر اسی وجہ سے کہ جتنی تکثیر جماعت ہو اتنا ہی زیادہ ثواب ہے۔

یہ میں نے ایک مثال پیش کی، حاصل اس کا یہی ہے کہ ہمارے اکابرین کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ مافی الباب جتنی احادیث ہیں ان کے درمیان تطبیق کی صورت ہو بجائے ترجیح کے، یہ ایک مثال میں نے پیش کی ایسی بیشمار مثالیں اور بھی ہیں۔

تیسری بات: مقدار سبق میں اعتدال:

حدیث پڑھانے والے کو ابتداء، وسط اور انتہاء کا خیال رکھنا چاہئے، اپنی کتاب کو سامنے رکھ کر پہلے ہی یہ طے کرلینا چاہئے، کہ مجھے کس طرح کتنی مقدار پڑھانی ہے، ہمارے ہاں جو ایک بہت ہی پریشان کن مسئلہ ہے، آپ حضرات جانتے ہیں اور شیخ ابوغدہ علیہ الرحمۃ..... جس وقت میں ان کے پاس پڑھتا تھا اس وقت کی بات نہیں ہے، اس کے بعد دوبارہ ایک مرتبہ گیا تھا اور میری آخری ملاقات حضرت شیخ سے ہوئی ریاض میں ان کے گھر پر، وہ تاریخ بھی میرے پاس درج ہے ڈائری میں، حضرت سے چونکہ میں نے پڑھا تھا تو میں نے حدیث کی اجازت طلب کی، تو حضرت نے تحریری طور پر لکھ دی اور ایک زبانی نصیحت ہی تاکید سے کی، فرمایا کہ:

مجھے اس سے سخت تکلیف ہے کہ برصغیر کے مدارس میں ایک عادت ہے کہ سال کے شروع میں بہت زیادہ لمبی تقریریں کرتے ہیں اور سال کے آخر میں حدیثوں کو اس طرح پڑھاتے ہیں کہ اس کی تلاوت بھی صحیح ادائیگی کے ساتھ نہیں ہوتی، فرمایا کہ مجھے کسی طریقے سے بھی یہ پسند نہیں ہے کہ احادیث کو اس طرح پڑھا جائے۔

تو حدیث پڑھانے والے کو اس کا خیال رکھنا چاہئے کہ شروع سے اس انداز سے چلے کہ اخیر تک اعتدال باقی رہے، یہ بات ٹھیک ہے کہ نصاب بہت زیادہ ہے لیکن اگر استاد پابندی سے اور اعتدال کو مدنظر رکھ کر پڑھائیں تو نصاب بھی مکمل ہوسکتا ہے اور افہام وتفہیم میں بھی آسانی ہوسکتی ہے، بہر صورت یہ موجودہ طریقہ کہ سال کے شروع میں تو بہت ہی لمبی تقریر ہو اور سال کے آخر میں احادیث کی اس طرح تلاوت ہو کہ تلاوت بھی صحیح طریقے سے نہ ہو پائے، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے ساتھ واقعی ناانصافی ہے، اس لئے اس پر غور کرنا چاہیے اور ایک صحیح مقدار کو لے کر چلنا چاہیے۔

چوتھی بات: اکابرین کا احترام:

حدیث پڑھانے والے استاذ مختلف ائمہ کرام کے مذاہب وآراء اور ان کی دلائل بیان کرتے رہتے ہیں اور مذہب راجح کی طرف سے باقی ائمہ کے جوابات بھی بیان کرتے رہتے ہیں یہاں پر شیطان آکر۔شیطان تو ہر جگہ کام کرتا ہے۔خدانخواستہ کسی کی زبان سے کوئی ایسی بات نکلوا دے کہ جو ہمارے ائمہ کی شان میں گستاخی یا بے ادبی کی بات ہو،یہ علم کے لئے اور طلبہ کے لئے نہایت خطرناک ہے، طلبہ کے اندر استاذ کی باتیں خودبخود منتقل ہوتی ہیں، جب وہ دیکھ لیتے ہیں کہ یہ اساتذہ امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ کے بارے میں یہ کہتے ہیں تو وہ بے ادبی اور اکابرین کی شان میں گستاخی کے خود بخود عادی بن جاتے ہیں۔

اس پر حضرت گنگوہی علیہ الرحمۃ کا بھی ایک واقعہ ہے اور میں نے اپنے اساتذہ کرام سے شیخ الہند کے بارے میں بھی سنا ہے کہ ایک مرتبہ وہ پڑھا رہے تھے تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے دلائل بیان کئے، تو طالبعلموں میں سے کسی نے یہ کہا کہ حضرت آپ نے ایسے دلائل بیان کئے ہیں کہ اگر امام شافعی رحمہ اللہ زندہ ہوتے تو شاید وہ رجوع فرمالیتے، اپنی بات سے یا اپنے مذہب سے، تو حضرت کو بہت سخت ناگوار ہوا، شیخ الہند کے بارے میں تو میں نے حضرت مفتی سعید احمد پالنپوری مدظلہ سے یہ سنا جو حضرت شیخ الہند کا حوالہ دے رہے تھے کہ وہ کتاب بند کرکے زیادہ غصے کی وجہ سے گھر چلے گئے اور پھر اگلے دن جو آئے تو اس مسئلے میں امام شافعی رحمہ اللہ کی طرف سے اسی مسئلہ میں ایسے دلائل بیان کئے کہ سب حیران رہ گئے، اور پھر فرمایا: تمہیں ان ائمہ کا پتہ نہیں، انہوں نے کتنی قربانیاں دیں، اللہ کے ہاں ان کا کتنا بڑا مقام ہوگا، اگر یہ زندہ ہوتے تو مجھ جیسا آدمی ان کے سامنے بات کرتا؟ میں تو ان کے پاؤں کی خاک کے برابر بھی نہ ہوتا، اگر وہ زندہ ہوتے تو میں بھی ان کا مقلد ہوتا۔

جو دلائل ہمارے اکابرین نے بیان کئے وہ تو بیان کرنے چاہئیں لیکن ائمہ کی شان میں اور اکابرین کی شان میں کوئی ایسا جملہ نہ کہنا چاہئے جو خدانخواستہ پڑھانے والے کے لئے علم کی محرومی کا سبب ہو،یا جو سننے والے طلبہ جو کہ خالی الذہن ہیں ان کی تربیت پر اس سے غلط اثر پڑے۔(رموز تدریس ص ۵۳ تا ۵۸)

دور حاضر کے تدریس حدیث پر تبصرہ

اور کچھ مفید رائے

مفتی غلام الرحمن صاحب دامت برکاتہم

ہم جس خطہ میں رہتے ہیں اس کے معروضی حالات کی وجہ سے ہمارے ہاں علوم حدیث کا طرزِتدریس منفرد ہے، شاید پاکستان نہیں بلکہ ہندوستان، بنگلہ دیش اور افغانستان میں احادیث کی تدریس میں یکسانیت پائی جاتی ہو، یعنی حدیث پڑھاتے وقت فقہی اندازِبیان کا غلبہ رہتا ہے، ایک مسئلہ جب فقہاء کے ما بین اختلافی ہو تو متعلقہ روایت خواہ اپنے مذہب کی مؤید ہو یا دوسرے مذہب کے لئے ترجیحی اسباب مہیا کرتی ہو، اس روایت پر پہنچ کر استاذ بحث کو طویل سے طویل تر بنانے کی کوشش کرتا ہے، چنانچہ طہارت کے مسائل کی بحث میں مہینے گزر جاتے ہیں، قدیم دور سے مدارس کا ماحول یوں بنا ہے کہ طلبہ بھی یہ چاہتے ہیں کہ مسائل پر بحث ہو اور جو استاذ لمبی بحث نہ کرے تو طلبہ کے ہاں وہ اپنی اہمیت کھو بیٹھتا ہے، چنانچہ بسا اوقات ایک مسئلہ ابوداؤد اور ترمذی شریف دونوں میں لمبی مدت تک زیر بحث رہتا ہے، جو تکرار کے سوا اور کچھ نہیں، پھر بخاری شریف میں اس مسئلہ پر پہنچ کر بخاری کے مزاج کے مطابق کچھ کہنا ضروری ہوتا ہے، کیونکہ بخاری کا کوئی ترجمۃالباب کسی دوسری کتاب کی بحث پر حل نہیں ہوسکتا، یوں ایک مسئلہ بار بار طلبہ کے سامنے بیان کیا جاتا ہے۔

اس کا نقصان یہ ہے کہ اس پر طلبہ کا زیادہ وقت صرف ہوتا ہے۔

اور دوسرا نقصان یہ ہوتا ہے کہ استاذ کے اندازِبیاں سے دوسرے مذاہب کے بارے میں تعصب کا مزاج پیدا ہوتا ہے کیونکہ ایک حدیث کے تذکرہ میں جب امام صاحب کی رائے حدیث سے متصادم نظر آتی ہے تو لازمی طور پر طلبہ کے ذہن میں ردعمل پیدا ہوتا ہے، پھر ہر استاذ یہ اپنا فریضہ سمجھتا ہے کہ وہ

دوسرے مذاہب کے ابطال اور اپنے مذہب کے احقاق میں ایڑھی کا زور لگائے، اس سے ذہن میں نفرت آمیز جذبہ کی آبیاری ہوتی ہے اور طالب علم سمجھتا ہے کہ حقانیت ہم تک محدود ہے، ہمارے علاوہ سب بے بنیاد نظریہ کے داعی ہیں، اگر معاشرتی طور پر کبھی کسی دوسرے مذہب میں کسی مسئلے کا حل موجود بھی ہو تو کوئی اس کے لئے تیار نہیں کہ وہ کسی دوسرے مذہب کو قابل عمل بنانے کی کوشش کرے، نیز ان فقہی مسائل میں الجھ کر حدیث کے اصل مباحث پر بولنے کا موقع نہیں ملتا۔

میرے خیال میں یہ انداز تدریس ہم پر معروضی حالات کی وجہ سے مجبوراً مسلط کیا گیا ہے، ہمیں اپنے معاشرہ میں لامذہبیہ (غیر مقلدین) سے واسطہ پڑا، وہ ظاہر بینی کی وجہ سے حدیث کی تہہ تک نہ پہنچ سکے تو مقلدین کے خلاف ایک مذموم پروپیگنڈہ کے داعی ثابت ہوئے، وہ اشتہار چھپوا کر لوگوں کو متنفر کرانے کے لئے چیختے ہیں کہ جو مقتدی امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں ہوتی، تراویح میں بیس کا اہتمام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں، وتر تین رکعات ایک سلام سے پڑھنا شریعت کا مزاج نہیں اور پھر وہ وقت بھی آیا کہ ان جزوی مسائل میں علماء نے مناظرے کئے، اور ایک دوسرے کو چیلنج کیا، ظاہر ہے کہ ایسی پرتشدد فضا میں اس کا ردعمل شدید سامنے آیا؟ کیونکہ یہ ضروری رہا کہ مقلد یہ ثابت کرے کہ میری نماز درست ہے اور یہ حدیث سے ثابت ہے اس مجادلہ کی وجہ سے بحثیں طول پکڑ گئیں اور نتیجہ یہ رہا کہ حدیث کے درس پر فقہ کا رنگ غالب رہا، حالانکہ احادیث پر بحث کرتے وقت تین امور پر توجہ ضروری ہے:

(١) سند حدیث پر بحث ہو، جس سے طلبہ میں حدیث کے پرکھنے اور جانچنے کا مزاج پیدا ہو، اور اسماء الرجال کے حوالہ سے طلبہ میں استعداد پیدا ہو۔

(٢) حکم تعیین مرتبہ حدیث پر عمومی بحث، کہ ترمذی کا حکم کہاں تک درست ہے اور کسی حدیث کے رتبہ میں محدثین کے اختلاف کی نوعیت کیا ہے۔

(٣) نیز یہ بھی ضروری ہے کہ حدیث معاشرتی مسائل کی رہبری اور رہنمائی کس درجہ میں کرتی ہے، ظاہر ہے کہ اس کے لئے مسائل مستنبط من الحدیث کی بحث کا اضافہ کرنا ہوگا۔

یہ عمومی مباحث ہیں ورنہ بخاری شریف میں ترجمۃ الباب کی تحقیق اور محاسن بخاری کا تذکرہ بھی اضافی مباحث میں شامل ہے، جب کہ امام ترمذی کے محاسن کا تذکرہ بھی اس کے درس میں ضروری ہے، پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ ان مباحث میں اگر زیادہ طول پیدا ہو، تو پھر کتاب کو مقررہ حد تک پہنچانا بھی مسئلہ ہوتا ہے، اس لئے استاذ کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے سالانہ سفر کے لئے حدود متعین کریں تاکہ کوئی بحث بھی ادھوری نہ رہے اور دوسری طرف کتاب بھی ختم ہو۔

احادیث کی تدریس میں ہماری ایک کمزور رائے یہ بھی ہے کہ فقہی مباحث میں الجھنے کی وجہ سے حفظ حدیث پر کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی، چنانچہ طلبہ تو درکنار خود ہمارے جیسے نااہل لوگوں کو احادیث پڑھانے کے باوجود احادیث یاد نہیں رہتیں، اس کے لئے ابتداء سے محنت ہو اور ہر طالب علم کے لئے احادیث کی ایک خاص تعداد کا حفظ ضروری قرار دیا جائے تو فراغت کے بعد حدیث کا ایک بڑا حصہ فضلاء کو یاد رہے گا، نیز کسی محفل میں فی البدیہ تقریر کے لئے کافی مواد میسر ہوگا۔

(یادوں کے دریچے: ۳۴۸ تا ۳۴۹)

تدریس حدیث کے چند اہم تقاضے

حضرت مولانا محمد زاہد الراشدی صاحب

تدریس حدیث کے حوالے سے آج کے معروضی تناظر کے حوالے سے اپنے آپ کو بھی اور حدیث کے دوسرے اساتذہ کو بھی تین پہلوؤں کی طرف توجہ دلاؤں گا:

پہلی بات پرانی بھی ہے اور نئی بھی ہے، امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول تعلیقا نقل کیا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا:

حدِّثوا الناسَ بما يعرفون، أتُحبُّون أن يُكذَّب اللهُ ورسولُه؟

لوگوں کے سامنے حدیث ایسے بیان کرو، یا وہ حدیث بیان کرو جو لوگوں کے معروفات ومسلمات کے دائرے میں ہو، ایسی بات مت کرو جس سے ان کے ذہن میں نفرت پیدا ہو اور وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کی منزل پر چلے جائیں۔

یعنی معروفات کو سامنے رکھو، اور اس کے مطابق حدیث کی بات کرو، ایک قول امام مسلم رحمہ اللہ نے مقدمہ میں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا نقل کیا ہے فرماتے ہیں:

ما أنتَ بمحدث قومًا حديثًا لا تبلغه عقولهم إلا كانَ لبعضهم فتنة.

اگر تم لوگوں کے سامنے کسی گروہ کے سامنے ایسی حدیث بیان کروگے یا ایسے انداز سے بیان کروگے کہ ان کی عقلوں کی جہاں تک رسائی نہیں ہے تو تمہارا یہ بیان کرنا ان میں سے بعض لوگوں کے لئے فتنہ بن جائے گا، آزمائش بن جائے گا۔

اس کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا ارشاد بھی ملایا جائے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنا ہے وہ دعائین (دو برتن) ہیں، ایک برتن تو میں نے تمہارے سامنے پھیلادیا ہے، اور اگر دوسرے کو بکھیروں تو میری یہ گردن کٹ جائے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم میں حدیث کے تین بنیادی راویوں کے ان ارشادات کو سامنے رکھ کر یہ اُصول اخذ ہوتا ہے کہ حدیث کو بیان کرنے میں اور اس کے انداز میں اس دور کے معروفات و مسلمات کو سامنے رکھنا ضروری ہوتا ہے، اور حدیث کو لوگوں کے ایمان میں اضافہ کا ذریعہ بننا چاہیے، اس میں تشکیک وشبہات کا ذریعہ نہیں بننا چاہیے، یہ تو عمومی درجہ کی تدریس کی بات ہو رہی ہے، عمومی سطح کی بات ہے، لیکن اس میں تدریس کا ایک پہلو بھی ہے، وہ کیا ہے؟ میں بھی حدیث کا ایک پرانا طالب علم ہوں، پڑھتے پڑھاتے نصف صدی گزر گئی ہے، بہت پرانا طالب علم ہوں حدیث کا، جب ہم حدیث پڑھارہے ہوں تو جس طرح پبلک کے ایک اجتماع میں حدیث بیان کرتے ہوئے پبلک کی ذہنی نفسیات اور ذہنی سطح اور اس کے معروفات و مسلمات کو سامنے رکھنا ضروری ہے، اسی طرح ہمارے سامنے جو کلاس بیٹھی ہے، اس کی ذہنی سطح کو بھی سامنے رکھنا ضروری ہے، یہ کلاس کس لیول کی ہے، کونسی بات ان کے ذہن میں جائے گی اور کونسی نہیں جائے گی، کیونکہ آج ہمارے سامنے جو طلبہ حدیث پڑھنے بیٹھتے ہیں ان کا لیول آج سے پچاس سال پہلے والا نہیں ہے، چالیس پچاس سال پہلے ہوتا یہ تھا کہ سامنے بیٹھے ہوئے طلبہ کی اکثریت مطالعہ کرکے آتی تھی، استاذ کو اشارہ کرنا پڑتا تھا، استاد روایت سناتا اور اشارہ کرتا تھا، ایک ایک دن میں بیس بیس صفحے ویسے ہی نہیں پڑھتے تھے، ایک روایت پڑھی گئی ہے جو ساری طلبہ کے ذہن میں ہے، استاد نے اشارہ کردیا کہ یہ بات یوں ہے، بات نکل گئی، اب میرے خیال میں یہ بات نہیں ہے، اب تو میں عرض کیا کرتا ہوں کہ ہمارے سامنے بیٹھے ہوئے طلبہ اگر نفس حدیث سمجھ لیں کہ حدیث کیا کہتی ہے اور اس حدیث کا ترجمۃ الباب سے تعلق کیا ہے، بس اتنی بات سمجھ لیں تو ان کی ہم پر بڑی مہربانی ہے کہ وہ نفس حدیث سمجھ گئے ہیں اور اس کا مضمون سمجھ گئے ہیں کہ کس مضمون کی یہ روایت ہے، تو یہ ہمارا المیہ ہے کہ ہمارا استعداد کا لیول کم ہوتے ہوتے اس مقام پر آگیا ہے، لیکن ہماری بیشتر تقریریں اسی پچاس سال پہلے کی سطح کی ہیں، میں ایک عملی بات محسوس کر رہا ہوں کہ ہماری تقریریں آج سے پچاس سال پہلے کی ہیں، کیونکہ مطالعہ وہاں سے کیا ہوا ہے، لیکن سننے والے کا لیول وہ نہیں ہے، تو ایک تو میں اشارہ کرنا چاہوں گا کہ ہم لمبی چوڑی بحثیں کرتے ہیں، آج میرے نزدیک حدیث کی تدریس میں ترجیح یہ ہے کہ پہلے نفس حدیث

سمجھائیں کہ حدیث کیا کہتی ہے اور مضمون کیا ہے، اس کے بعد اگر کوئی بات ضروری ہے تو ان کے فہم کے مطابق بیان کردیں، ورنہ تکلف کی ضرورت نہیں ہے، ایک تو میں اس طرف اشارہ کرنا چاہوں گا کہ لوگوں کی ذہنی سطح، ان کے فہم کا دائرہ اور اس کا لیول ہمیں دیکھنا چاہیے اور کوشش یہ کرنی چاہیے کہ حدیث کے ساتھ ان کا زیادہ سے زیادہ فہم کا تعلق قائم ہو، اوپر اوپر کی باتیں ان کے اوپر سے گذر جاتی ہیں اور بات پھر گڑبڑ ہوسکتی ہے۔

دوسری بات میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ حضرت امام طحاوی رحمہ اللہ ہمارے احناف کے بہت بڑے وکیل ہیں اور ان کی کتاب "شرح معانی الآثار" ہمارے مستدلات کا بھی اور استدلال کا بھی بہت بڑا ماخذ ہے، لیکن امام طحاوی رحمہ اللہ نے "شرح معانی الآثار" لکھی کیوں تھی، اس کی وجہ بیان فرمائی ہے کہ کیوں لکھی ہے، مضمون اس کا یہی ہے کہ ترتیب سے احناف اور دوسرے فقہاء کا موقف اور اختلافی مسائل میں دلائل بیان کرتے ہیں، پھر استدلال وترجیح ثابت کرتے ہیں، لیکن امام طحاوی رحمہ اللہ اپنی کتاب کی وجہِ تصنیف کیا بیان فرماتے ہیں کہ میں نے یہ کتاب کیوں لکھی ہے؟ وہ فرماتے ہیں:

سألني بعض أصحابنا من أهل العلم أن أضعَ لهم كتابًا أذكر فيه الآثارَ المذكورةَ عن رسول الله صلى الله عليه وسلم في الأحكام التي يتوهم أهل الإلحاد والضَّعفة من أهل الإسلام بعضها ينقض بعضًا، لقلة علمهم بناسخها من منسوخها وما يجب العلم منها لما يشهد له من الكتاب الناطق والسُّنَّة المَجتمع عليها۔

کہتے ہیں کہ کتاب کو میں نے لکھا، کیوں کہ فقہاء کے اختلاف کے حوالے سے جو مختلف احادیث لوگوں کے سامنے آتی ہیں تو عام آدمی کا یہ تاثر بنتا ہے کہ حدیثوں میں بہت تناقض ہے، بہت تعارض ہے، ایک بات میں دس دس حدیثیں متعارض ہیں، اس لئے عام کمزور مسلمان تشویش میں پڑتا ہے اور ملحدین اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں، ایک مسئلہ میں دس حدیثیں مختلف آگئیں، ایک میں کچھ ہے اور دوسری میں کچھ ہے، تیسری میں کچھ ہے اور چوتھی میں کچھ ہے، اس سے عام کمزور آدمی سمجھے گا کہ یہ کیا مسئلہ ہے، مسئلہ ایک ہے اور حدیثیں اتنی اور بالکل متعارض ہیں، اور ملحدین اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں،

یہ حدیثوں میں تعارض ہے۔

حالانکہ تناقض وتعارض نہیں ہے، تیئس سالہ زندگی میں پھیلی ہوئی حدیثیں ہیں، کوئی کسی موقع کی ہے، کوئی کسی موقع کی ہے، کسی کا پس منظر اور ہے، کسی کا پس منظر اور ہے، کسی کا محل اور ہے کسی کا محل اور ہے، کوئی پہلے کی ہے اور کوئی بعد کی ہے، کوئی ناسخ ہے کوئی منسوخ ہے، اصل قصہ یہ ہے کہ عام آدمی کو چونکہ پتہ نہیں ہے، اس لئے وہم میں پڑجاتا ہے، اور اس سے الحاد والوں کو فائدہ پہنچتا ہے کہ حدیث سے لوگوں کا اعتماد ختم کریں، تو امام طحاوی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے مختلف احادیث کو الگ الگ محل کے ساتھ بیان کرکے ترجیحات قائم کرکے اس تاثر کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے کہ حدیثوں میں تعارض نہیں ہے،امام طحاوی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے یہ تاثر ختم کرنے کے لئے یہ کتاب لکھی ہے تاکہ تعارض کا تاثر ختم ہو اور یہ بتایا جائے کہ یہ حدیث اس موقع کی ہے اور اس کا محل یہ ہے،یہ راجح ہے اور یہ مرجوح ہے، اور یہ ناسخ ہے اور یہ منسوخ ہے، اور ہر حدیث اپنی جگہ صحیح ہے، میں نے یہ بتانے کی کوشش کی اور بڑی کامیابی سے بتائی بھی ہے، امام طحاوی رحمہ اللہ کا یہ کمال ہے کہ بڑی کامیابی سے ایک واقعہ کی متعارض حدیثوں کا الگ الگ محل بیان کرکے انہوں نے یہ بتایا بھی ہے کہ شاید یہ چند حدیثیں منسوخ ہوں، باقی ساری راجح مرجوح ہوں یا اس میں ایک کا محمل یہ ہے ایک کا یہ ہے۔

میرے خیال میں اگر تیسری صدی ہجری میں یہ صورت حال تھی تو آج کی پندرہویں صدی میں بھی یہی صورت حال ہے اور اس سے کہیں زیادہ ہے، امام طحاوی رحمہ اللہ تیسری صدی کے آخر میں اور چوتھی صدی ہجری کے آغاز کے بزرگ ہیں، اگر تیسری صدی کے آخر میں یہ صورت تھی کہ حدیثوں کا ظاہری تعارض اور ظاہری اختلاف وتناقض لوگوں میں شکوک وشبہات کا باعث بنتا تھا اور ملحدین کو فائدہ اٹھانے کا موقع ملتا تھا تو میرے خیال میں آج بھی تدریس میں اس ذوق کو سامنے رکھنے کی ضرورت ہے کہ ہم احادیث کے تعارض کو جھگڑے کے لئے استعمال نہ کریں، اس میں تطبیق اور ہم آہنگی کے پہلو کو نمایاں کرنے کی کوشش کریں جو ہمارے سب سے بڑے امام، امام طحاوی رحمہ اللہ کا موقف ہے۔

تیسری بات حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے حوالے سے کروں گا، حضرت شاہ ولی اللہ کے

نزدیک تو حدیث کا بالکل ایک الگ تصور ہے، کہتے ہیں کہ حدیث تمام علوم دینیہ کا ماخذ اور سرچشمہ ہے، فرماتے ہیں کہ ماخذ تو تمام چیزوں کا حدیث ہے، حتی کہ قرآن کا ماخذ بھی حدیث ہے، قرآن کی یہ آیت قرآن کی آیت ہے، ہمارے پاس اس کی دلیل حدیث ہی ہے، یوں سمجھ لیجئے کہ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اس سے قرآن بھی مستنبط ہوتا ہے اور سنت بھی مستنبط ہوتی ہے، اور فقہ بھی مستنبط ہوتی ہے، اصل ماخذ اور اساس علم حدیث ہے، شاہ صاحب رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس سے تمام علوم مستنبط ہوتے ہیں، شاہ صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک حدیث کا درجہ تو یہ ہے کہ قرآن پاک کی تشریح بھی ہے اور قرآن پاک کا ماخذ بھی ہے، شاہ صاحب نے اپنی کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" میں جو علم اسرار دین پر لکھی ہے، علم اسرار دین کو علم حدیث کا شعبہ بتایا ہے، علم حدیث کے چار شعبے کئے ہیں، چوتھا شعبہ ان میں اسرار دین اور علم حکمت ہے، شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ آج کے دور میں اور آیندہ دور میں علماء پر واجب کیا ہے؟ فرماتے ہیں کہ قرآن پاک کے اعجاز کا ایک پہلو یہ تھا کہ قرآن پاک فصاحت وبلاغت میں تمام کلاموں سے برتر ہے، یہ کلام الملوک ملوک الکلام بادشاہ کا کلام ہے، اور بادشاہی درجہ کا ہے، فصاحت وبلاغت میں اللہ تعالیٰ کا کلام تمام کلاموں میں برتر ہے، کہتے ہیں کہ ایک دور وہ تھا جو گزر گیا، لوگوں نے دلائل دئے، کوئی دلائل کا جواب نہیں دے سکا، قرآن پاک کے مقابلہ میں کوئی آیا، لیکن قرآن پاک کے اعجاز کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے جس کے بارے میں شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ آئندہ زمانے میں بات کرنے کی ضرورت ہے، وہ یہ کہ قرآن پاک نے سوسائٹی کے لئے جو ضوابط وقوانین پیش کئے ہیں، سوسائٹی کے مصالح کے پیش نظر، سوسائٹی کی ضروریات کے پیش نظر ایسے مکمل ضوابط اور قوانین کوئی نہیں پیش کرسکتا، کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہے کہ وہ قرآن پاک جیسے قوانین اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جیسے احکام وضوابط وضع کرے جو سوسائٹی کے منافع کے لئے ہوں، فولڈ کے لئے ہوں، مصلحت کے اعتبار سے سوسائٹی کی ضروریات کے اعتبار سے جتنا مکمل قانون قرآن پاک کا ہے اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے، دنیا میں کوئی اور نظام اور قانون اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ:

وجَبَ أن يكون في الأئمة من يوضح وجوه هذا النوع من الإعجاز والآثار الدالة على أن شريعته صلى الله عليه وسلم أكمل الشَّرائع وأن إتيان مثله بمثلها معجزةٌ عظيمةٌ كثيرةٌ مشهورةٌ۔

یعنی علماء پر واجب ہے کہ قرآن پاک اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور قوانین کی حکمت، ان کی فلاسفی، ان کا نفع، ان کی مصلحت، سوسائٹی کے لئے ان کی ضرورت اور سوسائٹی میں اس کے اثرات، یہ واضح کئے جائیں، آج کی یہ ضرورت ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ حدیث پڑھنے پڑھانے والے کو شاہ صاحب کا یہ سبق بھی اگرچہ تین سو سال کے بعد ہے، یاد کرلینا چاہیے کہ حدیث بیان کرتے ہوئے ہم آج کے زمانے کے مطابق اس پہلو کو ٹچ کریں کہ اس کا یہ فائدہ ہے، اس پر عمل نہ کرنے کا یہ نقصان ہے اور عمل کا یہ فائدہ ہے، تو یہ حکمت اور اس کی لِم وسر بیان کرنا، یہ بھی تدریس حدیث کی ضروریات میں ہے۔

ایک بات کہہ کر میں اپنی بات ختم کروں گا کہ حدیث کی تدریس کے تقاضوں میں ایک تقاضا میری طالب علمانہ رائے میں یہ بھی ہے کہ آج کی جدید تحقیقات کو سامنے رکھا جائے، حدیث کے مدرس کو جدید تحقیقات کا مطالعہ کرنا چاہیے اور تطبیق دینی چاہیے، بیسیوں باتیں آپ کو ملیں گی، میں مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ کچھ دن پہلے یہ حدیث اتفاق سے سبق میں آگئی کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ماں کے پیٹ میں نطفہ چالیس دن ٹھہر تا ہے، پھر علقہ ہوتا ہے، پھر مضغہ ہوتا ہے، فرشتہ تو پہلے دن سے ہی مقرر ہوجاتا ہے، جب سے نطفہ ٹھہرتا ہے، پہلے دن ہی فرشتے کی ڈیوٹی لگ جاتی ہے، وہ رپورٹ دیتا رہتا ہے کہ اے اللہ! چالیس دن گزر گئے، اے اللہ! دوسرا چلہ گزر گیا، اس کے بعد روح کا تعلق جوڑنے سے پہلے اللہ پاک کچھ چیزوں کو لکھواتے ہیں اور اس کی فائل بنتی ہے کہ رزق کتنا ہے، عمر کتنی ہے، اس کی صحت، سقم کیا ہے، شقی ہے یا سعید، کس کیٹگری کا ہے اور کس کھاتے میں جائے گا، یہ کچھ سوالات وہاں لکھوائے جاتے ہیں اور یہ روح کا کنکشن دینے سے پہلے فائل بنتی ہے، پوری زندگی کا پروگرام لکھوایا جاتا ہے، اور پھر روح کا تعلق جسم کے ساتھ جوڑنے کا آرڈر ہوتا ہے، میں نے اس

پر کہا کہ بات سنو! آج کی جو سائنس ہے وہ کہتی ہے انسان کے جین میں اس کا پروگرام فیڈ ہے، ہماری رسائی ہوگئی ہے مگر پڑھ نہیں پارہے ہیں، جس دن پڑھ لیا تو اس دن پتہ چل جائے گا کہ اس کے چالیسویں سال میں کیا ہونا ہے؟ اور دسویں سال میں کیا ہونا ہے؟ اور ہم بہت سا بندوبست پہلے سے کرلیں گے، تو کیا جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا اعجاز نہیں ہے کہ آپ نے یہ بات چودہ سو سال پہلے فرمادی تھی کہ بھئی! سارا پروگرام پہلے بن جاتا ہے، فیڈ ہوجاتا ہے اور فائل بن جاتی ہے، یہ چھوٹی سی بات ذہن میں آگئی، میں سمجھتا ہوں کہ آج کی جدید تحقیقات کو سامنے رکھنا اور طلبہ کو ان سے متعارف کرانا، اس سے حدیث پر ایمان بھی بڑھے گا اور تفہیم بھی بڑھے گی۔ (ماہنامہ الشریعہ مئی جون ۲۰۰۹)

اوران کے بیٹے مولانا عمار خان صاحب اسی شمارے میں تدریس حدیث کے حوالے سے لکھتے ہیں:

موجودہ دور میں مختلف فکری عوامل کے تحت جو ایک عمومی نفسیات بنی ہے اور ایک عمومی ذہن بنا ہے وہ اصل اور فرع کے اس تعلق کو پوری طرح سمجھنا چاہتا ہے کہ کیسے قرآن نے ایک بات کہی ہے اور حدیث نے اس پر احکام مرتب کئے ہیں، کیسے قرآن نے ایک اصول بیان کیا ہے اور حدیث میں اس پر فروع متفرع ہوئے ہیں، کیسے قرآن نے ایک عمومی رہنما اصول دیا ہے اور اس کی حکمت کی روشنی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسے بے شمار حکیمانہ فقہی اور علمی فروع وجزئیات اس پر مرتب کی ہیں، میرے خیال میں یہ ایک ایسا پہلو ہے کہ حدیث کے طلبہ کو بھی اور حدیث کے معانی ومطالب طلبہ تک پہنچانے والے اساتذہ کو بھی بطور خاص اس کو غور وفکر کا موضوع بنانا چاہیے۔

میں نے عرض کیا کہ اصولاً سب اہل علم یہ مانتے ہیں کہ حدیث قرآن کی شرح ہے اور بہت سی اہم جگہوں پر اس کی تفصیلات بھی اہل علم نے بیان کی ہیں، میرے خیال میں اس دور کے فکری مزاج کی یہ ضرورت ہے کہ ہم ہر ہر حدیث کو اور ہر ہر روایت کے حوالے سے یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی کن ہدایات سے قرآن مجید کے کن اشارات سے اور کن تلمیحات سے اس بات کو اخذ کیا ہے، ظاہر بات ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس علو ذہنی کے ساتھ اور جس رسائی کے ساتھ قرآن مجید سے مطالب کو اخذ کرکے بیان کریں گے اس کی کوئی دوسرا آدمی

صلاحیت نہیں رکھتا، تو اگر ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخذ کئے ہوئے معانی کا تعلق سمجھنے کی کوشش کریں گے تو یہ چیز طلبہ کے لئے اور اہل علم کے لئے اپنے فہم کی سطح کو بلند کرنے اور حکمت دین میں گہرائی اور بصیرت پیدا کرنے کا ایک بہت موثر ذریعہ ثابت ہوگی۔

(ماہنامہ الشریعہ مئی، جون ۲۰۰۹)

تدریس حدیث اور عصر حاضر کے تقاضے

حضرت مولانا مفتی محمد زاہد صاحب بن شیخ الحدیث حضرت مولانا نذیر احمد صاحب رحمہ اللہ

حضرت مفتی صاحب نے ۱۵ فروری ۲۰۰۹ء کو الشریعہ اکادمی میں "عصر حاضر میں تدریس حدیث کے تقاضے" کے موضوع پر منعقدہ سیمینار کے لئے ایک قیمتی مقالہ لکھا تھا، جسے قارئین کی خدمت میں بحذف بعض اجزاء پیش کیا جارہا ہے:

عصر حاضر کے تقاضوں کی تکمیل میں حدیث کے کردار کو موثر طور پر بروئے کار لانے کے لئے جو بھی حکمتِ عملی وضع کی جائے گی، اس میں تدریس کا پہلو نمایاں اہمیت کا حامل ہوگا، اس لئے کہ کسی بھی منصوبے کی تکمیل اور کسی حکمتِ عملی سے مطلوبہ نتائج اخذ کرنے کے لئے رجالِ کار کا وجود ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے، اور رجال کار کی تیاری میں تدریس اور طریقہ ہائے تدریس بنیادی عنصر ہوتے ہیں، ہمارے ہاں دینی مدارس کے نصاب پر تو کافی بحث ہوتی ہے، تدریس پر بات نسبتاً کم ہوتی ہے، آج کی مجلس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تدریس کو بنیادی موضوع بنایا گیا ہے، اپنی گفتگو کو مرکوز رکھنے کی خاطر یہاں صرف دینی مدارس وجامعات میں "تدریس حدیث" کی بات کی جائے گی، اس لئے کہ عصری جامعات کے مقابلے میں ان مدارس کی تدریسِ حدیث مواد کی مقدار، تدریس میں گہرائی اور دین کے اصل مصادر سے استفادے کے لئے درکار بنیادی صلاحیت جیسی خصوصیات کی وجہ سے امتیازی حیثیت رکھتی ہے، اس لئے اس میں بہتری پیدا کرنے کے نتائج بھی زیادہ موثر اور بہتر ہوسکتے ہیں، دینی مدارس میں "تدریس حدیث" سے ہماری مراد صرف دورۂ حدیث کی تدریس نہیں ہے، بلکہ بالکل ابتدائی درجات سے لے کر تخصص فی الحدیث تک تمام درجات میں تدریس ہمارے موضوع بحث سے متعلق ہے، اس لئے اس گفتگو میں بعض ایسے تحقیقی کاموں کا بھی تذکرہ آجائے گا جن کی اس زمانے میں ضرورت ہے۔

{۱}

علم حدیث ایک بڑا وسیع کینوس رکھنے والا علم ہے جس کی کوکھ سے کئی مستقل علوم نے جنم لیا ہے اور اس میں وسعت اور پھیلاؤ کے بے شمار امکانات موجود ہیں، لیکن ہمارے ہاں انداز تدریس کے بعض پہلو ایسے ہیں جن کی وجہ سے علمِ حدیث کی وسعت، گہرائی اور اس کے امکانات طالب علم پر واضح نہیں ہو پاتے، جس کی وجہ سے تحصیل علم سے فراغت کے بعد کی زندگی میں بھی وہ اس مبارک علم میں قابلِ ذکر کام سرانجام نہیں دے پاتا، طرزِ تدریس کی ان خامیوں میں پہلی چیز یہ ہے کہ ہمارے ہاں عموماً درسِ حدیث کا بیشتر حصہ اور پڑھانے والے کا زیادہ زور یا تو فقہی احادیث پر صرف ہوتا ہے، یان چند کلامی مباحث پر جو ایک تو ہمارے دور میں مردہ ہو چکی ہیں اور ان کی جگہ کئی نئی تازہ بحثوں نے لے لی ہے، دوسرے ان میں اختلاف بھی عموماً لفظی ہوتا ہے، اس طرح سے حدیث کا یہ درس عملاً کچھ "علمِ کلام" اور کچھ "الفقہ المقارن" کا درس بن کر رہ جاتا ہے، پھر احادیث احکام میں بھی توجہ کا محور عبادات وغیرہ کے چند مسائل ہی رہتے ہیں، احادیث احکام کا بڑا حصہ جو معاملات، سماجیات، سیاسیات، قانون، بین الاقوامی تعلقات وغیرہ سے متعلق ہے، وہ توجہ کا مستحق نہیں بن پاتا، بعض اوقات نسبتاً کم اہمیت رکھنے والے مسئلے پر ضرورت سے کہیں زیادہ وقت صرف کیا جاتا ہے، مثال کے طور پر بعض اوقات قضائے حاجت کے دوران استقبال واستدبارِ قبلہ کے مسئلے پر استاذ کے کئی کئی دن صرف ہوجاتے ہیں، حالانکہ اسی میں سے کچھ وقت بچاکر اسے اس سے اہم کسی مسئلے پر صرف کیا جاسکتا تھا، پھر گفتگو کا انداز بھی کچھ ایسا ہوتا ہے جس سے محسوس ہوتا ہے کہ حنفی، شافعی (مثلاً) دو مدمقابل پارٹیاں برسرپیکار ہیں، اس کے نتیجے میں طالب علم کے اندر بحث وتحقیق کا صحت مند رجحان پروان چڑھنے اور علمی منہج تحقیق کا نمونہ سامنے آنے کے بجائے اس کی شخصیت میں مناظرانہ انداز کے ایسے بیج بودئے جاتے ہیں جو بعض اوقات زندگی بھر اس کا ساتھ نہیں چھوڑتے، اور اس سے طالب علم کی علمی شخصیت ہمیشہ کے لئے تباہ ہوجاتی ہے، یا کم افادیت کی حامل رہ جاتی ہے، حالانکہ جن ائمہ اور بزرگوں کی تائید یا اتباع میں بظاہر ایسا کیا جاتا ہے، خود ان کا اپنا طرزِ عمل یہ نہیں تھا، ان ائمہ کی بات تو بہت دور کی ہے ماضی قریب کی معروف علمی شخصیت شیخ الہند مولانا محمود الحسن

رحمہ اللہ کا جو طرزِ عمل ان کے شاگرد مولانا مناظر احسن گیلانی نے اپنی چشم دید گواہی کی بنیاد پر لکھا ہے وہ قابل توجہ ہے، یہ بات تو اہل علم جانتے ہیں کہ مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا یعقوب نانوتوی اور شیخ الہند مولانا محمود حسن وغیرہ کے درسِ حدیث میں اس طرح سے تقریریں نہیں ہوتی تھیں جیسے آج کل ہوتی ہیں، یہ سلسلہ علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ سے شروع ہوا، شاہ صاحب علم کے بحرِ زخار تھے، جو موضوع چل پڑتا اس پر علم کا بند کھل جاتا، بعد میں ہم جیسے لوگوں نے یہی کام بتکلف شروع کردیا، بہر حال اسی سلسلے میں مولانا مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ شیخ الہند رحمہ اللہ کا یہی طرزِ اختصار نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"جب کوئی ایسی حدیث آجاتی جو بظاہر مفہوم کے لحاظ سے قطعی طور پر حنفی مذہب کے خلاف ہوتی اور پڑھنے والا طالب علم خود رک کر دریافت کرتا، یا دوسرے طلبہ پوچھتے "حضرت یہ حدیث تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے قطعاً خلاف ہے؟" جواب میں مسکراتے ہوئے بے ساختہ شیخ الہند رحمہ اللہ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلتے: "خلاف تو ہے بھائی! میں کیا کروں؟ ہاں آگے چلئے"۔ (دارالعلوم دیوبند میں بیتے ہوئے دن: ١١٨)

بظاہر کہنے کا مقصد یہ تھا کہ یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے، اجتہادی اختلافی مسائل میں تو ایسا ہوتا ہی ہے کہ ہر فریق کے پاس کوئی نہ کوئی دلیل ہوتی ہے اور ہر فریق کی دلیل بظاہر دوسرے فریق کے خلاف ہوتی ہے، اس لئے ایسے مسائل میں یہ توقع رکھنا کہ ہمارے خلاف کوئی دلیل نہ ہو، کا مطلب یہ بنتا ہے کہ دلیل صرف ہمارے پاس ہو، دوسرے فریق کے پاس نہ ہو، اگر ایسا ہوتا تو اس مسئلے میں اختلاف ہی کیوں ہوتا۔

تدریس کا یہ طرز عمل جو حدیث کے لئے مختص وقت او رصلاحیتوں کا بڑا حصہ چوس جاتا ہے، درحقیقت درسگاہ سے باہر کے بعض عوامل کا نتیجہ ہے، اصل معرکہ کہیں اور بپا ہوتا ہے، لیکن ہر فریق کی درس گاہیں اس معرکے کے لئے اسلحہ ساز فیکٹریاں اور فوجی ٹریننگ کے ادارے بن جاتے ہیں۔

ہوا یوں ہے کہ عہد رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد متعدد علاقوں میں جاکر کبارِ صحابہ اور فقہائے صحابہ میں سے بڑی شخصیات آباد ہوگئیں جنہوں نے وہاں عملی طور پر بھی لوگوں کو دین سکھایا، جیسا

کہ انہوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھا تھا اور علمی طور پر بھی بہت سے شاگرد تیار کئے جن سے آگے فیض پھیلا، ان فیض یافتگان میں بڑے بڑے فقہاء بھی شامل تھے، یوں مصر، شام، عراق اور حجاز وغیرہ میں دین پر عمل کی مختلف شکلیں رائج ہوگئیں، اور تعلیم وتعلم کے مستقل سلسلے قائم ہوگئے، بنیادی طور پر یہی چیز آگے چل کر اختلافِ فقہاء کی ایک اہم بنیاد بنی، دین پر عمل اور فقہی آراء میں یہ تنوع حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کے دور تک کھل کر سامنے آچکا تھا۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے پوتے قاسم بن محمد رحمہ اللہ نے جب اس تمنا کا اظہار کیا کہ کاش یہ اختلاف نہ ہوتا، تو عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے انہیں ٹوکتے ہوئے فرمایا کہ: مجھے سرخ اونٹوں کا لالچ دیا جائے، تب بھی میں اس اختلاف کے نہ ہونے کی کبھی تمنا اور آرزو نہیں کروں گا، اس لئے کہ اس سے امت کے لئے وسعت پیدا ہوتی ہے۔(جامع بیان العلم وفضلہ ۸۰/۲)

آج مغربی دنیا اپنے ہاں کے تنوع پر بڑا ناز کرتی ہے لیکن تنوع کے حسن کو سب سے پہلے ان فقہاء نے اسلامی تعلیمات سے سمجھا ہیں، عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ وہ شخصیت ہیں جنہوں نے سرکاری مراسلے کے ذریعے تدوین حدیث کا کام شروع کرایا تھا اور متعدد جلیل القدر محدثین نے ان کے فرمان کے مطابق حدیث کے مجموعے تیار بھی کئے تھے، اگر حدیث کے کسی مجموعے کا یہ مصرف ہوتا کہ اس کو بنیاد بناکر پہلے سے چلے آرہے فقہی تنوع کو ختم کیا جائے تو عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ یہ حکم جاری کرتے کہ میرے تیار کرائے ہوئے ان مجموعوں کو حکم اور فیصل مان کر جو بات اس میں نہ ہو اُسے رَدّ کردیا جائے، لیکن انہوں نے نہ صرف ایسا نہیں کیا بلکہ اس کے برعکس اپنی خلافت کے زیر نگیں تمام بلاد وامصار میں مراسلہ لکھوایا کہ ہر علاقے کے فقہاء جس چیز پر مجتمع ہوں اس علاقے میں اسی کے مطابق فیصلے کئے جائیں۔(سنن دارمی باب اختلاف الفقہاء حدیث نمبر:۶۳۲)

تدوین حدیث ہی کے سلسلے میں ایک بڑا نام امام مالک رحمہ اللہ کا ہے، ان کی "الموطا" کو بجا طور پر صحاحِ ستہ کی ماں کہا جاتا ہے، ان کے سامنے بھی خلیفۂ وقت کی طرف سے پیشکش کی گئی کہ موطا کو بطورِ قانون خلافت کے زیر نگیں تمام علاقوں میں نافذ کرکے لوگوں کو اس پر عمل کا پابند کردیا جائے، لیکن

امام مالک رحمہ اللہ نے اس سے منع کرتے ہوئے فرمایا کہ لوگوں تک پہلے بہت سی باتیں پہنچ چکی ہیں، صحابہ رضی اللہ عنہم کے اقوال میں سے جو باتیں ان تک پہنچ چکی ہیں، ان کی پیروی وہ اختیار کرچکے ہیں، اب جن چیزوں کو وہ اپنا چکے ہیں ان سے انہیں روکنا بڑا گراں امر ہوگا، اس لئے لوگوں کو اپنی حالت پر ہی رہنے دیجئے اور ہر خطے کے لوگوں نے اپنے لئے جس راہِ عمل کو اختیار کرلیا ہے اسے یونہی رہنے دیجئے۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ علمِ حدیث جیسے مبارک اور توسع اور تنوع رکھنے والے علم کا آخری دور میں یہ بڑا عجیب وغریب مصرف نکالا گیا ہے کہ اسے فقہی کشتی کا ایک میدان بنالیا گیا اور ایک دوسرے کا سر کچلنے کے لئے اس سے ہتھوڑے کا کام لیا جانے لگا ہے، یہ بات میں کسی خاص مکتبِ فکر کے بارے میں نہیں کہہ رہا بلکہ تقریباً تمام مکاتب فکر میں اس طرح کے رویّے موجود ہیں، اور یہ وبا پاکستان یا برصغیر کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ عرب دنیا کی کئی یونیورسٹیوں خصوصاً بعض برادر ملکوں کی مذہبی چھاپ رکھنے والی یونیورسٹیوں میں بھی یہی کچھ ہورہا ہے۔

اگر حدیث کی کتابت وتدوین کا یا کسی حدیثی مجموعے یا مجموعوں کا یہی مصرف ہوتا تو سب سے پہلے یہ کام اس شعبے کے مجدد عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کرتے، محدثین کے سرتاج امام مالک رحمہ اللہ کرتے، جن کے موطا کو ایک وقت تک اصح الکتب کہا گیا، امام بخاری رحمہ اللہ کرتے جن کی کتاب کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ کا لقب دیا گیا، صحاحِ ستہ کے دیگر مؤلفین کرتے جن کے مجموعوں کو امت میں سب سے زیادہ تداول حاصل ہوا، لیکن علمی دنیا جانتی ہے کہ فقہی استنباطات واستدلالات کے لئے ان مجموعوں سے استفادہ تو ضرور کیا گیا لیکن فقہی اختلافات کے مکمل تصفیے اور آخری وحتمی فیصلے کے لئے انہیں استعمال نہیں کیا گیا، یہی وجہ ہے کہ حدیث کے ایک سے بڑھ کر ایک مجموعے سامنے آتے رہے اور فنی مقبولیت حاصل کرتے رہے، لیکن فقہی اور عملی دنیا جوں کی توں رہی، اس میں کوئی بڑا فرق واقع نہیں ہوا۔

آج اگر ہم یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام زمانے کے چیلنجز کا سامنا کرسکتا ہے ہر دن کا سورج جو بے شمار نئے سوالات لے کر نکلتا اور نہ معلوم کتنے سوالات چھوڑ کر غروب ہوتا ہے، ان کے قابلِ عمل جوابات اگر ہم اسلامی تعلیمات کی روشنی میں دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں جس کی دنیا

واقعی پیاسی ہے اور ہمہ پہلو عالمی بحرانوں نے اس عظیم کام کے لئے لوہا گرم کردیا ہے، اور دنیا کی سوالیہ نظروں کے سامنے اسلام کا معتدل اور متوازن متبادل پیش کرنے کا بہترین موقع ہے، امت مسلمہ کے کندھوں پر پڑی ہوئی اس انسانی ذمہ داری سے ہم عہدہ برآ ہونا چاہتے ہیں تو قرآن کے ساتھ ساتھ ہمیں حدیث کا وسیع ترین تناظر میں مطالعہ کرنا ہوگا، اس مقصد کے لئے ہمیں اپنے طرز عمل پر نظرثانی کرنا ہوگی جس کے تحت حدیث کے علم کو ایک تو ہم نے چند ابواب تک محدود کردیا ہے، دوسرے اس کو ایسے مصرف میں استعمال کرنے لگے ہیں جو قرونِ اولیٰ کے محدثین کو کبھی نہیں سوجھا تھا، یہاں سے ہم اپنی توانائیوں کو بچانے میں کامیاب ہوجائیں تو اس بچت کی حدیث کے حوالے سے زیادہ نفع بخش جگہوں پر سرمایہ کاری ہوسکتی ہے۔

میرا یہ مقصد نہیں ہے کہ درسِ حدیث میں فقہاء کے اقوال اور ان کے مستدلات زیر بحث نہیں آنے چاہیے بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ فقہی اختلاف کی جو حیثیت سلف میں متعارف تھی، وہ ذہنوں میں واضح رہے اور ان فقہی مباحث کا مقصد ہار جیت نہ ہو بلکہ مقصد محض فقہاء کے مدارک کو جاننا اور یہ معلوم کرنا ہو کہ ایک ہی موضوع پر وارد مختلف احادیث کو کن کن فقہاء نے کس طرح سمجھا، اور ان سے کیسے استدلال واستنباط کیا، اندازِ فکر وبیان کی اس تبدیلی سے یہی بحثیں طلبہ کے لئے ایسا تطبیقی اور تمرینی مواد بن سکتی ہیں جس کے ذریعے ان میں نئے مسائل کا حل حدیث سے نکالنے کی صلاحیت پیدا ہوسکتی ہے۔

{۲}

قرآن کریم کی طرح حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ ایک حدیث بظاہر جس باب یا موضوع سے متعلق نظر آرہی ہوتی ہے وہ درحقیقت صرف اسی کے بارے میں راہ نمائی نہیں کر رہی ہوتی بلکہ اس کے علاوہ بھی زندگی کے کئی شعبوں اور پہلوؤں کے حکم کے بارے میں اس سے اصولی یا فروعی روشنی حاصل ہورہی ہوتی ہے، اس کی ایک اہم مثال وہ حدیثِ مبارک ہے جس میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوعمیر نامی ایک بچے کا پالتو پرندہ مرجانے پر اس سے فرمایا تھا: یا أبا عمیر! ما فعل النُّغیر؟، بظاہر ایک عام سی بات ہے جو حضوراقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بچے کی

دلداری کے لئے ارشاد فرمائی تھی، لیکن اپنے کئی بزرگوں سے سنا (فوری طور پر حوالہ نہیں مل سکا، اگر کوئی صاحب حوالے سے مطلع فرمادیں تو کرم ہوگا) کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے ایک ہی رات میں لیٹے لیٹے اس حدیث سے بڑی تعداد میں مسائل کا استنباط فرمایا، چوتھی صدی ہجری کے ایک بزرگ ابن القاص الطبری رحمہ اللہ نے اس حدیث سے مستنبط ہونے والے مسائل پر باقاعدہ ایک رسالہ لکھا جس کا کافی حصہ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں اپنی طرف سے اضافات کے ساتھ نقل کردیا ہے، ابن القاص الطبری نے اس رسالے کی وجہ تالیف ہی یہ بتائی ہے کہ بعض لوگ محدثین پر اعتراض کرتے ہیں کہ وہ اپنی کتابوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کئی ایسی باتیں نقل کردیتے ہیں جن کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

(فتح الباری: باب الکنیة للصبي)

انہوں نے اس حدیث کو ایک مثال بناکر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بظاہر معمولی نظر آنے والی بات بھی رشد وہدایت کا سرچشمہ ہوتی ہے۔

حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی خصوصیت کا مظہر وہ مشہور واقعہ بھی ہے جسے خطیب بغدادی نے اپنی کتاب "الفقیہ والمتفقہ" میں اور ابن عبد البر نے "جامع بيان العلم وفضله" میں اپنی اپنی سند سے نقل کیا ہے، امام ابوحنیفہ اور امام اعمش رحمہما اللہ کی موجودگی میں کوئی فقہی سوال زیر بحث آتا تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اس کا حکم بیان فرماتے، امام اعمش رحمہ اللہ دلیل پوچھتے، تو امام ابوحنیفہ فرماتے کہ اس کی دلیل فلاں حدیث ہے جو آپ نے ہمارے سامنے اپنے فلاں شیخ کی سند کے ساتھ روایت کی تھی اور فلاں حدیث ہے جو آپ نے فلاں شیخ سے روایت کی تھی، (یاد رہے کہ اعمش حدیث میں امام ابوحنیفہ کے شیخ ہیں) گویا وہ حدیث بظاہر جس موضوع سے متعلق نظر آرہی ہوتی، امام ابوحنیفہ اس سے ہٹ کر بھی اس سے مسائل مستنبط فرماتے جن کی طرف خود اعمش کا ذہن منتقل نہ ہوا ہوتا، اس پر اعمش فرماتے: يا معشر الفقهاء! أنتم الأطباء ونحن الصيادلة، یعنی ہم محدثین کی حیثیت پنساری اور ادویات کے سٹاکسٹ کی ہے اور تم فقہاء کی حیثیت طبیب کی ہے جو جانتا ہے کہ کونسی دوائی کہاں کہاں اور کیسے استعمال ہوسکتی ہے۔ (الفقیہ والمتفقہ: ۲/۸۴، جامع بیان العلم وفضلہ: ۲/۳۱)

محدثین کے طبقے میں امام بخاری رحمہ اللہ کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے حدیث

نبوی کے اس اہم پہلو کو اپنے منہج تالیف کا باقاعدہ ایک حصہ بناکر اپنے قاری کے اندر طلابت کی یہ شان پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، چنانچہ وہ ایک ہی حدیث مختلف جگہوں پر مختلف عنوانات کے تحت روایت کرتے ہیں، بعض مواقع پر استدلال کے لئے صریح اور واضح طور پر متعلقہ حدیث کو چھوڑ کر بظاہر بالکل غیر متعلقہ باب کی حدیث لے آتے ہیں، اس طریقے سے وہ حدیث کی زرخیزی، زندگی کے مختلف شعبوں کے بارے میں راہنمائی کے لئے اس کے امکانات کو اپنے قاری کے ذہن میں راسخ کرنا اور اسے اس کے استعمال کا عادی بنانا چاہتے ہیں۔

ہمارے قریب زمانے کے محدثین میں حضرت مولانا بدرِعالم میرٹھی رحمہ اللہ کے اندر اللہ تعالیٰ نے امام بخاری رحمہ اللہ والی صلاحیت بطورِ خاص ودیعت فرمائی تھی جس کا سب سے زیادہ مظاہرہ ان کی کتاب "ترجمان السنہ" میں ہوا ہے، اس میں انہوں نے یہ کام کیا ہے کہ ان کے دور میں جو فکری واعتقادی مسائل لکھے پڑھے حلقوں میں زیر گردش تھے، ان کے جوابات حدیث کی روشنی میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے، اور اس سلسلے میں انہوں نے اپنا مواد کتبِ حدیث کے صرف کتاب الایمان وغیرہ سے حاصل نہیں کیا، بلکہ پورے ذخیرۂ احادیث سے چھان چھان کر حاصل کیا ہے، عنوان وہ اپنے زمانے کے پیدا شدہ سوالات سے لیتے ہیں اور اس کے تحت حدیث ایسی جگہ اور ایسے باب سے لاتے ہیں جس کی طرف عام قاری تو کجا، حدیث سے مزاولت رکھنے والوں کا ذہن بھی اس طرف منتقل نہیں ہوپاتا، لیکن جب اس حدیث کو اس سوال اور عنوان کے تحت دیکھتے ہیں تو بلا تکلف اس سے اس سوال کا جواب مل رہا ہوتا ہے۔

آج کے دور نے جو معاشی، سیاسی، قانونی، بین الاقوامی امور سے لیکر خاندانی اور نجی زندگی تک کے بارے میں عملی اور فکری سوالات پیدا کردیئے ہیں، ان کے جوابات کے لئے حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس صلاحیت اور زرخیزی سے فائدہ اٹھایا جانا ضروری ہے، اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اپنے تدریسی نظام میں شعوری طور پر اس بات کی کوشش کریں کہ طلبہ کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہو، اس مقصد کے لئے ہمیں چند کام کرنا ہوں گے:

(۱) ہمارے دینی مدارس میں آخری دو درجے ایسے ہوتے ہیں جن میں حدیث کی تدریس نقطۂ عروج

تک پہنچ جاتی ہے، طالب علم کے ان تک پہنچنے سے پہلے پہلے عصرِ حاضر میں اٹھنے والے سوالات بالخصوص سوشل سائنسز سے متعلق سوالات سے مناسب حد تک آگاہی ہوجانی چاہیے، اول تو وفاق المدارس کو اس سلسلے میں سوچنا چاہیے اور وہ اگر ایسا نہیں کرپاتا تو کم ازکم بڑے جامعات اس سلسلے میں اپنے طور پر قدم اٹھاسکتے ہیں، خاص طور پر ان سالوں میں جن کا امتحان وفاق لیتا ہے، ہر مرحلے کے پہلے سال کا امتحان ابھی تک وفاق نہیں لے رہا، اس کے برقرار رہنے کے حق میں ایک دلیل یہ بھی دی جارہی ہے کہ اس طرح سے چند اداروں کی سطح پر سہی، اس طرح کے انتظامات کی توقع کی جاسکتی ہے، جب تک طالب علم موجودہ دور کے سوالات اور ان کے فکری اور تہذیبی پس منظر سے ہی آگاہ نہیں ہوگا بلکہ اس طرح کے موضوعات سے متعلقہ لب ولہجے سے واقف نہیں ہوگا، اس وقت تک اگلا کام ناممکن تو نہیں، خاصا مشکل ضرور ہوجائے گا۔

ایک ریاست میں فرد کی کیا حیثیت ہونی چاہیے؟

فرد اور ریاست کے حقوق کن بنیادوں پر استوار ہونے چاہیے؟

معاہدۂ عمرانی کیا ہوتا ہے اور اسلام کا نقطۂ نظر ان کے بارے میں کیا ہے؟

طلب ورسد کی قوتیں کیا ہیں؟ اور معیشت کو کس حد تک ان کے رحم وکرم پر چھوڑا جاسکتا ہے؟

دولت کی پیدائش اور تقسیم میں ریاست کا کردار کیا ہونا چاہیے؟

زر کی زمانی قدر کس حد تک قابل اعتبار ہے؟

اس طرح کے بے شمار سوالات ہیں جن سے اور ان کے پس منظر سے ہمارا طالب علم آگاہ نہیں ہوتا، حالانکہ اس طرح کئی سوالات کے صرف عنوانات نئے ہوتے ہیں، ورنہ قدیم فقہاء ومتکلمین کے ہاں وہ بحثیں موجود ہوتی ہیں، اگر طالب علم ان چیزوں سے کسی قدر واقف ہوچکا ہو تو حدیث کی روشنی میں ان موضوعات پر اس کے سامنے بات کرنا کافی آسان ہوسکتا ہے، بلکہ

ذہین طالب علم تو بہت سے سوالات کے جوابات خود ہی حاصل کرلے گا۔

(۲) اساتذۂ کرام درسِ حدیث کے دوران موقع بموقع طلبہ کو بتاتے رہیں کہ کون سی حدیث کس طرح عصرِ حاضر سے تعلق رکھنے والے فلاں مسئلے پر روشنی ڈال رہی ہے، مثلاً آج بہت سے مسلمان ایسے ممالک میں آباد ہیں جہاں وہ اقلیت میں ہیں، انہیں وہاں عرف، رواج اور نظام کے بارے میں کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے؟ کیا بالکلیہ وہاں کے نظام کو مسترد کرکے اس کے خلاف بغاوت کرکے انار کی پیدا کرنی چاہیے اور پہلے سے چلے آنے والے ڈھانچے کو کہہ دینا چاہیے کہ اگر ہم نہیں تو تم بھی نہیں، کیا اسے بالکل تلپٹ کرکے خلا پیدا کردینا چاہیے یا کوئی اور راستہ بھی ہوسکتا ہے؟

مکی دور کی احادیث، اسی طرح سے ان صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں احادیث سے جو کسی دینی مصلحت کے تحت مستضعفین میں سے ہونے کی وجہ سے ہجرت نہیں کرسکے تھے، اس پر روشنی پڑسکتی ہے۔

لیلۃ العقبہ اور بیعۃ العقبہ سے متعلق جہاں کہیں احادیث آتی ہیں وہاں طلبہ کی توجہ اس طرف مبذول کرائی جاسکتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں جو سب سے پہلی ریاست قائم فرمائی ہے وہ کسی عسکری انقلاب پر مبنی نہیں تھی، بلکہ اس کی بنیاد دو معاہدوں پر تھی:

سب سے پہلا اور اساسی معاہدہ تو یہی بیعت عقبہ ہے جس کے ایک فریق تو اوس وخزرج کے مختلف خاندانوں کے نمائندہ حضرات تھے اور دوسرا فریق خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے، اس معاہدے کے محرک اول بھی اوس وخزرج ہی تھے، طلبہ کی توجہ ہم صحیح بخاری ہی میں مروی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس روایت کی طرف بھی مبذول کراتے ہیں جس میں وہ بتلاتی ہیں کہ ان کی باہمی جنگوں کے ذریعے درحقیقت اللہ تعالیٰ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے راہ ہموار کی تھی کہ ان میں ان کے بڑے بڑے سردار مارے گئے، قیادت کا خلا پیدا ہوچکا تھا اور جنگوں سے تنگ آکر مشترکہ قیادت کی ضرورت کا احساس بھی پیدا ہوچکا تھا، اس ضرورت کی

تکمیل کے امکانات بھی انہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں نظر آرہے تھے۔
دوسرا اہم معاہدہ "میثاقِ مدینہ" ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ تشریف آوری کے بعد فرمایا اور اس کے ذریعے دیگر کئی قبائل بھی اس ریاست کا حصہ بن گئے۔
ریاستِ مدینہ کی اساس کے بارے میں یہ بنیادی بات اگر ذہن میں بیٹھ جائے تو دوسرے بہت سے مسائل حل ہوسکتے ہیں، اور یہ بات کئی جگہوں پر کام دے سکتی ہے، یہ تو محض ایک مثال ہے مزید مثالیں عرض کی جائیں تو بات کافی لمبی ہوجائے گی۔
عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جہاں جہاں جس حدیث سے عصرِ حاضر کے کسی مسئلے پر روشنی پڑتی ہو، طلبہ کی اس طرف توجہ مبذول کرائی جائے، اور جہاں ضرورت ہو، وہاں متعلقہ سوال اور بحث کے پس منظر سے بھی انہیں آگاہ کیا جائے، اس طرح ان کے اندر مزید فکر واستنباط کی صلاحیت پروان چڑھے گی، اس میں کوئی شک نہیں کہ وفاق کا امتحان دینے والے طلبہ کی خاطر امتحانی نقطۂ نظر اس طرزِ تدریس میں مشکلات کا باعث ہوسکتا ہے، اس لئے جب تک وفاق اس پہلو سے مناسب فیصلے نہیں کرپاتا، جہاں تک ممکن ہو اس حد تک تو یہ کام کرنا چاہیے۔

(۳) ہمارے مدارس میں دورۂ حدیث شریف میں ایک مرحلہ کتبِ حدیث کے سرد اور تلاوت کا ہوتا ہے، اس طرز کے حق اور مخالفت میں مختلف دلائل دیئے جاتے ہیں، یہاں ان سے بحث مقصود نہیں، یہاں یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ اگر یہ طریقہ جاری رکھنا ہو تو اس کا مقصد کتابیں ختم کرنے کی رسمی کار روائی نہ ہو، بلکہ اسے سرسری سہی، اجتماعی مطالعۂ حدیث میں تبدیل کیا جائے، طلبہ سے کہا جائے کہ:

وہ درس کے اس دورانیے کو اہمیت دیں۔
متیقظ ہوکر بیٹھیں۔
کاغذ یا نوٹ بک اور قلم، ترجیحاً کچی پنسل ساتھ لے کر بیٹھیں۔

مختلف احادیث جو مختلف جگہوں میں گذری ہیں، ان میں جو فرق محسوس ہو اسے نشان زد کریں۔

جہاں احادیث ایک دوسرے کی تائید کررہی ہوں، انہیں نشان زد کریں۔

جہاں بعض طرق کے بعض الفاظ حدیث کی مختلف تشریحوں میں سے کسی خاص تشریح کی تائید کر رہے ہوں یا نئی تشریح یا توجیہ وغیرہ کی طرف آپ کا ذہن منتقل کررہے ہوں، انہیں خواہ اشارے ہی کے درجے میں ہو، نوٹ کریں۔

دورانِ تلاوت، حدیث سے جو نیا استنباط، خاص طور پر جو حدیث کے متعلقہ باب سے بظاہر ہٹ کر ہو، اسے نوٹ کریں۔

کسی بھی کتاب کے انفرادی مطالعے اور اس کی سرد وتلاوت میں ایک فرق یہ ہے کہ انفرادی مطالعے میں حواس ظاہرہ میں سے صرف آنکھیں استعمال ہورہی ہوتی ہیں اور یہاں آنکھوں کے ساتھ کان بھی استعمال ہورہے ہوتے ہیں، اس لئے کہ ایک طالب علم پڑھ رہا ہوتاہے اور باقی سن رہے ہوتے ہیں، اور تعلیم کے عمل میں جتنے زیادہ حواس بیک وقت استعمال ہو رہے ہوں، وہ اتنی ہی موثر ہوتی ہے، اس لئے سرد وتلاوت کے اس مرحلے سے بہت سے مفید کام لئے جاسکتے ہیں، بالخصوص ذی استعداد طلبہ کے حوالے سے، مثلا ایک مخصوص دورانئے مثلا ایک ہفتے یا ایک مہینے کے درمیان ہم ان میں مقابلہ کراسکتے ہیں کہ دورانِ تلاوت کون اس طرح کی چیزوں کو زیادہ نوٹ کرسکتاہے، اچھی کارکردگی دکھانے والے طلبہ کی مختلف طریقوں سے حوصلہ افزائی بھی کی جاسکتی ہے۔

{۳}

حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک بہت بڑا کردار بلکہ شاید سب سے اہم کردار عام لوگوں کی نجی، گھریلو، معاشرتی، روحانی زندگی وغیرہ میں راہنمائی اور ان کے اخلاق وکردار کی اصلاح ہے، آج کا مسلمان اپنی زندگی کے ہر شعبے میں دین سے جتنا دور ہوچکا ہے بلکہ دین کے بہت سے شعبوں میں بنیادی شعور

تک موجود نہیں ہے، اس سب کا مداوا حدیث کے فیض کو عام لوگوں تک پہنچانا ہے، تجربہ یہ ہے کہ اس معاملے میں درسِ حدیث وغیرہ کی تاثیر درسِ قرآن سے بھی زیادہ ہوتی ہے، محدثین کرام نے بجا طور پر کہا ہیں کہ حدیث نبوی میں اشتغال ایک گونہ صحبت نبوی سے مستفید ہونا ہے، عامۃ الناس کی اصلاح وارشاد کے لئے حدیث کے حوالے سے جو بات ہوگی، اس پر بھی انشاء اللہ یہ بات صادق آئے گی، تجربہ یہی ہے کہ حدیث کے حوالے سے خصوصاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عملی واقعات کے حوالے سے جو بات کی جائے، اس سے نہ صرف راہنمائی ملتی ہے بلکہ عمل کا جذبہ اور داعیہ بھی پیدا ہوتا ہے، اس کی ایک واضح مثال تبلیغی جماعت اور "فضائل اعمال" سے دی جاسکتی ہے، جن جن اعمال کے بارے میں اس کتاب کے ذریعے حدیثیں سنی اور سنائی جاتی ہیں وہ بہر حال ان میں کافی حد تک راسخ ہو چکے ہوتے ہیں، اس لئے ہمارے تدریسِ حدیث کے باقاعدہ اور مقصودی اہداف میں یہ بات شامل ہونی چاہیے کہ طلبہ کو اس کام کے لئے تیار کیا جائے اس کے لئے یہاں چند گزارشات پیشِ خدمت ہیں:

احادیث کا وہ حصہ جو زہد، رقاق، آداب اور عام اخلاقی و عملی زندگی سے تعلق رکھتا ہے، تدریس میں اسے بھی خاطر خواہ اہمیت دی جائے، انہیں آسان ابواب سمجھ کر روا روی میں گزارنے کا انداز اختیار نہ کیا جائے، ویسے تو پوری حدیث بلکہ ہر فن کی تدریس میں تطبیقی پہلو بڑا اہم ہوتا ہے تاکہ پڑھنے والوں کو پتا چلے کہ یہ باتیں کہاں کیسے منطبق ہوں گی، لیکن خاص طور پر ان احادیث کا ہماری جیتی زندگی کے ساتھ ربط اور جوڑ واضح کر کے دکھایا جائے تاکہ وہ عامۃ الناس کے سامنے اسی انداز سے حدیث نبوی علی صاحبہا الصلوۃ والتسلیم کو پیش کر سکیں۔

آج زندگی کو منضبط کرنے اور اسے کامیاب بنانے کے گر ایک مستقل فن بن چکا ہے جس پر مختلف معیاروں کی بے شمار کتابیں مارکیٹ میں آرہی ہیں، ان میں سے زیادہ تر میں "نفسیات" کے علم سے استفادہ کیا گیا ہوتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ احادیثِ مبارکہ میں اس حوالے سے اتنا مواد موجود ہے کہ اسے بنیاد بناکر اس طرح کے موضوعات پر کتابوں کی پوری ایک سیریز تیار کی جاسکتی ہے۔

مثال کے طور پر مشکوۃ شریف کے "باب الحذر والتأني في الأمور" کی حدیثوں کو ہم دیکھ

سکتے ہیں، اسی طرح توکل، تسلیم ورضا، حسد وغیرہ سے متعلق احادیث کو بالخصوص صوفیہ کی تشریح کے ساتھ دیکھا جائے تو ہمارے بہت سے نفسیاتی مسائل اور رویّوں کے بحران کا، جو جگہ جگہ کامیابی کی راہ میں ہمارے پاؤں کی بیڑیاں بن جاتے ہیں، حل مل سکتا ہے، غصہ انسانی فطرت کا ایک لازمہ ہے۔ اسے ختم نہیں کیا جاسکتا، البتہ اسے کنڑول کرنا ضروری ہوتا ہے، غصے کو کنڑول کیسے کیا جائے؟ آج یہ نفسیات کا ایک اہم موضوع تو ہے ہی، اسے انتظامی علوم کے نصابات میں بھی جگہ ملنے لگی ہے، دنیا کو اس موضوع کی اہمیت کا آج احساس ہوا ہے، حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اس حوالے سے چودہ صدیاں پہلے خاصا مواد موجود ہے، اور اس سلسلے میں بہت ہی قیمتی اور کارگر بتائے گئے ہیں۔

گھروں اور اداروں وغیرہ میں باہمی اعتماد کے مسائل کیسے پیدا ہوتے ہیں؟ اور وہ کس طرح نقصان پہنچاتے ہیں؟ اور اُن سے بچنے اور نمٹنے کا طریقہ کیا ہوسکتا ہے؟ حسن ظن، سوءِ ظن، نمیمہ (چغل خوری) سنی سنائی بات آگے چلانا، باہمی مشاورت وغیرہ موضوعات کی حدیثوں میں اس کے بارے میں بہت سے شاندار اصول ملتے ہیں، گھریلو زندگی بالخصوص زوجین کے تعلقات تو حدیث کا ایک اہم موضوع ہیں جس پر احادیث کی کافی زیادہ تعداد موجود ہے۔

مثال کے طور پر اس حوالے سے ایک قرآنی آیت ہے کہ {عسى أن تكرهوا شيئاً ويجعل الله فيه خيرًا كثيرًا} (النساء:۱۹)

"ہوسکتا ہے تم ان کی کسی بات کو ناپسند کرو اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے اسی میں بڑی خیر رکھی ہو"۔

اسی طرح حدیث نبوی میں ہے کہ لَا يَفْرَكْ مُؤْمِنٌ مُؤْمِنَةً، إِنْ كَرِهَ مِنْهَا خُلُقًا رَضِيَ مِنْهَا آخَرَ۔ (صحیح مسلم، باب الوصیۃ بالنساء)

"کوئی مؤمن کسی مومنہ سے نفرت کا رویہ اختیار نہ کرے، ہوسکتا ہے اس کی کوئی ایک بات اسے ناپسند ہو تو دوسری پسندیدہ بات بھی اس میں موجود ہو"۔

انہی دو نصوص کو لیا جائے تو نہ معلوم کتنے مسائل حل ہوسکتے ہیں اور تعلقات کے کتنے بحران

ختم ہوسکتے ہیں، اس لئے کہ ان میں یہ بتایا گیا ہے کہ ایثار وہمدردی کے ساتھ برداشت کرنے کے اعلیٰ اصول کو نہ بھی اپنایا ہو اور مفاد اور غرض ہی کے نقطۂ نظر سے دیکھنا ہو، تب بھی تجزیہ بہرحال حقیقت پسندانہ اور عملیت پسندانہ ہونا چاہیے۔

یہ تو محض چند مثالیں ہیں، ورنہ کتنی حدیثیں ہیں جن کا ہماری روز مرہ کی زندگی کی الجھی ڈوروں کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے، لیکن یہ احادیث تو نہ ہماری تدریسی دنیا میں اجاگر اور ہائی لائٹ ہوتی ہیں اور نہ ہی وعظ ونصیحت کی دنیا میں، اس لئے ہماری تدریس حدیث میں اس بات کی کوشش ہونی چاہیے کہ طلبہ کے اندر اس طرح کی احادیث کو سمجھنے ان سے نتائج اخذ کرنے اور انہیں تطبیقی انداز سے بیان کرنے کی صلاحیت پیدا ہو۔

دین اور انسانیت کی جو بہت اعلیٰ اخلاقی قدریں ہیں جیسے سچائی، دیانت، ولانت، عہد کی پاس داری، دھوکہ نہ دینا، اکل اموال الناس بالباطل سے احتراز وغیرہ ان کے بارے میں قولی احادیث بھی موجود ہیں اور سیرتِ طیبہ میں ایسی مثالیں بھی موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ان اقدار کی خاطر بڑی بڑی مصلحتوں کو قربان کیا جاسکتا ہے۔

اس کی ایک واضح مثال حدیبیہ کے معاہدے کی پاس داری کا وہ انداز ہے جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوجندل اور ابوبصیر کے بارے میں اختیار فرمایا، آج بد قسمتی سے یہودیوں کی طرح مسلمانوں میں بھی ایسے رویّے رواج پارہے ہیں کہ محض معمولی تاویلوں او رحیلوں سے ان بنیادی اصول واقدار میں لچک پیدا کرلی جاتی ہے، ایسے لوگ بھی مل جائیں گے جو خیر سے پیشاب کا تو باریک سا چھینٹا بھی بدن یا کپڑوں پر گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے، لیکن دھوکا، فریب، حق تلفی کے جواز کے لئے معمولی تاویل بھی کافی ہوجاتی ہے، جب حدیث کی تدریس میں اعلیٰ اخلاقی قدروں کی اہمیت کے یہ پہلو اجاگر ہوں گے تو انہی طلبہ کے ذریعے جو کل کے دینی راہنما ہیں یہ باتیں عام مسلمانوں تک بھی پہنچیں گی۔

{۴}

ہمارے مدارس سے فارغ التحصیل ہونے والے حضرات حدیث پر مزید علمی و تحقیقی کام کرنے کے قابل ہو سکیں، اس مقصد کے لئے چند اقدامات ضروری ہیں، خاص طور پر ایسے باصلاحیت اور ذہین طلبہ جن سے مستقبل میں اس نوعیت کے کاموں کی توقع رکھی جاسکتی ہے، ان میں سب سے پہلا کام تو یہ ہے کہ طلبہ کے میول ورجحانات کو جانچنے اور اس کی روشنی میں مستقبل کی منصوبہ بندی اور اپنے لئے کسی راہ کو اپنانے کے لئے راہ نمائی کا انتظام ہو........

دوسرا کرنے کا کام یہ ہے کہ بحث و تحقیق کے مناہج واسالیب اور جدید طریقوں سے منتخب طلبہ کو روشناس کرایا جائے اور عملی کام کرایا جائے، اگرچہ اب متعدد جامعات میں دورۂ حدیث شریف کے سال میں جو تحقیقی مقالہ لکھوایا جاتا ہے، اسے "ما لا یُدرَکُ کلُّہ لا یُترَکُ کلُّہ" کے تحت حوصلہ افزا تو قرار دیا جاسکتا ہے، لیکن اس سے خاطر خواہ نتائج عموماً برآمد نہیں ہوتے۔

اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ مشق تمام طلبہ پر یکساں کی جاتی ہے، جبکہ بعض جامعات میں دورے میں طلبہ کی تعداد سینکڑوں میں ہوتی ہے، اس وجہ سے وہ طلبہ متعلقہ نگران اساتذہ کی پوری توجہ اور راہنمائی حاصل نہیں کر پاتے۔

دوسرے بہت سے اساتذہ خود اس میدان کے شناور نہیں ہوتے۔

تیسرے ایک سال میں یہ کام "شب بھر میں پیدا بھی ہوا، مجنون بھی ہوا، اور مر بھی گیا" کا مصداق ہوتا ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ یہ محنت چند منتخب طلبہ پر کی جائے اور یہ سلسلہ کم از کم خامسہ سے شروع کیا جائے اور تدریجاً انہیں آگے بڑھایا جائے........

(الشریعہ: مئی جون ۲۰۰۹ء)

طلبہ کے سوالات واشکالات
اور ارباب مدارس کا رویہ

مولانا قاضی محمد رویس خان ایوبی صاحب تلمیذ حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ نے اس موضوع پر ایک محاضرہ دیا ہیں، انداز کلام اگرچہ کچھ سخت ہے لیکن متنبہ ہونے کے لئے اس کا ایک اقتباس یہاں لیا جارہا ہے۔

میں نے حضرت کاندھلوی اور مولانا رسول خان صاحب رحمہا اللہ سے حدیث پڑھی ہے، کچھ احادیث ایسی ہیں جو آج تک میری سمجھ میں نہیں آئیں، مثلاً تمیم داری کی حدیث جو مسلم شریف میں ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ ہم سمندر کے سفر پر گئے اور کشتی ٹوٹ گئی، تو ہم ایک جزیرے پر جاپہنچے، وہاں بالوں سے بھرے ہوئے جسم والی ایک چیز ہمیں ملی جس کے جسم کے اگلے اور پچھلے حصے کا کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا، وہ بات کرتی تھی، لیکن "لا نفقه ما يقول" ہمیں سمجھ نہیں آتی تھی کہ وہ کیا کہہ رہی ہے، پھر وہی راوی یہ بتاتا ہے کہ اس نے کہا کہ کیا بحیرہ طبریہ خشک ہوگیا؟ ہم نے کہا ہاں، اس نے کہا قریش کے نبی ظاہر ہوگئے؟ ہم نے کہا ہاں۔

سوال یہ ہے کہ جب اس کی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی تو یہ سوال وجواب کیسے ہوا؟ یہ غور طلب بات ہے، پھر یہ قصہ جو خاتون سنارہی ہیں ان سے کسی نے پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث سناؤ تو وہ خاتون کہتی ہے، میرا نکاح الف سے ہوا، وہ مرا، ب سے ہوا، وہ مرا، ت سے ہوا، وہ مرا، ج سے ہوا، پھر ایک دن "الصلاة جامعةٌ" کی آواز لگائی گئی، ہم وہاں پہنچے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دجال والا قصہ سنایا کہ تمیم داری وہاں گئے۔

بھئی! اس نکاح کا حدیث سے کیا تعلق ہے؟ پھر وہ بتاتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تم سے نہیں کہتا تھا کہ دجال آگیا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: هو في بحر

الشام، لا ھو في بحر الیمن، لا ھو في الشرق، فرمایا وہ شام میں ہے، نہیں نہیں وہ یمن میں ہے، نہیں نہیں وہ تو مشرق میں ہے، وہ یہاں نہیں آئے گا۔

سوال یہ ہے کہ یہ کس کی باتیں ہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں یمن میں ہے، نہیں شام میں ہے، نہیں وہ مشرق میں ہے، نہیں وہ مغرب میں ہے، میں اعتراض نہیں کررہا، میں یہ کہہ رہا ہوں کہ جب محدث اور شیخ الحدیث پڑھائے تو طالب علم کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس سے پیغمبر کا کیا مقصد ہے؟ لیکن اگر وہ یہ پوچھتا ہے تو مدرسے والے اسے دو پہر سے پہلے پہلے نکال دیں گے کہ یہ بے ایمان اور پرویزی ہے اور یہ مدرسے کی روٹیاں کھا کر مفکر بننا چاہتا ہے، یہ اس کا حل نہیں ہے۔

غزوہ خیبر کی موقع پر صفیہ بنت حیی بن اخطب ایک خاتون تھیں جو دحیہ کلبی کے حصے میں آئیں، یہ وہی صحابی ہیں جبریل علیہ السلام سے مشابہت والے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیدی، تو صحابہ رضی اللہ عنہم کا ایک گروپ آیا اور آپ سے عرض کیا کہ "ألا إنّھا أجمل نساء الیھود" یہ یہودیوں کی سب سے خوبصورت خاتون ہے، آپ نے کس کو پکڑادی ہے! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دحیہ کو بلایا اور کہا: کیا تم اس سے میرے لئے دستبردار نہیں ہوسکتے؟ تو دحیہ نے جواب دیا کہ فداك أبي وأمي، ایک صفیہ کیا، ہزاروں آپ پر قربان، حضور علیہ السلام نے صفیہ کو ان سے واپس لے لیا اور واپسی کے لئے اپنی سواری پر سوار ہوگئے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سوچا کہ یہ بیوی بنتی ہے یا لونڈی، اگر تو اس سے پردہ کرایا تو زوجہ محترمہ ام المومنین ہوگی اور نہ کرایا تو لونڈی شمار کی جائے گی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صفیہ کو اونٹ پر بٹھانے کے لئے اپنا گھٹنا مبارک دہرا کیا اور اس پر صفیہ نے اپنے پاؤں رکھا۔ یہ غزوہ خیبر کے حوالہ سے فتح الباری میں واقعہ موجود ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ران پر صفیہ نے پاؤں رکھا تو فتح الباری میں ہے کہ فتمعّر وجه رسول الله صلى الله عليه وسلم، ہر بندہ جو صنفی معاملات کو جانتا ہے سمجھ سکتا ہے کہ تمعّر کا کیا مطلب ہے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ کیوں سرخ ہوگیا، جب آپ کجاوے میں بیٹھ گئے اور کجاوہ اوپر سے بند ہے تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے سمجھ لیا کہ یہ ام المومنین ہیں، لونڈی نہیں ہیں، واقعے کے مطابق کجاوے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صفیہ

کو چھیڑا، تو انہوں نے کہنی ماری، جس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پیچھے ہٹ گئے، جب ایک جگہ جاکر اترے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ تمہیں مجھ سے نفرت ہے؟ صفیہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا نفرت تو نہیں ہے لیکن چونکہ یہودی قرب وجوار میں تھے اور میں سردار کی بیٹی ہوں تو مجھے خدشہ تھا کہ کہیں وہ غیرت کی وجہ سے حملہ نہ کردیں، اور آپ کو نقصان نہ پہنچائیں، اس لئے میں نے آپ کو روک دیا۔

قابل غور بات یہ ہے کہ یہ سارا واقعہ کجاوے کے اندر ہوا ہے، کجاوے کے اندر کے بات باہر کیسے آئی؟ جس راوی نے اس کو بیان کیا ہے، اس کو کس نے بتایا؟ سوال یہ ہے کہ میاں بیوی کی جو آپس کی بات ہے، یہ راوی کو کہاں سے ملی ہے؟ اگر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بتایا ہے تو یہ بھی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے خلاف ہے کہ میاں بیوی اپنی باتیں باہر بتائیں۔

اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ پر بے شمار اعتراضات ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ زیادہ عرصہ تو ابوبکر رضی اللہ عنہ رہے، عمر رضی اللہ عنہ رہے، عثمان غنی رضی اللہ عنہ رہے اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کاتب وحی تھے تو سب سے زیادہ روایات ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے کیوں مروی ہیں؟

یہ سارے وہ مسائل ہیں جو طالب علمی کے دور میں ایک طالب علم کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں، مگر وہ استاد سے پوچھ نہیں سکتا، اس لئے اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ طلبہ کو حوصلہ دیا جائے کہ اگر کوئی شک پڑ جائے تو پوچھ لیا کرو، اور اس کے جوابات بھی موجود ہیں۔(الشریعہ: مئی جون ۲۰۰۹ء)

(۳)

کتب فقہ

کا انداز تدریس

قدوری تا ہدایہ پڑھانے کا طریقہ

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم

مختصر القدوری:

جس طرح "ہدایۃ النحو" علم نحو کی بنیاد ہے، اسی طرح "مختصر القدوری" فقہ حنفی کی بنیاد ہے، یہ ایک سلیس، آسان، مختصر مگر جامع کتاب ہے جس کی تدریس بڑے اہتمام سے ہونی ضروری ہے، اور اس میں مندرجہ ذیل امور کو مد نظر رکھنا چاہئے:

(۱) عبارت ہر طالب علم سے باری باری پڑھوائی جائے اور طلبہ کو پابند کیا جائے کہ وہ مطالعہ کر کے آئیں، عبارت کی کسی ادنیٰ غلطی، یہاں تک کہ تلفظ سے بھی چشم پوشی نہ کی جائے، اور عبارت کی درستی کو درس کا اہم حصہ قرار دیکر اس پر وقت صرف ہونے کی پرواہ نہ کی جائے۔

(۲) کتاب میں جو مسئلہ بیان ہوا ہے، صرف اسی کو سمجھانے اور ذہن نشین کرانے پر زور دیا جائے، خارجی مباحث نہ چھیڑے جائیں البتہ اگر اسی مسئلہ کو سمجھانے کے لئے کچھ تفصیل کی ضرورت ہو، یا مفتی بہ قول بیان کرنا درست ہو تو الگ بات ہے۔

(۳) مسئلے کے دلائل بیان کرنے کی ضرورت نہیں، البتہ جہاں مسئلے کا سمجھنا دلیل پر موقوف ہو یا دو مسئلوں میں وجہ فرق بیان کرنا ضروری ہو صرف وہاں دلائل ذکر کئے جائیں۔

(۴) استاذ "قدوری" کی شروح میں سے "جوہرہ" اور "لباب" کو بطور خاص مطالعہ میں رکھے اور ضرورت کے وقت "ہدایہ" اور اس کی شروح سے بھی مدد لے، لیکن طالب علم کو صرف اتنی بات بتائے جو اس کی ذہنی سطح کے مطابق ہو۔

(۵) شروح کے علاوہ استاذ کو چاہئے کہ وہ "بہشتی زیور" اور "امداد الفتاویٰ" بھی اپنے مطالعہ میں رکھے، اور ہر سبق میں دیکھ لیا کرے کہ کتاب کا کوئی مسئلہ مفتی بہ قول کے خلاف تو نہیں ہے، اگر خلاف ہو تو مفتی بہ قول بھی بیان کرے۔

(٦) تمام فقہی اصطلاحات اور ان کا مفہوم و مصداق طالب علم کو زبانی یاد کرایا جائے، اسی طرح ہر باب سے متعلق بنیادی مسائل اور کثیر الوقوع جزئیات بھی زبانی یاد ہونے چاہئیں، البتہ تفصیلات اور تفریعات وغیرہ میں اس بات پر اکتفا کیا جاسکتا ہے کہ طالب علم کتاب میں دیکھ کر اس کا مطلب بتا سکے۔

(٧) نماز کے سنن و آداب نہ صرف طالب علم کو زبانی یاد کرائے جائیں بلکہ ان کی عملی مشق کرائی جائے اور طلبہ کو ان کی عملی غلطیوں اور کوتاہیوں پر متنبہ کیا جائے اور خارج درس بھی ان کے طرز عمل کی نگرانی کی جائے۔

(٨) طالب علم کے ذہن میں شروع ہی سے یہ بات پیدا کی جائے کہ وہ جو کچھ پڑھ رہا ہے وہ محض ایک نظریاتی علم یا فن نہیں ہے، بلکہ اس کا مقصد اس کے عمل کی اصلاح ہے۔

کنزالدقائق:

مختصر القدوری کے بعد کنزالدقائق کی فقہ میں وہی حیثیت ہے جو نحو میں "ہدایۃ النحو" کے بعد "کافیہ" کی، قدوری سے فقہ کے مبادی کا تعارف حاصل ہوتا ہے، لیکن کنز میں فقہی معلومات کا بہت بڑا ذخیرہ نہایت اختصار اور جامعیت کے ساتھ دریا بکوزہ کے مصداق جمع ہے، لہذا استاذ کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ یہ ذخیرہ طالب علم کے اس طرح ذہن نشین کرادے کہ کتاب سے استفادے کی صلاحیت طالب علم میں پیدا ہو جائے، ہر باب کے بنیادی مسائل اور اصطلاحات اسے اچھی طرح یاد ہو جائیں، اور باقی تفصیلات وہ کتاب کی مدد سے سمجھ سکے۔

کتاب کے حل کے لئے استاذ کو "عینی" شرح کنز، اور "کشف الحقائق" کو سامنے رکھنا چاہئے اور فقہی تفصیلات جاننے کے لئے "زیلعی" اور بوقت ضرورت "البحر الرائق" کی مراجعت کی جائے۔

اس کتاب میں بھی دلائل طلبہ کے سامنے بیان کرنے کی حاجت نہیں، البتہ جہاں مسئلے کی صحیح فہم دلیل پر موقوف ہو، وہاں دلیل ضرور بیان کی جائے، یا جہاں ایک جیسے مسئلوں کا حکم مختلف ہو، وہاں وجہ فرق ضرور واضح کی جائے۔

شرح وقایہ:

اس کتاب کا مقصد یہ ہے کہ فقہ کے سادہ مسائل سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد طالب علم فقہاء کرام کے اختلافات اور دلائل سے تعارف حاصل کرے، چنانچہ کتاب میں جو مباحث بیان ہوئے ہیں ان کی اس طرح تشریح کی جائے کہ طالب علم ان دلائل و مباحث کو نہ صرف سمجھ سکے بلکہ ان مباحث میں قوت مطالعہ اس کے اندر پیدا ہو۔

اس کے لئے مناسب ہے کہ استاذ وقتاً فوقتاً طلبہ سے پڑھے ہوئے سبقوں کے بارے میں سوالات کرتا رہے، یہ سوالات نفس مسائل کے علاوہ اختلافات اور دلائل کے بارے میں بھی ہونے چاہئیں۔

طلبہ کی عبارت کی تصحیح اور نحوی و صرفی قواعد کے اجراء کا سلسلہ یہاں بھی جاری رہنا چاہئے۔

ہدایہ اولین و آخرین:

اس کتاب کو اگر درس نظامی کا حاصل اور علوم دینیہ کی بنیاد کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا، لہذا استاذ کو اسی اہمیت کے ساتھ اسے پڑھانا چاہئے، کتاب کا مقصد یہ ہے کہ طالب علم کو مسائل کے ساتھ ان کے نقلی اور عقلی دلائل اور فقہاء کے مدارک استنباط سے واقفیت ہو، اس کتاب کی تدریس میں مندرجہ ذیل امور کا اہتمام لازمی ہے:

(۱) عبارتِ کتاب کی تصحیح لازمی ہے۔

(۲) مسئلے کی صورت کا واضح بیان، جو خارجی مثالوں سے مصور کر کے ہو تو بہتر ہے، اور مسئلے کے حکم کی تفصیل مع اختلاف فقہاء۔

(۳) مسئلے کے دلائل کی توضیح اور مخالف فقہاء کی دلائل کا جواب۔

(۴) مذکورہ دونوں امور، پہلے کتاب سے ہٹ کر طلباء کو سمجھا دیئے جائیں، پھر کتاب سے کر کے اس بحث کی پوری مطابقت کرائی جائے۔

(۵) دلائل کے بیان کے وقت جس قدر ممکن ہو اصولِ فقہ کے قواعد اجراء کرایا جائے۔

(۶) حلِ کتاب کے لئے "عنایہ" اور "کفایہ" کو بنیاد بنایا جائے، اور دلائل کی تفصیل کے لئے فتح القدیر اور عینی کی بنایہ سے مدد لی جائے۔

(۷) اس بات کا اطمینان کیا جائے کہ طالب علم کو باب سے متعلق اہم اور بنیادی مسائل یاد ہیں، اور وقتاً فوقتاً ان کا امتحان لیا جاتا رہے۔

(۸) کبھی کبھی طلبہ سے دلائل کی تقریر بھی کرائی جائے، تاکہ علمی باتوں کو واضح انداز میں سمجھانے کی عادت پڑے۔

(۹) اس بات کی بطور خاص نگرانی کی جائے کہ "ہدایہ" جیسی کتاب کے مطالعے اور اس کو سمجھنے کی صلاحیت طالب علم میں پیدا ہو رہی ہے یا نہیں۔

کتب فقہ پڑھانے کا آسان طریقہ

فقہ کی پڑھائی کیسی ہونی چاہیے؟ اس سلسلے میں استاذ محترم حضرت مولانا مفتی نظام الدین شامزئی شہید رحمہ اللہ نے جو اپنی تجربہ کی باتیں بتائی ہیں وہ پیش خدمت ہیں:

ابتدائی کتب کے اندر سب سے آسان اور بہتر طریقہ یہ ہے کہ جب طالب علم عبارت پڑھے تو اگر طالب علم میں صلاحیت ہے تو استاذ طالب علم سے بلوائے کہ یہ فعل ہے، یہ صفت ہے، یہ موصوف ہے یہ مبتداء ہے، یہ خبر ہے، یہ مضاف ہے، یہ مضاف الیہ ہے، نہیں تو پھر استاد مختصراً یہ بتادے کہ عبارت یہ ہے اور مسئلہ یہ ہے، صورتِ مسئلہ بتادے، اور اس میں یہ چیز جائز ہے اور یہ ناجائز ہے، بس ختم، آگے یہ کہ اس کی دلیل کیا ہے؟ اس کی علت کیا ہے؟ اس میں فقہاء کے اقوال کتنے ہیں؟ ائمہ کا اختلاف کیا ہے؟ ہر امام کے قول کا مأخذ کیا ہے؟ یہ نہیں، یہ چیزیں ابتدائی طلبہ کے لئے مضر ہیں، یہ ان کے لئے نہیں ہیں۔

آگے حضرت مفتی صاحب فرماتے ہیں:

اگر اس کو مسئلہ معلوم ہوجائے تو اس کو آگے ہدایہ میں صرف دلیل سمجھنی ہوگی، مسئلہ پہلے سے یاد ہوگا، تو اس کے لئے آسانی ہوگی، لہذا ابتدائی کتب کو ہدایہ یا ترمذی نہ بنایا جائے، اور نہ ان کتب کو علم الجدل کی کتب بنایا جائے کہ فلاں نے یوں کہا اور اس کا جواب یہ ہے۔۔۔۔۔۔

ابتدائی کتب میں طالب علم کو صرف مسئلہ پر مرکوز رکھا جائے کہ طالب علم صرف مسئلہ سمجھے، یہ کہ کیا ہے؟ اور کیوں ہے؟ کیا دلیل ہے؟ یہ سب آگے چل کر معلوم ہوں گی، اب آگے چل کر قدوری، کنز، وغیرہ سب میں یہی ہو، کہ آپ مسئلہ پڑھیں، اس کی صورت بتائیں، پھر آگے چلیں، اس طرح آپ پوری کنز کو ایک سال میں نہیں بلکہ چار ماہ میں پڑھا سکتے ہیں، فائدہ طالب علم کو بھی ہوگا اور استاد کو بھی ہوگا۔

ہدایہ پڑھانے کا طریقہ:

ہدایہ کے پڑھانے کا آسان طریقہ میں آپ کو عرض کرتا ہوں:

(۱) جب ایک مسئلہ کی عبارت پڑھی جائے، تو مسئلہ نکلتا ہے قدوری سے، یا امام محمد کی الجامع الصغیر سے، تو آپ مسئلہ بتادیں کہ مسئلہ کی صورت کیا ہے۔

(۲) اس کے متعلق اختلاف، اگر اختلاف اس مسئلہ کے متعلق ہے تو اس کے اقوال۔

(۳) صاحب ہدایہ صاحبین سے اگر اختلاف ہوتا ہے تو ان کی دلیل کو مقدم ذکر کرتے ہیں اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی دلیل کو موخر، تو آپ یہی صورت یہی طریقہ استعمال کریں، یہ سب سے آسان اور اچھا طریقہ ہے، وہاں بھی لمبی چوڑی تقریر کی ضرورت نہیں، لیکن استاد اپنے سمجھنے کے لئے مثلا جیسے قدوری کی شروح ہیں یا مثلا کنز کی شرح البحر الرائق، البحر الفائق ہے یا دوسری جو شروح ہیں ان کو استاد پڑھے لیکن جو کچھ استاد پڑھے اسے خود ہضم کرے، آپ نے جو مطالعہ کیا وہ سارا کا سارا طالب علم کو بتانے کا نہیں ہوتا۔(رموز تدریس:۳۹تا۴۳)

نیز اس سلسلہ میں مفتی غلام الرحمن صاحب دامت برکاتہم جملہ کتب فقہ کے متعلق لکھتے ہیں:

ہمارے درس نظامی میں سب سے زیادہ توجہ فقہ پر دی جاتی ہے، اولی سے لے کر دورۂ حدیث تک طالب علم کا گہرا رابطہ فقہ سے رہتا ہے، نور الایضاح، مختصر القدوری، کنز الدقائق، اور شرح وقایہ تک طالب علم درجہ رابعہ تک کا سفر جاری رکھتا ہے، آگے جاکر درجہ ۔ ۔ اور سادسہ میں ہدایہ اولین (کتاب الصلاۃ اور کتاب النکاح) زیر درس رہتی ہیں، جب کہ سادسہ میں چالیس فیصد توجہ فقہ پر رہتے ہوئے ہدایہ آخرین (کتاب البیوع اور کتاب الشفعہ) پڑھائی جاتی ہیں، پھر دورۂ حدیث میں جاتے ہوئے احادیث کی تدریس میں اکثر فقہی مباحث میں طلبہ اور اساتذہ الجھے رہتے ہیں، لیکن طالب علم عملی میدان میں آتے ہوئے کوئی فقہی مسئلہ بڑی مشکل سے بیان کرسکتا ہے، کتابی مباحث طلبہ کو ازبریاد ہوتے ہیں، لیکن کسی جزئیہ کا استنباط اس کے لئے دور کی بات ہے۔

اس کی وجہ کیا ہے؟ مفتی صاحب مدظلہ اس کی وجوہات کا ذکر کرتے ہوئے ایک وجہ یہ بیان کرتے ہیں:

ہمیں طریقہ تدریس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے، ہم جس ماحول سے وابستہ ہیں اس میں فقہ کی کتابوں کی عظمت اتنی راسخ ہے کہ ان سے متبادل کتابوں کے بارے میں سوچنا جرم ہے، شاید کوئی اس سے بغاوت کے لئے تیار نہ ہو، یہ کام مدارس کی تنظیم وفاق المدارس کرسکتی ہے لیکن وہ بھی خوف یا غفلت کی وجہ سے کوئی قدم اٹھانے کے حق میں نہیں، اس لئے ہم متبادل طریقہ تدریس اپنانے پر مجبور ہیں کہ ان کتابوں کے ہوتے ہوئے طلبہ کی صلاحیتوں میں تدریجی ارتقاء پیدا ہو، اور معاشرہ پر فقہ پڑھنے والوں کی گہری نظر ہو، فقہ ہماری زندگی کا رہبر ہے اس کے بغیر اسلامی زندگی گزارنا یا دینی اقدار کو ترویج دینا مشکل ہے، پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ گلوبلائزیشن کے اس دور میں انتہائی تیز رفتاری سے تغیر پذیر ہونے والی صورت حال اور سائنس وٹیکنالوجی کی حیرت انگیزی کے نتیجہ میں آئے دن پیدا ہونے والے نت نئے مسائل کے حل کے لئے ہمیں دوسرے مذاہب کی ضرورت پڑے گی جس کے لئے دوسرے مذاہب سے صرف آگاہی کافی نہیں بلکہ ان سے مخاصمانہ رویہ کے بجائے منصفانہ رویہ کی ضرورت ہے، چنانچہ ہمیں موجودہ فقہ کو تین مراحل میں تقسیم کرنا چاہیے:

(۱) ثانویہ عامہ یعنی درجہ اولی اور درجہ ثانیہ میں فقہ کے حوالے سے ہماری توجہ کا مرکز صرف اور صرف فقہی مسائل کا حفظ اور ضبط ہو، فی المذہب یا فی الشرع اختلاف کی طرف بالکل توجہ نہ رہے، جس طرح "نورا لایضاح" میں مسائل بیان ہوتے ہیں، اس میں ہم فقہ کا پہلا حصہ عبادات اور عائلی زندگی رکھ لیں اور اولی کے طلبہ سے مسائل یاد کرائیں، اور درجہ ثانیہ میں فقہ کے دوسرے حصے یعنی معاملات پر توجہ ہو، ان دونوں سالوں میں اگر طلبہ کو مسائل کا حفظ مدنظر ہو تو دو سالوں میں طلبہ حفظ وافر کے مالک بن جائیں گے، موجودہ کتابوں میں قدوری سے یہ کام لیا جاسکتا ہے۔

(۲) ثانویہ خاصہ یعنی درجہ ثالثہ اور رابعہ میں توجہات کا مرکز مجتہدین فی المذہب ہونی چاہیے، تاکہ طلبہ میں فقہ حنفی کے باہمی اختلافات کا اندازہ ہوسکے، حضرت مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ امام ابوحنیفہ کی فقاہت کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب آپ اکیلے ہوں، اور صاحبین

دوسری جانب ہوں، اس میں شیخین، صاحبین اور طرفین پھر انفرادی طور پر رائے سامنے آئے، دلائل کا جائزہ لینا چاہئے، ظاہر ہے کہ اس درجہ میں امام زفر کے نکتہ نظر کو سمجھنا ہوگا، یہ ضرورت "کنزالدقائق" سے پوری نہیں ہوتی اس کے لئے شرح الوقایہ مکمل زیادہ مفید رہے گی، چنانچہ درجہ ثالثہ میں "شرح الوقایہ اولین" اور درجہ رابعہ میں "شرح الوقایہ آخرین" کی تدریس کرکے اندرون مذہب اختلافات سے آگاہی حاصل ہوسکتی ہے۔

(۴) درجہ عالیہ فقہ کے لئے اہم مرحلہ ہے، اگر طلبہ کی استعداد کی آب یاری پچھلے درجات میں ہوئی ہو تو اس مرحلہ میں پہنچ کر طلبہ میں تحقیق اور جستجو کا مادہ پیدا ہوگا، اس لئے خامسہ پہنچتے ہی کچھ وقت اصول مذاہب کو دینا چاہیے، یعنی طلبہ کی اس سے آگاہی ضروری ہے کہ مذاہب اربعہ کے اصول کیا ہیں، وہ حدیث پر عمل کرنے کے لئے کیا طریقہ اختیار کرتے ہیں، یہ کوئی نیا مضمون نہیں بلکہ "اصول الشاشی" اور "نورالانوار" پڑھے ہوئے قواعد وضوابط کا اعادہ ہے، تاہم انہیں یکجا کرنے کی ضرورت ہے، اس سے طلبہ کو دوسرے مذاہب کے بنیادی وسائل تک رسائی حاصل ہوگی، اور پھر ان اصول کو سامنے رکھتے ہوئے درجہ خامسہ اور سادسہ اور درجہ سابعہ میں فقہ کی تدریس ہو، اس کے لئے ہدایہ بہت موزوں کتاب ہے، چنانچہ یہاں آکر طلبہ کی استعداد بڑھ جاتی ہے، وہ مذہب کے جزئیات سے کافی حد تک آگاہی حاصل کرچکے ہوتے ہیں اور ایسا ہی وہ مذہب میں اختلافات کی وجوہات جان چکے ہوتے ہیں، اس لئے اب وسعت کی طرف قدم رکھتے ہوئے دوسرے مذاہب سے مجادلانہ اور مخاصمانہ اندازِ بیان سے نہ الجھیں بلکہ تحقیقی اندازِ بیان اختیار کرکے مذاہب کے اصول اور ان پر جزئیات کی تفریع اور پھر فقہ حنفی کی ترجیحات کا سہارا لیں، ممکن ہے اس طریقہ پر چلتے ہوئے دورۂ حدیث تک پہنچنے سے پہلے معاشرتی مسائل کے لئے فقہی حل کی استعداد طالب علم میں پیدا ہوسکتی ہے، ہدایہ کا انداز تدریس ایسا ہونا چاہئے کہ ائمہ کے اختلاف کی صورت میں دوسرے ائمہ کے اصول وضوابط سے طالب علم آگاہی حاصل کرے اور پھر فقہ حنفی کی ترجیحی وجوہات پیش ہوں، اس سے طلبہ میں تحقیق اور فقہی ذوق بھی پیدا ہوگا،

ممکن ہے کہ طریقہ تدریس کی تبدیلی سے فضلاء معاشرتی مسائل کے حل کے لئے قابل عمل صورتیں پیش کر سکیں۔

فقہ چونکہ عملی زندگی کا نام ہے، اس لئے اس کی تدریس میں صرف مسائل حفظ کروانا مقصود نہیں بلکہ اس کے ساتھ عملی تربیت کی ضرورت ہے، عبادات میں عملی مشاہدہ کروانا شاید آسان ہو لیکن معاملات میں عملی مشاہدہ کے لئے طلبہ کو مارکیٹ میں بھیجنا پڑے گا تاکہ طالب علم دکاندار کے طریقہ کار اور عرف سے آگاہی حاصل کرے، آج کل اقتصادیات تو دنیا میں معیار بنا ہوا ہے، اس لئے جدید مارکیٹ سے آگاہی بھی ضروری ہے۔(یادوں کے دریچے:۲۵۸تا۲۶۳)

حضرت مولانا مفتی ابولبابہ صاحب دامت برکاتہم اس کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:

سب سے پہلے فقہ پڑھنے پڑھانے کے دوران جس چیز کا خیال رکھنا چاہیے جس سے اس علم اور فن میں جان پیدا ہوتی ہے، وہ ہے خلاصۃ الباب کا یاد رکھنا۔

فقہاء نے جب یہ علم مدون کیا، تو بڑی معقول اور مربوط شکل میں مدون کیا، مثلاً: باب کے شروع میں وہ مبادی الباب بیان کرتے ہیں،یعنی تعریف، اقسام، ارکان، شرائط—— اور خاتمۃ الباب میں عوارض یا توابع بیان کرتے ہیں اور اصل مرکزی بحث جو بیچ میں ہوتی ہے اس کو مقاصد الباب کہتے ہیں، خلاصہ یہ کہ کوئی بھی باب پہلے مبادی پر مشتمل ہوتا ہے، پھر مقاصد پر آتا ہے اور پھر عوارض اور توابع پر جاکر ختم ہوجاتا ہے۔

جب تک خلاصۃ الباب مستحضر نہ ہو اس وقت تک اس باب کے مقاصد سمجھ میں نہیں آتے، کیونکہ فقہ کا علم ایسا ہے کہ اس کے بعض ابواب دوسرے ابواب کے سمجھنے کے لئے معاون بھی ہوتے ہیں اور موقوف علیہ بھی،——جب تک خلاصۃ الباب یاد نہ ہو تومقاصد الباب پر نظر نہیں رہ سکتی اور جب مقاصد الباب پر نظر نہ ہو تو نہ صرف یہ کہ اس باب میں رسوخ حاصل نہ ہوگا بلکہ دوسرے ابواب پر بھی گرفت کمزور ہوجائے گی۔

خلاصۃ الباب یاد کرنے کا طریقہ:

خلاصۃ الباب کے یاد کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ سبق جب آگے جائے تو باب کے شروع سے جو موٹا موٹا خلاصہ ہو وہ اگلے سبق کے ساتھ دہرا کر بیان کرنا چاہیے، اس سے جو نئی چیز سامنے آرہی ہے، اس کے لئے تمہید بن جاتی ہے اور اس کا سمجھنا آسان ہوجاتا ہے اور آخر باب تک اسی طرح دہرایا جاتا رہے تو بار بار تکرار کی وجہ سے آخر تک پہنچتے پہنچتے پورے باب کا خلاصہ کافی حد تک ذہن نشین ہوجاتا ہے۔

پچھلے زمانے میں علم میں پختگی کے لئے یوں کیا جاتا تھا کہ ہر فن سے ایک متن یاد کیا جاتا تھا، کتاب المتون حفظ کرنے کے لئے الگ سے چھپی ہوئی ہوتی تھی اور چونکہ ہمارے زمانے میں حفظ المتون کا سلسلہ نہیں رہا، لہذا اگر خلاصۃ الباب یاد کرلیا جائے تو کافی حد تک یہ حفظ المتن کا قائم مقام ہوجاتا ہے، مثلاً: مسح علی الخفین ایک باب ہے، اس کا خلاصہ کیسے ہوگا؟ دیکھئے! خود بخود ایک عقلی منطقی ترتیب سے فقہاء نے بیان کیا ہوا ہوگا، وہ یہ کہ پہلے تو اس کا وصف شرعی یعنی حکم کا ذکر ہوگا کہ وہ جائز ہے یا بدعت؟ ـــ مسنون ہے یا مباح؟ حکم کے بعد شرط کا بیان ہوگا، اس کے بعد اس کا وقت، یہ سب مبادی کہلائیں گے اور اس کے بعد مقاصد الباب موضع مسح، عدد مسح، کیفیت مسح، وغیرہ بیان ہوں گے، اور خاتمہ میں جاکر نواقض کا بیان ہوگا۔ (رموز تدریس:۱۵۸،۱۵۹)

درسی کتب فقہ کی دو اقسام:

کتب فقہ جو ہمارے یہاں پڑھائی جاتی ہیں وہ دو قسم کی ہیں ایک متون، جیسے قدوری، کنز، وقایہ، مختار، ان میں صورت اور حکم ہوتا ہے، دلیل نہیں ہوتی۔

دوسری قسم وہ کتابیں ہیں جن میں متن کے ساتھ شرح بھی پڑھائی جائے، ان میں دلیل بھی ہوتی ہے، جیسے: شرح وقایہ اور ہدایہ، ان کے اندر تینوں اجزاء ہوتے ہیں، صورت بھی، حکم بھی، اور دلیل بھی، گویا ہمارے نصاب میں شامل دو کتابیں قدوری اور کنز تو صورت اور حکم سے بحث کرتی ہیں، دلیل شرح میں یا حاشیہ میں موجود ہوتی ہے، جو مدرس کو اس کا خلاصہ تیار کرکے بیان کرنا پڑتا ہے اور شرح وقایہ اور ہدایہ دو ایسی کتابیں ہمارے اس برصغیر کے نصاب میں موجود ہیں جس کے اندر تیسرا جزء بھی ہوتا ہے،

صورت اور حکم کے ساتھ دلیل بھی۔

اب جو دلیل کسی صورت کا حکم ثابت کررہی ہوتی ہے وہ نقلی ہوگی یا عقلی، اگر وہ دلیل نقلی ہے تو اس میں اصول فقہ کا اجراء ہونا چاہیے، اور اگر وہ دلیل عقلی ہے تو اس میں قواعد فقہ کااجراء ہونا چاہیے۔

دلائل کے اجراء کا طریقہ:

دلیل نقلی کتاب اللہ سے ہے تو مدرس کو بیان کرنا چاہیے کہ اس آیت سے جو استدلال کیا گیا ہے یہ عبارۃ النص ہے یا دلالۃ النص یا اشارۃ النص۔

اور کتاب اللہ سے جو نص لی گئی ہے یہ ظاہر، نص، مفسر، محکم ہے یا مخفی، مجمل، مشکل، متشابہ۔

اگر دلیل نقلی سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے تو سنت کی کونسی قسم سے ہے؟ اس کو بیان کرنا چاہیے۔

اگر اجماع ہے تو اس کو بیان کرنا چاہیے کہ اجماع صریحی ہے یا سکوتی، اجماع مفرد ہے یا مرکب؟۔

اور اگر دلیلِ عقلی ہے تو وہ بھی تین قسم سے خالی نہیں: اقترانی، استثنائی اور تمثیل، یہ تمثیل وہی قیاس ہے، تو دلائل نقلیہ تین قسم سے خالی نہیں ہونگے، اصول فقہ کا جو مسئلہ یہاں سے متعلق ہے اس کو جاری کرنا چاہیے، نہیں جاری کرتے تو ہلکی سی خوشبو تو سونگھانی چاہیے طالبعلم کو۔

اور جب دلیل عقلی آجائے گی تو اس کے اندر قاعدہ کلیہ فقہیہ کونسا موجود ہے؟ وہ مسئلہ بیان کرنے سے پہلے بیان کردینا چاہیے کہ یہ مسئلہ ایک اصول پر کھڑا ہوا ہے، مشہور قواعد تو بالکل مستحضر ہونے چاہئیں، مثلاً:

للأكثر حكم الكل

التابع لا يفرد بالحكم

إذا ثبت الشيء ثبت بلوازمه

جب ہم نے اسلام کو عالمگیر مذہب مانا ہے اور دائمی مذہب مانا ہے کہ ہر زمان اور مکان میں

نافذ ہے تو اس کا لازمی مطلب یہ ہے کہ دنیا میں کسی مکلف سے ایسا کوئی فعل صادر نہیں ہوسکتا جو ان قواعد میں سے کسی قاعدے کے احاطہ میں آتا نہ ہو یہ ہمارے عقیدے کے خلاف ہے، یہ مسلمہ نظریہ کے خلاف ہوجائے گا، لیکن ہم ایسا کیوں نہیں کرسکتے؟ وجہ یہ ہے کہ دلائل نقلی گزرے اور ترجمہ پر اکتفاء کرلیا گیا۔

جبکہ فقہ کے طالبعلم کو لغوی ترجمہ کی ضرورت اسی ۸۰/فیصد نہیں پڑتی، بیس ۲۰/فیصد کوئی نئی لغت آجائے گی تو پڑے گی، مثلاً: الملك الثابت استنادًا ملك ضعيفٌ، اب الملك الثابت استنادًا یہاں استنادًا کے لفظ کے لئے اس کو ترجمے کی ضرورت نہیں پڑے گی کہ استناد سے یہاں مراد ٹیک لگانا ہے بلکہ استناد کا جو معنی فقہ میں اصطلاحا مراد لیا جاتا ہے اس کی ضرورت پڑے گی۔

اسی طرح ملكٌ ضعيفٌ میں اس کو ترجمے کی کیا ضرورت ہے؟ بلکہ فقہ میں ملک ضعیف سے کیا مراد ہے؟ اس معنی مراد کی اسے ضرورت ہے، اسی طرح قدوری کی پہلی دلیل: قال الله تعالى: {يا أيها الذين آمنوا إذا قمتم إلى الصلاة فاغسلوا وجوهكم} اس کے ترجمہ کی اس کو ضرورت کیا ہے؟ اس کے ترجمہ میں تو اصولِ فقہ کا اجراء ہونا چاہیے مثلاً: یہ کہ دلیل نقلی از کتاب اللہ استدلال بعبارۃ النص، یہ ترجمہ ہونا چاہیے، اور جب دلیل عقلی آجائے تو پہلے سے بتادے کہ یہ مسئلہ اس قاعدہ پر مبنی ہے یا اس ضابطہ پر کھڑا ہے۔

قاعدہ اور ضابطہ میں فرق:

آپ کو ضابطہ اور قاعدہ میں فرق تو اچھی طرح معلوم ہے کہ قاعدہ وہ ہے جو اکثر من باب میں جاری ہو، اور ضابطہ وہ ہے جو کسی ایک باب سے تعلق رکھتا ہو، جیسے الماء لا يعطى له حكم الاستعمال قبل الانفصال، یہ ضابطہ ہے جو صرف "باب الطہارۃ" میں جاری ہوگا۔

اور قاعدہ کی مثال ہے: اليقين لا يزول بالشك، اب یہ قاعدہ طہارت کے علاوہ کئی ابواب میں جاری ہوتا ہے۔

قاعدہ ذہن نشین کرانے کا طریقہ:

مسئلہ بیان کرنے سے پہلے ضابطہ یا قاعدہ مدرس عربی الفاظ میں بآواز بلند بیان کردے کہ یہ مسئلہ اس قاعدہ پر مبنی ہے اور اگر وہ قاعدہ پہلے سے ان کو یاد کیے ہوئے قواعد میں سے تھا تو طالب علم سے پوچھے: تم سناؤ، اگر ان میں سے نہیں تو خود پڑھ کر سنادے۔

قاعدہ اس کو پہلے بیان کردینا چاہیے، اور جب یہ قاعدہ اس نے مسئلہ سے پہلے بھی بیان کیا اور مسئلہ کی دلیل سمجھانے کے دوران بھی بیان کیا تو اب آہستہ آہستہ طالبعلم کے ذہن میں یہ بات آنی شروع ہوجاتی ہے کہ یہ مربوط اور معقول فن ہے۔

دو چیزیں ہوگئیں، پہلی یہ کہ جب بھی کوئی باب شروع کیا جائے آخر تک اس کا عقلی منطقی ربط ہوتا ہے، پہلے اس کے مبادی پھر مقاصد اور آخر میں عوارض ہوتے ہیں، ہر سبق کے ساتھ پچھلے اسباق کا خلاصہ بیان کرکے آخر باب تک جانا چاہیے،یہ جب مستحضر ہوجائے گا اگلے باب کا سمجھنا آسان ہوجاتا ہے، جیسے القرآن یفسر بعضُہ بعضًا، تو دوسرے علوم کا بھی یہی حال ہے کہ ایک علم دوسرے علم میں فائدہ دیتا ہے اور ہر علم کا ایک باب دوسرے باب میں فائدہ دیتا ہے۔

اور دوسری چیز جن کتابوں کے اندر دلائل بھی موجود ہیں،یعنی شرح وقایہ اور ہدایہ، تو اس میں دلائل نقلیہ میں اصول فقہ کا اور عقلیہ میں قواعد فقہ کا اجراء ہونا چاہیے۔

(رموز تدریس: ۱۶۳ تا ۱۶۵)

(٤)

عربی زبان اور ادب عربی سکھانے اور پڑھانے کے مفید اور آسان طریقے

عربی زبان کی اہمیت اور ضرورت

حضرت مولانا نورالبشر صاحب

ملاحظہ: مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عربی زبان کے طریقہ تدریس سے قبل ہمارے زمانے میں اس کی اہمیت اور ضرورت کو نابغہ عصر حضرت مولانا نورالبشر صاحب کی زبانی پیش کیا جائے، چنانچہ مولانا صاحب فرماتے ہیں:

یہ بات شاید کسی سے مخفی ہو کہ آج کے زمانہ او رہمارے اکابرین کے کل کے زمانہ کے درمیان زمین وآسمان کا فرق آگیا ہے، آج دنیا جس طرح سمٹ کر یکجا ہوگئی ہے مشرق ومغرب کے فاصلے سمٹ گئے ہیں پل پل کی خبریں براہ راست دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ رہی ہیں، اس کا تصور ہمارے ان بزرگوں کے زمانہ میں نہیں تھا۔

انہوں نے اپنے ذوق کی تسکین کے لئے اگر نادی الادب کی بنیاد ڈالی تھی تو صرف اتنی بات کے لئے کہ اپنے تراث کی حفاظت ہوسکے، قدماء عرب اور شعراء اسلام کی محاکات ہوسکے، جبکہ آج ہم سیاسی، سماجی، معاشرتی، دفاعی، ہر ہر میدان میں مجبور ہوگئے ہیں کہ اہل اسلام کا دفاع کریں، اغیار کی یلغار کو روکیں، غزو فکری کے عنوان سے ہمارے اوپر جو جنگ مسلط ہے اس میں بھرپور کردار ادا کریں، اور یہ اقدامی یا دفاعی کردار بغیر ایک موثر زبان کے، بغیر ایک موثر قلم کے، ادا کرنا ممکن نہیں۔

یہ موثر زبان کیا ہو؟ یہ موثر قلم کونسا ہو؟ اس سلسلے میں کسی ایسے شخص کا اختلاف ہرگز نہیں ہوسکتا جس کے اندر اسلام کا کچھ بھی شمہ ہو یا اپنے مسلمان ہونے اور نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا امتی ہونے کا ذرا بھی احساس ہو، کہ یہ زبان سوائے عربی کے اور کوئی زبان ہو نہیں سکتی۔

عصر حاضر میں صحرائے عرب میں اللہ تعالیٰ کی قدرت ومشیت سے جو زر سیال کے ابلتے ہوئے چشمے نمودار ہوئے ہیں، انہوں نے عالم عرب کا مقام کہیں سے کہیں پہنچادیا، آج حال یہ ہے کہ روس،

امریکہ، برطانیہ، فرانس اور جرمنی جیسے دشمنان اسلام بھی اپنے اقتصادی وسیاسی مفادات ومصالح کی خاطر اہل عرب کی بادیہ نشینوں کی خوشامد اور عربی زبان سیکھنے اور بولنے پر مجبور ہوگئے ہیں، اسی لئے تمام یورپین ممالک کے لئے عربی زبان وادب کی درس گاہیں کھولنا اور ان کو فروغ دینا ناگزیر ہوگیا ہے۔

آج ان ممالک کو عربی دان اساتذہ کی ضرورت ہے، جدید علوم وفنون کے عربی دان ماہرین کی ضرورت ہے، عربی دان ڈاکٹروں اور انجینئروں کی ضرورت ہے، اقتصادیات وتجارت کے ماہرین کی حاجت ہے۔

اگر ہم اس صورت حال پر غور کرکے عربی زبان کی اہمیت کو سمجھتے اور عربی زبان وادب کو بحیثیت لازمی مضمون کے حاصل کرکے افراد کی فراہمی کرتے تو آج عالم عرب پر منڈلاتے سارے گدھ چھٹ جاتے، جو خطرات آج عالم عرب پر اور پھر عالم اسلام پر منڈلارہے ہیں ان کا دور دور تک نام ونشان تک نہ ہوتا۔

پھر اس سلسلے میں اکابرین اور زعمائے ملت میں سے مفتی اعظم پاکستان حضرت مفتی محمد شفیع عثمانی صاحب رحمہ اللہ اور محدث العصر حضرت علامہ محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ اور حضرت مولانا وحید الزمان کیرانوی رحمہ اللہ اور عصر حاضر کے بعض اہم اداروں اور بعض چیدہ چیدہ علماء کرام کی محنتوں اور کوششوں کو سراہتے ہوئے ارشاد فرمارہے ہیں:

یہ کوششیں جو میں نے گوش گزار کیں، کیا عربی زبان کے فروغ اور مطلوبہ مقاصد کے حصول کے لئے یہی کافی ہیں؟ یا اس سلسلے میں مزید اقدام کی ضرورت ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ اب تک جو کوششیں ہوئیں وہ اپنی جگہ نہایت قابل قدر سہی، لیکن ابھی اس سلسلہ میں مزید محنت اور اقدام کی حد سے زیادہ ضرورت ہے۔

اس وقت ہمارے سامنے کئی تحدیات (چیلنجز) ہیں جن کے مقابلے کی ضرورت ہے۔

(۱) ایک طرف عربی زبان کی عالمگیریت، اہمیت، فضائل ومناقب اور ہمہ گیریت ہے، دوسری طرف انگریزوں اور یورپین ممالک کی سرگرمیاں ہیں، ہمارا ایمان ہے کہ عربی زبان کے اندر الحمد للہ! ہر جدّت کو ہضم کرنے کی صلاحیت موجود ہے، جدید سے جدید اصطلاح کو عربی کے سانچے میں

ڈھالنے کی قوت موجود ہے، اس کے باوجود عالم عرب کے اتنے ممالک اور ان کی افرادی قوت کے ہوتے ہوئے نیز عالم اسلام جس کا دینی اور جذباتی لگاؤ عربی زبان سے ہے، اس کے باوجود انگریزوں نے اپنی شاطری اور ہوشیاری کے ذریعہ اور مسلمانوں کے تعیش میں پڑنے کی وجہ سے یہ برسرزمین حقیقت اپنی جگہ بالکل درست ہے کہ انگریزوں کا جادو پوری دنیا پر چڑھ کے بول رہا ہے۔

آج سائنس اور ٹیکنالوجی کی زبان صرف انگریزی سمجھی جاتی ہے، انٹرنیٹ کی بنیادی زبان آج تک عربی میں رائج نہیں ہو سکی۔

یہ خدا نخواستہ عربی زبان کی اپنی خامی یا کوتاہی ہرگز نہیں، البتہ عربی زبان بولنے والوں اور اس کی طرف انتماء وانتساب رکھنے والوں کی کوتاہی ہے۔

ایسے موقع پر مجھے امام شافعی رحمہ اللہ کا قول یاد آتا ہے جو انہوں نے امام لیث بن سعد رحمہ اللہ کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ امام لیث مرتبہ ومقام اور علمیت کے اعتبار سے امام مالک رحمہ اللہ سے کسی بھی طرح کم نہیں تھے تاہم امام مالک کو ایسے شاگرد میسر ہوئے کہ انہوں نے ان کو اوج ثریا پر پہنچادیا، جبکہ امام لیث بن سعد کو یہ خصوصیت حاصل نہیں ہو سکی۔

بعینہ یہی صورت حال آج انگریزی اور عربی زبانوں کے ساتھ ہے، انگریزی کو باوجود اس کی ہزار خامیوں کے رواج دینے والے اور خدمت کرنے والے ایسے میسر آئے کہ اس کی نظیر نہیں، جبکہ حالیہ زمانے کے لحاظ سے عربی کی جس طرح خدمت کرنی چاہیے تھی وہ خدمت نہیں ہوئی۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ اپنے اندر ہم دینی تحمس پیدا کرکے ایک مشن سمجھ کر عربی زبان وادب کو فروغ دیں، اور یہ ثابت کردیں کہ جس طرح دنیا کے بہت سے ممالک اپنے یہاں انگریزی کا ایک لفظ بھی استعمال نہیں کرتے ہمیں بھی عربی زبان کے مقابلے میں انگریزی سمیت کسی بھی عجمی زبان کی ضرورت نہیں، اس تحمس کے ساتھ پھر ہمہ جہتی اقدام کی ضرورت ہے۔

اس سلسلے میں اصل کردار تو حکومتیں ادا کرسکتی ہیں لیکن یہ کیا ایک حقیقت نہیں کہ علماء دین

اور اصحابِ مدارس نے کبھی بھی کسی دینی کام کو حکومت پر تکیہ کرتے ہوئے چھوڑے رکھا ہو؟ ایسا کبھی نہیں ہوا، بلکہ اپنی بساط بھر کوشش، انفرادی واجتماعی طور پر وہ کرتے رہے ہیں، یہاں بھی اس طرح کی کوششوں کی ضرورت ہے۔

اس کے فروغ کے سلسلے کو اگر ہم اپنے پاس آنے والے طلبہ وطالبات تک محدود نہ رکھیں، بلکہ ہم اپنے ان مسلمان بھائیوں اور بہنوں تک بھی پہنچاسکیں جو ہمارے پاس نہیں آتے، تو یہ ایک نہایت موثر اقدام ہوگا۔

اس کی اہمیت اس طرح اور بڑھ جاتی ہے کہ ہمارے معاشرے میں انگریزی خواں طبقہ کی بہتات ہے، انگریزی بحیثیت ایک زبان کے بالکل معصوم سہی، اس کے اثرات کے لحاظ سے اسے معصوم ہرگز قرار نہیں دیا جاسکتا، اس زبان کے بارے میں ہمارے اکابرین کے سخت اقوال اس کی اسی بری اثرآفرینی کی وجہ سے ہیں۔

انگریزوں کے ممالک کی یاترا، انگریزی جرائد ومجلات کی بھرمار، انگریزوں کی بود وباش، یہ ساری چیزیں ہمارے طبقہ اشرافیہ پر اثرانداز ہیں، جبکہ یہ بات بھی مبنی بر حقیقت ہے کہ اگر عربی زبان کو فروغ دیا جائے اور ایسے طبقوں کے اندر عربی زبان رائج ہوجائے تو اس کے لاشعوری طور پر بھی اثرات ظاہر ہوں گے۔

اس کی بعینہ مثال وہی ہے جو صحبت صالح وصحبت طالح کی مثال حدیث شریف میں دی گئی ہے کہ اگر کوئی شخص عطار کے پاس بیٹھ جائے چاہے وہ عطر اور خوشبو نہ بھی لگائے تب بھی وہ اس سے مستفید ضرور ہوتاہے، جبکہ وہ شخص کسی لوہار کے پاس بیٹھتا ہے وہ اگرچہ آگ کی وجہ سے نہ جھلسے تاہم اس کے دھویں سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔

اس وقت ضرورت ہے کہ اہل مدارس اپنے مدرسوں کے ساتھ ساتھ معاشرہ میں عربی کے فروغ کے لئے باقاعدہ مراکز کھولیں، جس طرح اور جس انداز میں انگریزی کو پھیلایا جارہا ہے اسی طرح اور اسی انداز میں، مگر جائز حدود میں رہتے ہوئے عربی کے فروغ کی کوشش کی جائے۔

یہ عربی کے فروغ کی کوشش لوگوں کو دین کے قریب لائے گی، قرآن کریم کے قریب لائے گی، عبادت کے قریب لائے گی اور معاشرے میں اس کے دور رس اثرات مرتب ہوں گے۔

دنیادار طبقہ دین کو معاذ اللہ فلذہ مند نہیں سمجھتا، تاہم وہ عربی زبان کے فولڈ اور اس کے سیاسی واقتصادی مفادات ومصالح سے ضرور واقف ہے، اس لئے عربی زبان کے بہانے وہ دین سے قریب تر ہوجائے گا۔

(۲) اس وقت پورے عالم کے لوگوں کا سب سے بڑا مسئلہ مادہ، مادیات اور دنیا کی چکاچوند اور خیرہ کردینے والی رونقیں ہیں، ہر شخص کے پیش نظر مال ودولت اور کمالیات کا حصول ہے، ظاہر ہے کہ یہ ساری چیزیں اسلامی نقطۂ نگاہ سے سمِّ قاتل ہیں۔

دنیا والوں کو اس ورطہ سے نکالنے کے لئے ہمارے پاس قرآن کریم اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا طلساتی نسخہ موجود ہے۔

ہماری نالائقی اور سستی کی وجہ سے قرآن کریم پر ہاتھ صاف کرنے والے آج وہ لوگ ہیں جنہوں نے انگریزوں کے پاپوش کی صفائی میں اپنی زندگیاں بتادیں، نتیجہ یہ کہ انگریزوں اور دیگر اقوام عالم کے سامنے نہ تو قرآن کریم کے معانی ومفاہیم صحیح اور درست انداز میں پہنچ رہے ہیں اور نہ ہی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور آپ کا اُسوۂ حسنہ اس کے اصلی روپ میں پہنچ رہا ہے۔

ہدایت کے ان دونوں سرچشموں کو ان کی اصلی ہیئت میں پہنچانے کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟ کوئی شک نہیں کہ اس کی اولین ذمہ داری اولو الامر اور اصحابِ اقتدار پر ہے، لیکن آج جن کو انگریزوں کے کاسہ لیسی سے فرصت نہیں وہ کب اس ذمہ داری کو اٹھاسکتے ہیں؟۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس کی ذمہ داری بھی حضراتِ علماء اور اصحاب مدارس کے کاندھوں پر ہے جو اس دین کے اصل رکھوالے اور پہرے دار ہیں۔

آج پوری دنیا میں شور ہے کہ فلاں ملک نے گستاخ خاکے شائع کئے ہیں اور فلاں فلاں ممالک

گستاخی کے مرتکب ہیں، اس کے لئے ہم ہزار بائیکاٹ کا علاج سوچتے ہیں، لیکن ہمارا ایسا کوئی علاج کارگر ثابت نہیں ہوتا، اس کا علاج سوائے اس کے کیا ہے کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو ان دریدہ دہنوں کے سامنے اپنی اصل شکل وہیئت کے ساتھ پہنچا سکیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اپنے آپ کو خود منوائے گی اور {وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ} کا مظہر عالم پر آشکارا ہو کر رہے گا۔

(رموز تدریس: ۱۷۳، ۱۸۱)

عربی زبان
سکھانے کے مفید اور آسان طریقے

عربی زبان کی اہمیت اور ضرورت کے بعد اب ملاحظہ فرمائیں کہ حضرت ڈاکٹر صاحب مدظلہ اس زبان کی تعلیم وتعلم اور طریقہ تدریس کو کتنے آسان پیرائے میں سمجھا رہے ہیں اور گویا کہ انگلی پکڑ کے چلا رہے ہیں:

عربی تعلیم میں بلا واسطہ طریقہ تعلیم اور ترجمہ کا استعمال:

ہر چھوٹا بچہ اپنی مادری زبان اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں اور گھر کے دوسرے افراد سے سیکھتا ہے، اور اس بچے اور گھر کے افراد میں کوئی تیسرا فرد ترجمان نہیں ہوتا، بچہ ان افراد کی حرکات وسکنات کا مشاہدہ کرتا ہے، ان کی آپس کی گفتگو سنتا ہے، اپنے دائیں بائیں جو کچھ ہورہا ہے اسے دیکھتا اور محسوس کرتا ہے، اور پھر اس کی نقل کرنے کی کوشش کرتا ہے، اِدھر یہ لوگ اسے مادری زبان سکھانے کی پوری پوری کوشش کرتے ہیں، بار بار الفاظ کو دُھراتے ہیں اور اُس کے تلفظ کو صحیح کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اُن کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ بچہ زبان کو صحیح بولنا شروع کردے۔

اس کا مشاہدہ ہر شخص اپنے گھر میں، اپنے خاندان میں اور اپنے ماحول میں کرتا رہتا ہے کہ بچہ اپنی مادری زبان اپنے ماں باپ اور خاندان والوں سے براہ راست اور بغیر کسی ترجمان کے سیکھتا ہے اور یہی فطری طریقہ ہے، اور یہی فطری طریقہ عربی زبان یا کسی اور زبان کو سکھانے میں بھی استعمال کیا جاسکتا ہے، اور دنیا میں زبانوں کو سکھانے والے مختلف ادارے اس فطری طریقہ سے بھی کام لیتے ہیں۔

البتہ بچے کو مادری زبان سکھانے اور کسی بڑے اور سمجھدار شخص کو عربی یا کوئی اور زبان سکھانے میں ایک بنیادی فرق ہے، وہ یہ کہ چھوٹا بچہ تو اپنی عمر اور طبیعت کی بناء پر سوفیصد بلا واسطہ طریقہ تعلیم پر اکتفاء کرتا ہے، اور بتدریج آگے بڑھتا ہے، نیز ابھی اس کی عقل کمزور ہے، اور اس کے لئے وقت کا کوئی

مسئلہ نہیں، جبکہ بڑوں کو تعلیم دینے کے لئے سوفیصد بلا واسطہ طریقۂ تعلیم پر اکتفاء نہیں کیا جاسکتا، خصوصاً جبکہ اُن میں اور استاذ میں کوئی مشترک زبان موجود ہو، کیونکہ وہ بڑے ہیں اور ان کے پاس وقت بھی محدود ہوتا ہے، اس لئے بڑوں کے لئے بلا واسطہ طریقۂ تعلیم کے ساتھ ترجمہ کا استعمال بھی ضروری ہوتا ہے، اور دنیا میں مختلف زبانیں سکھانے والے علمی ادارے آج یہی اندازِ تعلیم اختیار کئے ہوئے ہیں، بلکہ بعض ادارے تو خالص ترجمہ کے ذریعہ تعلیم دیتے ہیں، اس سلسلہ کی یہاں دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

ایک بی بی سی لندن کا عربی جاننے والوں کے لئے انگریزی زبان کی تعلیم کا پروگرام، اور دوسری مثال قاہرہ ریڈیو کا وہ پروگرام جس میں انگریزی جاننے والوں کو عربی زبان سکھائی جاتی ہے، چنانچہ بی بی سی لندن انگریزی زبان کی تعلیم اور تشریح کے لئے کلی طور پر عربی زبان استعمال کرتا ہے، اور قاہرہ ریڈیو عربی زبان کی تعلیم کے لئے سو فیصد انگریزی زبان سے کام لیتا ہے۔

اس لئے عربی زبان کی تعلیم کے لئے بلاواسطہ طریقۂ تعلیم کے ساتھ ترجمہ اور مشترک زبان کے استعمال سے وقت کی بچت اور پڑھنے والوں کے لئے آسانی ہوتی ہے، اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے ایک مثال پیش کی جاتی ہے:

جب ہم بڑوں کو عربی زبان سکھانے کی ابتداء کرتے ہیں تو پہلے مفرد الفاظ اور چھوٹے چھوٹے دو لفظوں والے جملوں سے شروع کرتے ہیں، اور اِن جملوں میں (مَا؟ اور مَنْ؟) کو بار بار سوال میں استعمال کرتے ہیں، چنانچہ بعض اشیاء کی طرف اشارہ کرتے ہوئے طالب علم سے پوچھتے ہیں: مَا هذا؟ تو وہ جواب میں بطور مثال کہتا ہے: هذا كتابٌ، هذا بابٌ، هذا شُبَّاكٌ، وغیرہ، اسی طرح بعض اشخاص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُن سے پوچھتے ہیں: مَن هذا؟ تو وہ جواب میں بطور مثال کہتا ہے: هذا طالبٌ، هذا خالدٌ، هذا محمودٌ، وغیرہ، اب اِن دو لفظوں (مَا؟ اور مَنْ؟) کے بار بار استعمال سے ایک ذہین طالب علم تو دونوں میں فرق سمجھ جائے گا، لیکن طلبہ کی مجموعی علمی کیفیت کو دیکھتے ہوئے یہاں اس بات کی ضرورت ہے کہ اُن کو (مَا؟ اور مَنْ؟) کا فرق سمجھایا جائے، تاکہ وہ اس فرق کو سمجھنے کے بعد ان الفاظ کو بصیرت کے ساتھ استعمال کر سکیں۔

اب اگر استاذ یہ فرق اُن کو عربی زبان میں سمجھانا چاہے تو یہ مشکل ہے کیونکہ وہ عربی نہیں جانتے، ابھی ان کی ابتداء ہے، لیکن اگر یہ فرق اُن کو اُس زبان میں سمجھادیا جائے جو وہ جانتے ہیں، تو وہ بآسانی یہ فرق سمجھ جائیں گے، اور آیندہ ان کا استعمال بصیرت کیساتھ کرسکیں گے، نیز یہ مشترک زبان بعض غیر موجود اشیاء اور معانی اور غیر محسوس چیزوں کو سمجھانے کے لئے بھی استعمال کی جاسکتی ہے، اور اس طرح وقت بھی بچایا جاسکتا ہے۔

اسی طرح جب افعال کو سمجھانے کا مرحلہ آئے گا تو استاذ ابتداء افعال سے کرے گا، جنہیں وہ عملی طور پر طلبہ کے سامنے پیش کرسکے اور کسی دوسری زبان کے واسطہ کی ضرورت پیش نہ آئے، مثلاً: استاذ چاہتا ہے کہ طلبہ کو آخُذُ، أفتَحُ، أقرأ، أغلِقُ اور أضَعُ کے افعال سکھائے تو وہ سب کے سامنے:

کتاب کو لیتے ہوئے کہے گا:	أنا آخُذُ الكتابَ۔
پھر اسے کھولتے ہوئے کہے گا:	أفتَحُ الكتابَ۔
پھر اسے پڑھتے ہوئے کہے گا:	أقرَأُ الكتابَ۔
پھر اُسے بند کرتے ہوئے کہے گا:	أغلِقُ الكتابَ۔
پھر اسے رکھتے ہوئے کہے گا:	أضَعُ الكتابَ۔

لہذا طلبہ استاذ کی حرکات کو دیکھتے ہوئے، اور بار بار اِن افعال کی مشق سے اِن کے معانی سمجھ جائینگے، لیکن جب استاذ اُن کو ایسے افعال سکھانا چاہے گا جن کا تعلق دل، نفس کی کیفیات اور معنوی چیزوں سے ہے، جیسے الفَرَحُ، الألَمُ، وغیرہ، تو اِن افعال کو بلاواسطہ سمجھانے میں اُسے بڑی محنت صرف کرنی پڑے گی، اور وقت بھی زیادہ صرف ہوگا، لہذا ایسے موقعے پر ترجمہ اور استاذ اور شاگردوں میں مشترک زبان کا فائدہ ظاہر ہوگا، اور استاذ اِن افعال کے معانی کو پہلے اُن کی زبان میں سمجھادے گا، پھر عربی میں خوب مشق کرائے گا، اس طرح محنت بھی کم خرچ ہوگی اور وقت بھی، اور طلبہ اِن افعال کے معانی اچھی طرح سمجھ کر ان کا استعمال کرسکیں گے۔

تنبیہ: ترجمہ سے مقصد افعال کے معانی کو طلبہ کے ذہن میں خوب واضح کردینا ہوتا ہے لیکن یہ ہرگز

صحیح طریقہ نہیں کہ بس اسی ترجمہ پر اکتفاء کرلیا جائے، بلکہ اس کے بعد ان عربی افعال کی مشق شروع کردینی چاہیے، اور انہیں بار بار مختلف صورتوں میں استعمال کیا جائے، اور اس دوران دوسری کسی زبان کا استعمال روک دیا جائے۔

مثلاً طلبہ کو فَرِحَ اور حُزْنٌ کا معنی پہلے ترجمہ کے ذریعہ اچھی طرح سمجھادیا جائے اور پھر اِن افعال کو مختلف صورتوں میں استعمال کیا جائے، مثلاً:

هل تفرحُ برؤيةِ والديك؟ هل تحزن إذا فاتتْكَ صلاةُ الجماعة؟۔۔۔۔وغیرہ۔

اسی طرح جب صرف یا نحو کا کوئی قاعدہ سمجھانا ہو جس کا تعلق اس سبق سے ہے، اور کوئی مشترک زبان بھی نہ ہو تو بڑی محنت اور مشقت اٹھانی پڑیگی، لیکن اگر مشترک زبان موجود ہے تو آسانی کے ساتھ اُن کو سمجھایا جاسکتا ہے، البتہ سمجھانے کے بعد اُس زبان کو چھوڑ کر صِرف عربی میں مشق کرائی جائے، اور کثرت سے اس قاعدہ کی مثالیں پیش کی جائیں۔

یہ وہ مفید طریقہ ہے جسے عربی زبان کے اساتذہ کرام کو استعمال کرنا چاہیے، اور یہی طریقہ دنیا کی مشہور زبانوں کے سکھانے میں استعمال کیا جاتا ہے۔

آگے حضرت ڈاکٹر صاحب مدظلہ فرماتے ہیں:

غیر عرب کو عربی پڑھانے کی ابتداء کیسے کی جائے؟

اساتذۂ کرام!

اب آپ کو یہ بتانا ہے کہ آپ غیر عرب کو عربی زبان پڑھانے کی ابتداء کیسے کریں؟ کیونکہ یہ ایک بنیادی اور اہم مرحلہ ہے اس لئے اس کو نہایت غور سے پڑھا جائے۔

اس کے جواب کے لئے تھوڑی سی تفصیل کی ضرورت ہے، وہ یہ کہ جن طلبہ کو آپ عربی پڑھانے کی ابتداء کررہے ہیں وہ عموماً دو قسم کے لوگ ہوں گے، پہلی قسم وہ لوگ ہوں گے جو عمر میں بڑے، سمجھدار اور ایسے مسلمان طلبہ ہوں گے جنہوں نے کم از کم ناظرہ قرآن کریم پڑھا ہوا ہے، اور وہ عربی کے الفاظ کو اچھی طرح پہچانتے اور پڑھ سکتے ہیں، اگرچہ اُن کے معانی نہیں جانتے، ہمارے عربی مدارس میں

درجہ اولی(السَّنة الأولى الثانوية العامة) کے طلبہ کا عموماً یہی حال ہوتا ہے، کیونکہ وہ مڈل یا میٹرک پڑھ کر آتے ہیں اور قرآن کریم صرف ناظرہ کی حد تک پڑھے ہوئے ہوتے ہیں، لہذا ایسے طلبہ کو براہِ راست عربی زبان سکھانا شروع کردیں، ان کو حروف تہجی(ا، ب، ت، ث ــــ) سکھانے کی ضرورت نہیں۔

پڑھنے والوں کی دوسری قسم وہ ہے کہ آپ کے سامنے بیٹھنے والے طلبہ غیر مسلم ہوں، یا مسلمان ہوں لیکن اپنے ماحول یا مخصوص حالات کی بناء پر وہ عربی کے حروف تہجی سے بھی واقف نہ ہوں، جیسا کہ غیر مسلم ممالک میں رہنے والے بعض مسلمان خاندانوں کی حالت ہے، تو ایسے طلبہ کو عربی پڑھانے کے لئے ہمیں ابتداء حروف تہجی(ا، ب، ت، ث ــــ) سے کرنی ہوگی۔

اُن کو حروف تہجی یاد کرائے جائیں، لکھائے جائیں، پھر مرکب الفاظ پڑھائے اور لکھائے جائیں، اور خوب اِن کی مشق کرائی جائے، تاکہ وہ اِن کو اچھی طرح پہچاننے لگیں، اور لکھ بھی سکیں، اور اس کے لئے حروف تہجی سکھانے والے قاعدوں میں سے کسی اچھے قاعدہ کا انتخاب کرلیا جائے، اور اسے پڑھایا جائے، عربی کے استاذ کا یہ نصب العین ہونا چاہیے کہ وہ جس قدر عربی پڑھائے اُسی قدر طلبہ کو اس کا پڑھنا لکھنا اور بولنا آنا چاہئے۔

اب جبکہ طلبہ عربی حروف کو پہچاننے لگ جائیں یا آپ کے سامنے وہ طلبہ ہیں جو پہلے سے عربی الفاظ کو پہچانتے ہیں تو اب آپ اُن کو عربی پڑھانا شروع کردیں، اور اس کے لئے بنیادی طور پر بلاواسطہ تعلیم کا طریقہ (ڈائریکٹ میتھڈ) استعمال کریں، اور جس کے لئے مندرجہ ذیل ترتیب زیادہ موزوں اور آسان ہے:

ا۔ عرب زبان سکھانے کے لئے مفرد الفاظ سے ابتداء کی جائے، اور مفرد الفاظ بھی وہ جو محسوس چیزوں سے تعلق رکھتے ہوں اور جن کو طلبہ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔

جتنا ممکن ہو ان چیزوں کو آپ اپنے ساتھ درسگاہ میں ساتھ لائیں، اور طلبہ کے سامنے میز یا تپائی پر رکھ دیں، پھر ان میں سے ایک ایک چیز کو لے کر طلبہ کے سامنے ہاتھ میں اٹھاتے ہوئے بلند آواز سے اس کا صحیح تلفظ کریں، تاکہ ہر طالب علم اسے دیکھ سکے اور آواز سن سکے، مثلاً آپ ہاتھ میں کتاب

اٹھاتے ہوئے اللہ کا نام لینے کے بعد کہیں: كتابٌ، كتابٌ، كتابٌ یعنی دو تین بار بلند آواز سے اس لفظ کو کہیں، پھر طلبہ سے کہیں کہ وہ سب مل کر اجتماعی طور پر آپ کے ساتھ اس لفظ کو دھرائیں، آپ کہیں: كتابٌ، پھر وہ سب کہیں: كتابٌ، اور یہ عمل کئی بار کریں، پھر کسی ایک طالب علم کی طرف اشارہ کریں کہ وہ بآواز بلند سب کے سامنے اسے دھرائے، اسی طرح دوسرے طلبہ سے۔ ایک ایک کی طرف اشارہ کر کے کہلوائیں۔ اور اگر تعداد زیادہ ہے، تو چیدہ چیدہ چند طلبہ سے کہلوائیں۔ اب کتاب رکھ دیں، اور قلم ہاتھ میں لے لیں، اور اسی طرح سب کے سامنے بآواز بلند دو تین بار کہیں: (قلم -قلم -قلم) پھر طلبہ کو اشارہ کریں کہ وہ آپ کے ساتھ اجتماعی شکل میں اس کا نام لیں اور پھر مختلف طلبہ کی طرف اشارہ کریں کہ وہ باری باری اسے دھرائیں۔ پھر ایک ہاتھ میں کتاب اور دوسرے ہاتھ میں قلم لے کر کبھی ایک کو سامنے لائیں اور طلبہ اجتماعی شکل میں کہیں، اور کبھی دوسری کو لائیں اور ترتیب بدل کر پوچھیں۔ اب اگر آپ دیکھیں کہ طلبہ ان مفرد الفاظ کو زبان سے صحیح ادا کر رہے ہیں، تو پھر ایک قدم آگے بڑھیں، اور ایک ہاتھ میں کتاب لے کر دوسرے ہاتھ سے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یوں کہیں: هذا قلمٌ۔ هذا قلمٌ۔ هذا قلمٌ۔

پھر حسب سابق سب طلبہ اجتماعی طور پر استاذ کے ساتھ اس جملہ کو دھرائیں، پھر ایک ایک طالبعلم باری باری سب کے سامنے یہ جملہ دھرائے۔ اس کے بعد مختلف موجود چیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان کا نام لیں اور جملوں میں اضافہ کرتے جائیں۔ مثلاً: هذا ورقٌ - هذا كرسی - هذا بابٌ۔ هذا طالبٌ وغیرہ۔ اگر آپ دیکھیں کہ طلبہ ان جملوں کا تلفظ صحیح کر رہے ہیں اور ان کا مفہوم سمجھ چکے ہیں، تو اب ایک قدم اور آگے بڑھیں، اور ایک ہاتھ میں کتاب لے کر دوسرے ہاتھ سے استفہام کا اشارہ کرتے ہوئے ان سے سوال کریں: (ما هذا؟) اور اس جملہ کو ان کے سامنے دو تین بار دھرانے کے بعد خود ہی اس کا جواب دیں: هذا كتابٌ۔

پھر طلبہ سے سوال کریں (ما ہذا؟) وہ سب کہیں: هذا كتابٌ، اور اُسے بار بار دھرائیں۔ پھر ایک ایک طالبعلم سے الگ الگ پوچھیں، اور جن چیزوں کو وہ جان چکے ہیں، ان میں سے ہر ایک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان سے سوال کریں: (ما هذا؟) اور طلبہ اجتماعی شکل میں جواب دیں مثلاً: (هذا قلمٌ۔ هذا

ورقٌ- هذا کرسيٌّ وغیرہ)پھرایک ایک طالبعلم سے سوال کریں اوروہ جواب دے۔اوردرسگاہ میں موجود چیزوں میں سے ایک ایک کااضافہ کرتے جائیں،تاکہ طلبہ کے ذہن میں عربی الفاظ کے ذخیرہ میں اضافہ ہوتارہے۔

مختلف اشیاء کے ساتھ اسم اشارہ (هذا)استعمال کرنے کے بعداب آپ اسے انسانوں کے ساتھ استعمال کریں اورمثلایوں کہیں: هذا طالبٌ، هذا أستاذٌ- هذا خالدٌ وغیرہ۔

پھرکسی ایک کی طرف ہاتھ سے استفہام کااشارہ کرتے ہوئے کہیں۔(من هذا؟) اور جواب میں طلبہ اجتماعی طورپر کہیں:(هذا طالبٌ)-(هذا خالدٌ وغیرہ) اور حسب سابق پہلے اجتماعی طورپرسوال کریں اورپھرانفرادی طورپر،تاکہ یہ الفاظ طلبہ کوخوب ذہن نشین ہوجائیں،اوراسی ترتیب سے آگے بڑھتے جائیں۔

تختہ سیاہ(بلیک بورڈ)کااستعمال:

اساتذہ کرام!

روزاول سے آپ کے ذہن میں یہ بات رہنی چاہیے کہ آپ کے طلبہ عربی پڑھنا، لکھنا،اوربولنا سیکھیں۔اس لئے آپ تعلیم کاانداز پہلے دن سے ایسارکھیں کہ ان کویہ تینوں چیزیں ساتھ ساتھ حاصل ہوتی رہیں، لہذاعربی بول چال کے ساتھ ان کولکھنابھی سکھائیں اوراس کے لئے تختہ سیاہ اورکاپی کااستعمال ناگزیرہے۔اوراس کاآسان طریقہ یہ ہے کہ دوران تعلیم ہرمرحلہ میں زبانی مشق کے بعد ان الفاظ یاجملوں کوتختہ سیاہ پرلکھتے جائیں،مثلا جب آپ نے ابتداء میں چندمفردات ان کوسکھادیئے توآب انہیں سب کے سامنے لکھ دیں:

كتابٌ-قلمٌ- ورقٌ-بابٌ- كرسيٌّ وغیرہ۔

اوراس کے بعدجب مختصرجملے سیکھ چکیں توان کوبھی بعدمیں لکھتے جائیں مثلا:

هذا كتابٌ　　هذا قلمٌ　　هذا بابٌ

ما هذا؟　　هذا كتابٌ،　　ما هذا؟　　هذا قلمٌ

من هذا؟　　هذا طالبٌ　　من هذا؟　　هذا خالدٌ۔

اس طرح آپ کے طلبہ آپ کو لکھتے ہوئے دیکھ کر لکھنا سیکھیں گے، لہذا ہر سبق ختم ہونے سے چندمنٹ پہلے طلبہ سے کہیں کہ اب ان الفاظ اور جملوں کو اپنی اپنی کاپیوں میں خوشخط طریقہ سے لکھ لیں۔

عربی قواعد (گرامر) کی تعلیم:

جب آپ کے طلبہ پہلے درس میں اسم اشارہ (ھذا) کا استعمال، اور (مَا؟ اور مَنْ؟) استفہامیہ کا استعمال سیکھ جائیں تو اب آپ ان کو ان کی زبان میں (ھذا) اسم اشارہ کا قاعدہ سمجھادیں، کہ قواعد کی رو سے اسے اسم اشارہ کہتے ہیں۔ اور یہ مفرد مذکر کے لئے استعمال ہوتا ہے جب کہ وہ نزدیک ہو، اور یہ کہ (مَا؟) سے غیر ذوی العقول اشیاء کے بارے میں، اور (مَن؟) سے ذوالعقول کے بارے میں سوال کیا جاتا ہے۔

تنبیہ: عربی زبان سیکھنے والے طلبہ کے لئے لازم ہے کہ وہ عربی کے قواعد (صرف ونحو) بھی سیکھیں، تاکہ وہ عربی زبان کو بصیرت کے ساتھ بول سکیں، لیکن اس بات کا خیال رکھاجائے کہ عربی سکھاتے وقت قواعد بقدر ضرورت سکھائے جائیں، جتنا کہ اس درس سے ان کا تعلق ہے، نہ اتنی وسعت دی جائے کہ عربی کا درس صرف ونحو کا درس بن جائے اور نہ بالکل ترک کیاجائے کہ طالب علم کو بصیرت ہی نہ ہو، اس کا نمونہ: الطريقة العصرية الجزء الأول کے پہلے درس میں دیکھ لیں، کہ پہلے درس میں (ھذا) اسم اشارہ مذکر کا استعمال ہے، کیونکہ سب مثالیں مذکر کی دی گئی ہیں، اور (ھذا) کا قاعدہ بھی آخر میں بیان کردیا گیا ہے، لیکن اس ساتھ اسم اشارہ (ھذہ) جو مؤنث کے لئے ہے، اس کا ذکر نہیں کیا گیا، بلکہ اسے دوسرے سبق میں ذکر کیا گیا ہے جہاں اس کا استعمال ہوا ہے۔

اسم اشارہ (ھذا) کے استعمال اور قاعدہ بیان کرنے کے بعد اب آپ اس کا دائرہ وسیع کرنا شروع کردیں، اور دوسرے اسمائے اشارہ کو بالترتیب آئندہ اسباق میں استعمال کریں، مثلاً:

(ھذہ) اسم اشارہ برائے مفرد مؤنث قریب۔

پھر دور کی مفرد مذکر اشیاء کی طرف اشارہ کرتے ہوئے (ذاك) اور (ذلك).

پھر مفرد مونث اشیاء کی طرف اشارہ کرتے ہوئے (تلك) کا استعمال کریں، اور اچھی طرح مشق کرنے کے بعد پھر تثنیہ اور جمع کے اسماء اشارہ کا استعمال کریں اور مشق کرائیں، اور اس کے لئے مختصر جملے استعمال کریں مثلاً ہاتھ میں دو کتابیں اور دو قلم لے کر طلبہ کے سامنے یوں کہیں:

هذان كتابان- هذان قلمان وغیرہ۔

پھر دو سے زیادہ کتابیں اور قلم لے کر کہیں: هذه كتب- هذه أقلامٌ وغیرہ۔

پھر طلبہ میں سے دو کو کھڑا کر کے کہیں: هذان طالبان-هذان ولدان وغیرہ۔

پھر سب کی طرف اشارہ کر کے کہیں: هؤلاء طلابٌ، هؤلاء أولادٌ وغیرہ۔

اور ہر ایک کی مشق کے بعد اس کا قاعدہ اور طریقہ استعمال ان کو سمجھاویں، اس کا نمونہ دیکھنا ہو تو: الطريقة العصرية في تعليم اللُّغة العربية کے پہلے جزء کے ابتدائی اسباق کو دیکھ لیا جائے۔

ضمائر کا استعمال:

اسماء اشارہ کے بعد اب آپ ایک قدم اور آگے بڑھیں اور ضمائر کا استعمال شروع کریں، اور اس کی ابتداء متکلم، مخاطب اور غائب کی مفرد ضمیروں سے کریں، مثلاً:

أنا استاذٌ- أنت تلميذٌ-هو تلميذٌ۔

اور ان جملوں کو بار بار سوال جواب کی صورت میں استعمال کریں: مثلاً:

مَن أنا؟ مَن أنت؟ مَن هو؟

یہاں تک کہ طلبہ (أنا-أنت -هو) کے معانی اور استعمال کو اچھی طرح سمجھ جائیں، اور آخر میں ان ضمائر کے قاعدے بھی ان کو سمجھادیں۔

مفرد ضمائر کے بعد تثنیہ اور جمع کے ضمائر مرحلہ وار ترتیب کے ساتھ سکھاتے جائیں، مثلاً:

أنتما طالبانِ- هما طالبانِ-

نحنُ رجلانِ۔ أنتم طلابٌ۔

ھم طلابٌ۔ نحنُ رجالٌ، وغیرہ۔

اور ان مرفوع ضمائر کے بعد اسی ترتیب سے مجرور ضمیروں کا بھی استعمال کریں، اور ہر مرحلہ میں خوب مشق کرانے کے بعد ان کے قواعد بھی سمجھاتے جائیں۔

چھوٹے جملوں کے بعد اب آپ درمیانے جملوں کا استعمال شروع کردیں، ابھی تک آپ نے وہ جملے استعمال کئے ہیں جو صرف مبتداء اور خبر سے مرکب تھے، اب ان جملوں میں بعض حروف اور صفات کا اضافہ کرتے جائیں، اور ایسے جملوں میں استعمال کریں جن کو آپ طلبہ کے سامنے عملاً پیش کرسکیں، مثلاً مندرجہ ذیل جملے:

القلمُ في الجیبِ۔ الکتابُ علی المَکتبِ۔

خالدٌ في الفصلِ۔ ھذا ورَقٌ أبیضُ۔

ھذا ورقٌ أسودُ۔ ھذا قلمٌ أحمرُ۔ وغیرہ۔

نیز جن حروف اور صفات وغیرہ کا آپ اضافہ کریں، تو مشق کے بعد ان کے قواعد بھی بتلاتے جائیں۔

جملہ فعلیہ کا استعمال:

ابھی تک آپ جملہ اسمیہ کا استعمال کرتے چلے آئے ہیں، اور طلبہ مختصر جملہ اسمیہ کا استعمال کرنے لگے ہیں، اور یہی فطری طریقہ ہے، تو اب آپ جملہ فعلیہ کا استعمال شروع کردیں، اور اس کی ابتداء فعل مضارع کے مفرد متکلم کے صیغہ سے کریں، تاکہ آپ عملی طور پر ان افعال کو طلبہ کے سامنے پیش کرسکیں، مثلاً:

آپ سامنے رکھی ہوئی کتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہیں: ھذا کتابٌ۔

پھر کتاب کو ہاتھ میں لیتے ہوئے کہیں: أنا آخذُ الکتابَ۔

پھر کتاب کھولتے ہوئے کہیں: أنا أفتح الکتابَ۔

پھر کتاب پڑھتے ہوئے کہیں: أنا أقرأ الکتابَ۔

پھر اُسے بند کرتے ہوئے کہیں: أنا أغلقُ الکتابَ۔

پھر اسے میز پر رکھتے ہوئے کہیں: أنا أضعُ الکتابَ علی المَکتبِ۔

ان افعال کو طلبہ کے سامنے اداء کرتے ہوئے بار بار دُھرائیں، پھر کسی سمجھدار طالب علم سے کہیں کہ وہ ان افعال کو اداء کرے، اسی طرح باری باری کئی طالب علموں سے کہا جائے۔

جب آپ مطمئن ہوجائیں کہ طلبہ ان افعال کا استعمال اور مفہوم اچھی طرح سمجھ گئے ہیں، تو اب متکلم سے مخاطب کی طرف منتقل ہوجائیں اور ایک طالب علم سے کہیں کہ وہ اِن افعال کو اداء کرے، اور آپ اُسے خطاب کرتے ہوئے کہیں:

أنتَ یا فلان! تأخذُ الکتابَ-وتفتح الکتابَ،

وتقرأ الکتابَ، وتُغلق الکتابَ، وتضع الکتابَ علی المَکتبِ۔

اسی طرح مخاطب کے اِن افعال کو آپ دو تین بار کہیں، پھر طلبہ سے کہلوائیں، کہ ایک طالب علم یہ افعال بجا لائے، اور دوسرا اُسے مخاطب کے صیغوں سے خطاب کرے۔

مخاطب کے صیغے ذہن نشین ہونے کے بعد آپ مخاطب سے غائب کی طرف منتقل ہوجائیں، اور ایک طالبِ علم کو اِن افعال کے اداء کرنے کا حکم دیں، اور آپ طلبہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہیں:

هذا خالدٌ، هو یأخذ الکتابَ، ویفتح الکتابَ،

ویقرأ الکتابَ، ثم یُغلقُ الکتابَ، ویضعُ الکتابَ علی المَکتبِ۔

اِن افعال کو بھی بار بار خود کہیں، اور طلبہ سے کہلوائیں، یہاں تک کہ یہ اُن کے ذہن نشین ہوجائیں۔

یاد رہے کہ آپ اِن افعال کو اکھٹے بھی استعمال کرسکتے ہیں، اور چاہیں تو ایک ایک دو، دو کرکے استعمال کریں، اُسی ترتیب کے ساتھ، اور طلبہ جب ان تینوں صورتوں (أفعلُ، تفعلُ، نفعلُ) کو سمجھ جائیں، تو اب آپ سوال وجواب شروع کردیں، اور کتاب لیتے ہوئے:

ایک طالب علم سے سوال کریں: ماذا أفعلُ؟

وہ جواب میں کہے گا: أنتَ تأخذُ الكتابَ۔

اب کتاب کھولتے ہوئے سوال کریں: ماذا أفعلُ؟

وہ کہے گا: أنتَ تفتح الكتابَ۔

یہی عمل طالب علم کرے اور آپ اُس سے سوال کریں: ماذا تفعلُ؟

وہ جواب میں کہے: أنا آخذُ الكتابَ، أفتحُ الكتابَ۔

اب کسی اور طالب علم سے اس کے بارے میں سوال کریں، مثلاً: ماذا يفعلُ خالدٌ؟

وہ جواب میں کہے گا: هو يأخذُ الكتابَ، ويفتح الكتابَ۔۔۔إلخ

اسی طرح مختلف افعال کی خوب مشق کرائیں، تاکہ طلبہ اُن کو بآسانی تینوں صورتوں: متکلم، مخاطب، غائب) میں استعمال کر سکیں۔

اب آپ اُن کو فعل مضارع کا مفہوم، مفرد متکلم، مخاطب اور غائب کی علامت بتائیں، اور ایک صیغہ سے دوسرے صیغہ میں بدلنے کا طریقہ سکھائیں، أفعلُ، تفعَلُ، نفعَلُ۔

اس کے بعد بالترتیب مفرد کے بعد تثنیہ اور جمع کے صیغوں کا استعمال سکھائیں، نیز مذکر مؤنث کے صیغے تینوں حالتوں میں سکھائیں، اور ہر مرحلہ کے افعال کی مشق کے بعد اُن کے ضروری قواعد ساتھ ساتھ سمجھاتے جائیں۔

فعل امر کا استعمال:

جب آپ طلبہ کو فعل مضارع سکھائیں، تو اس کے ساتھ ساتھ فعلِ امر بھی سکھائیں اور اس کی مشق کرائیں، مثلاً جب آپ جملہ فعلیہ کا پہلا سبق پڑھائیں تو اُن افعال کی پہچان اور عملی مشق کے بعد ہر ایک فعل کا فعل امر بھی استعمال کرتے جائیں، مثلاً:

آپ ایک طالب علم کو حکم دیں: خُذِ الكتابَ يا خالدُ۔

وہ جواب میں کتاب کو ہاتھ میں لیتے ہوئے کہے گا:	آخُذُ الکتابَ۔
پھر اس سے کہیں: افتح الکتابَ! وہ کہے گا:	أفتَح الکتابَ۔
پھر اس سے کہیں: اِقرَأ الکتابَ! وہ کہے گا:	أقرَأُ الکتابَ۔
پھر اس سے کہیں: أغلق الکتابَ! وہ کہے گا:	أغلِق الکتابَ۔
پھر آپ کہیں:	ضَع الکتابَ علی المکتبِ!
وہ کہے گا:	أضَعُ الکتابَ علی المکتبِ۔

پھر مختلف اشیاء کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امر کے صیغے استعمال کریں اور اُن سے عمل کرائیں اور جواب سنیں، مثلاً:

خُذِ القلمَ! خُذِ الورَقَ!

اِفتَحِ البابَ! اِفتَحِ الشبّاكَ!

اِقرأِ الرِّسالةَ! اقرَأِ الفاتحةَ!

أغلِقِ البابَ! أغلِقِ الشباكَ!

ضَعِ القلمَ في الجيبِ۔ ضَعِ الرسالةَ علی المَکتبِ۔ وغیرہ۔

اسی طرح جب فعل مضارع کے تثنیہ اور جمع کے صیغے استعمال کریں تو بالترتیب اُن کے ساتھ ساتھ تثنیہ اور جمع کے امر کے صیغے بھی استعمال کرتے جائیں، اور خوب مشق کرائیں، مثلاً دو طالب علموں کو حکم دیتے ہوئے کہیں:

خُذَا الکتابَ! افتَحا الکتابَ!

اقرَءا الکتابَ! أغلِقا الکتابَ!

ضَعَا الکتابَ علی المکتبِ۔

پھر طلبہ کی جماعت کو امر کرتے ہوئے کہیں:

خُذُوا الکتابَ! افتَحوا الکتابَ!

اقرء وا الکتابَ!　　　أغلِقوا الکتابَ!

ضَعُوا الکتابَ علی المَکتبِ۔

فعل ماضی کا استعمال:

فعل مضارع کے استعمال اور معانی اور قواعد جان لینے کے بعد اب آپ کے لئے فعل ماضی کی طرف منتقل ہونا اور طلبہ کو اس کی مشق کرانا آسان ہو جاتا ہے، مثلاً آپ نے فعل مضارع میں واحد متکلم کے جو افعال طلبہ کو سکھائے ہیں، اُن کو دوبارہ اُن کے سامنے اسی طرح دُھرائیں جیسے:

آخذُ الکتابَ، أفتح الکتابَ، أقرأ الکتابَ، أغلِق الکتابَ، أضَع الکتابَ علی المَکتبِ۔

اب آپ اِن ہی افعال کو ماضی سے تعبیر کریں، اور طلبہ کو خطاب کرتے ہوئے یوں کہیں:

أنا أخذتُ الکتابَ، وفتحتُ الکتابَ، وقرأتُ الکتابَ، ثم أغلقتُ الکتابَ، ووضعتُ الکتابَ علی المَکتبِ۔

پھر آپ کسی طالب علم کو حکم دیں کہ وہ اِن افعال کے فعل مضارع مفرد متکلم کے صیغے استعمال کرنے کے بعد اب اُن کی تعبیر فعل ماضی کے متکلم کے صیغوں سے کرے: أخذتُ الکتابَ، فتحتُ الکتابَ، قرأتُ الکتابَ — إلخ

اور اس کے کہنے کے بعد آپ اُسے خطاب کرتے ہوئے ماضی کے مفرد مذکر مخاطب کے صیغے استعمال کریں، مثلاً:

أنت یا خالد! أخذتَ الکتابَ، وفتحتَ الکتابَ، وقرأتَ الکتابَ، ثم اغلقتَ الکتابَ، ووضعتَ الکتابَ علی المَکتبِ۔

پھر کسی طالبِ علم سے کہیں کہ خالد کو خطاب کرتے ہوئے یہی افعال استعمال کرے۔

پھر آپ طلبہ کو خطاب کرتے ہوئے خالد کے اِن افعال کو غائب کے صیغوں سے تعبیر کریں اور کہیں:

خالدٌ أخَذَ الكتابَ، وفتحَ الكتابَ، وقرأ الكتابَ، ثم أغلقَ الكتابَ، ووضعَ الكتابَ على المكتبِ۔

اس طرح بار بار ان افعال کو خود کہیں اور طلبہ سے کہلوائیں، اور ساتھ ساتھ ضروری قواعد بتاتے جائیں۔

نیز مفرد کے صیغوں کے بعد بالترتیب تثنیہ، جمع، اور مذکر ومؤنث کے افعال سکھائیں، اور ان کی بار بار مشق کرائیں۔

فعل نہی کا استعمال:

آپ کے طلبہ اب افعال کی تین قسموں (مضارع، ماضی، امر) کو سیکھ چکے ہیں، لہذا اب ان کو فعل نہی کا استعمال سکھانا بہت آسان ہے، آپ مناسب افعال کا انتخاب کر کے اُن سے نہی کے صیغے استعمال کریں، مثلاً:

ایک طالب علم کو کھیلتا دیکھیں تو اُس سے کہیں: یا خالد! لا تلعبْ۔

ایک طالب علم کو بات کرتے ہوئے دیکھیں تو اس سے کہیں: یا شاهد! لا تتكلَّمْ۔

ایک طالب علم کو بے جا بیٹھا ہوا دیکھیں تو اس سے کہیں: یا ناصر! لا تجلِس هنا۔

اور اِن جیسے افعال مثلاً:

لا تَضحَك، لا تلفِتْ، لا تَنَمْ، لا تكذِبْ، لا تَشتِمْ، لا تضرِبْ وغیرہ۔

اور مفرد کے بعد بالترتیب تثنیہ اور جمع کے صیغے استعمال کرتے جائیں، اور ان کے ضروری قواعد بھی ساتھ ساتھ سکھاتے جائیں۔

اب ان سب افعال کے سمجھنے اور بولنے کے بعد ان سے بنے ہوئے فعلیہ جملوں میں وسعت پیدا کریں، اور ان میں حروف جر، مفعول بہ اور بقیہ متعلقاتِ فعل کا اضافہ کرتے جائیں، جیسے:

يَذْهَبُ التِّلْمِيْذُ إِلَى الْمَدْرَسَةِ۔ يَحْفَظُ خَالِدُ الدَّرْسَ۔

جَلَسَ شَاهِدٌ عَلَى الْكُرْسِيِّ۔ لَعِبَتْ الطِفْلَةُ فِي الْحَدِيْقَةِ۔ وغیرہ۔

اور ایسے افعال کا کثرت سے استعمال کریں جن کی ضرورت دن رات میں زیادہ پڑتی ہے۔

تنبیہ: آپ طلبہ کو جتنا کثرت سے بلوائینگے اور افعال کی مشق کرائینگے اتنا ہی وہ صحیح بولیں گے اور اس طرح کی غلطیاں نہیں کریں گے مثلا: أنا يقرأ، أنت أكتبُ- خالدٌ تذهبُ- نحن نشربون- وغیرہ۔

اس کے بعد آہستہ آہستہ مسلسل گفتگو کی مشق کرائیں، پھر چھوٹے چھوٹے قصے اور کہانیاں پڑھائیں، اور انہیں یاد کرائیں۔

عربی زبان پڑھانے کیلئے جس ترتیب کا ذکر سابقہ اوراق میں کیا گیا ہے تقریبا یہی ترتیب آپ کو کتاب: الطريقة العصرية في تعليم اللّغة العربية کی پہلی اور دوسری جزء میں ملے گی۔ والله المُوفق-

عربی رسم الخط:

عربی پڑھانے والے استاذ کیلئے ضروری ہے کہ وہ عربی رسم الخط کی طرف پوری توجہ دے، اور عربی پڑھاتے وقت لکھنے، پڑھنے، اور بولنے تینوں امور کا اہتمام کرے۔

اگر آپ کے طلبہ پہلے سے عربی لکھنا جانتے ہیں تو آپ انہیں عربی پڑھانا شروع کردیں، لیکن اگر طلبہ ایسے ہیں جو عربی کے حروف سے بالکل ناواقف ہیں، اور قرآن کریم ناظرہ تک نہیں پڑھے ہوے، تو پہلے آپ ان کو عربی کے حروف تہجی سکھائیں(ا، ب، ت، ث، ج۔۔۔۔) پھر ان سے مرکب مفرد الفاظ، پھر جملے لکھنا اور پڑھنا سکھائیں، اس کے لئے تھوڑا وقت اور محنت درکار ہوگی، اور جب طلبہ عربی حروف کو لکھنے اور پہچاننے لگیں تو اب ان کو عربی پڑھانا شروع کریں۔

لیکن عربی مدارس میں عموما پہلی جماعتوں میں آپ کے سامنے ایسے طلبہ ہوں گے جو عربی حروف کو پہچانتے اور پڑھ سکتے ہیں، ہاں بعض کا خط اچھا ہوگا اور بعض کا معمولی ہوگا۔

ایسے طلبہ کو جب آپ عربی پڑھانا شروع کریں، تو کتاب کا ہر سبق ان سے لکھائیں، اور ان کو تاکید کریں کہ کتاب سامنے رکھ کر ویسا ہی لکھنے کی کوشش کریں، اگر آپ نے ان سے یہ پابندی کرائی تو

تھوڑے ہی عرصہ میں۔انشاء اللہ۔ان کے خط صاف ہوجائیں گے، کیونکہ زبان کی صفائی کیلئے کثرت سے بولنا، اور خط کی صفائی کیلئے کثرت سے لکھنا ضروری ہے۔

عربی انشاء:

عربی پڑھنے والے طالب علموں کے لئے انشاء نہایت ضروری ہے، لیکن اس کا مرحلہ تب آئے گا جب طالب علم عربی سمجھنے اور بولنے لگ جائے اوراس کے پاس عربی الفاظ کا معتد بہ ذخیرہ جمع ہوجائے،اب استاذ کو اس طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے، کہ وہ طلبہ کو انشاء کی مشق کرائے، لیکن اس کا معیار طالب علم کی تعلیمی سطح کے مطابق ہو، جیساکہ الطريقة العصرية في تعليم اللّغة العربية کی جزء ثانی میں اس کی مثالیں موجود ہیں، وہاں چھوٹی چھوٹی حکایات اور نزهةٌ في البستان (باغ کی سیر) جیسے اسباق آپ کو ملیں گے۔

لہذا طلبہ کو انشاء کا عادی بنانے کے لئے پہلے انہیں آسان طریقہ سکھائیں، مثلا جب وہ ایک چھوٹی سی حکایت پڑھ لیں اور اگر اس کا تعلق مذکر سے ہے تو آپ طلبہ سے کہیں کہ وہ اسے مؤنث میں بدل دیں، چونکہ وہ حکایت طالب علم کے سامنے ہے اس لئے اس کا کام محدود اور ضمیر کو بدلنا ہے، مستقل کہانی بنانی نہیں ہے۔

اس نقطہ کی وضاحت کے لئے ایک مثال الطريقة العصرية في تعليم اللّغة العربية جزء ثانی کے صفحہ نمبر ۵۲ سے پیش کی جاتی ہے، جس کا عنوان ہے:

الأمانة

وَجَدَ خَالدٌ فِي المُدْرَسِةِ قلمًا غاليًا فأخذه وسلّمه إلى مدير المَدرسةِ فشكره، ولمّا وقف التلاميذ صفوفًا سألَ المُديرُ عن صاحب القلم، وسلّمه إياه، ومدح خالدًا لِأمانته، وكتب اسمُه على السبورة۔

اب اس سبق کو سمجھنے کے بعد آپ طلبہ سے کہیں کہ اب اس حکایت میں (خالد) کے بجائے (فاطمہ) کا نام لکھ کر عبارت کو مذکر سے مؤنث میں بدل دیں، اس طرح کہ جہاں مذکر کے افعال ہیں

ان کو مؤنث کے افعال میں، اور جہاں مذکر کی ضمیریں ہیں ان کو مؤنث کی ضمیروں میں بدل دیں۔

تاکہ طلبہ کے لئے عملی طور پر مشق آسان ہو اور وہ اسے اچھی طرح سیکھ لیں، بہتر یہ ہوگا کہ آپ یہ حکایت بورڈ پر لکھیں، اور پھر ان کے سامنے مذکر افعال اور مذکر ضمائر کو مؤنث افعال اور مؤنث ضمائر میں بدلتے جائیں۔ مثلاً:

الأمانة

وَجَدَتْ فاطمةُ فِي المدْرَسةِ قلمًا غاليًا فأخذتْه وسلَّمتْه إلى مديرةِ المدرسةِ فشكَرتها، ولمَّا وقفتِ التلميذت صفوفًا سألَتِ المديرةُ عن صاحبةِ القلم، وسلّمتْه إيّاها، ومدحتْ فاطمةَ لِأمانتها، وكتبتْ اسمَها على السبورة۔

اور طلبہ کے سامنے مزید اس قاعدہ کو واضح کرنے کے لئے مذکر اور مونث الفاظ کو آمنے سامنے اس طرح لکھیں:

مذکر	مونث	مذکر	مونث
وجدَ	وجدَتْ	التلاميذ	التلميذاتُ
خالدًا	فاطمة	خالدٌ	فاطمة
سألَ	سألَتْ	لأمانته	لأمانتِها
أخذَ	أخذتْ	المديرُ	المديرةُ
كتبَ	كتبتْ	سلَّمَ	سلَّمتْ
صاحب القلم	صاحبة القلم	اسمَه	اسمَها
مدير المدرسة	مديرة المدرسة	سلَّمه	سلَّمتْه
وقفَ	وقفتْ	شكره	شكرتْها
إياه	إياها	مدحَ	مدحتْ

اور ساتھ ساتھ قاعدہ اور طریقہ بھی ان کو سمجھائے جائیں، اِس طرح ایک سے زائد حکایات کی

مشق کرائیں۔

اس کے بعد مرحلہ وار ایک قدم اور آگے بڑھیں اور مختلف اشیاء کے اوصاف اور کیفیات کو عمدہ انداز میں تعبیر کرنے اور پیش کرنے کی مشق کرائیں مثلاً طلبہ جب وہ درس پڑھیں جس میں باغ کی سیر اور باغ کا خوبصورت منظر پیش کیا گیا ہے، جیسے اس کے درخت، پھول، پھل، سبزہ، پانی، چڑیوں کی آوازیں وغیرہ، تو اب استاذ کو چاہیے کہ اس سے ملتا جلتا موضوع ان کو لکھنے کے لئے دے، جیسے اگر طلبہ چھٹیوں میں کسی گاؤں میں گئے ہیں یا کسی پہاڑ اور وادی کی سیر کی ہے، تو اب وہ اس گاؤں اور پہاڑ کے بارے میں اپنے مشاہدات عمدہ انداز میں لکھیں، اور ساتھ ساتھ استاذ کو چاہئے کہ مضمون کی ترتیب اور عمدہ جملوں کے استعمال میں اُن کی راہنمائی کرتا رہے۔

اسی طرح آگے چل کر اگر کسی شخصیت کے بارے میں کوئی درس آئے تو اس کے پڑھنے کے بعد اس جیسی دوسری علمی اور دینی شخصیات پر لکھنے کے لئے طلبہ سے کہا جائے، اور استاذ ساتھ ساتھ راہنمائی کرتا رہے، مثلاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے درس کے بعد اب خلفاء راشدین اور اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے یا ائمہ فقہاء میں سے کسی کا نام دے کر لکھنے کو کہا جائے، اور ان کے عمل کو محدود کرنے کے لئے جملے یا صفحات کی تحدید کردیں۔

اس کے بعد چھوٹے چھوٹے مضامین لکھنے اور حکایات بنانے کی ان کو عادت ڈالیں، اور ساتھ راہنمائی کرتے جائیں۔

باقی رہا بڑے اور علمی مضامین لکھنا تو اُن کا تعلق بڑی جماعتوں سے ہے جب یہ طلبہ وہاں پہنچیں تو وہاں ان کو مشق کرائی جائے۔ واللہ الموفق۔

(عربی زبان غیر عرب کو آپ کیسے پڑھائیں: ۵۱تا۳۳)

درجہ اولیٰ تا درجہ خامسہ ادب عربی کیسے پڑھایا جائے؟

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم

عربی کا معلم اور طریقہ جدیدہ:

(۱) "عربی کا معلم" پڑھانے کا مقصد بیک وقت نحو وصرف کا اجراء طالب علم کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ کرنا، اور عربی تحریر کی بتدریج صلاحیت پیدا کرنا ہے، لہذا اس کی تعلیم میں ان تینوں امور کو مد نظر رکھا جائے۔

(۲) "عربی کا معلم" کی تمرینات میں "عربی سے اردو" والا حصہ زبانی کرانے پر اکتفا کیا جاسکتا ہے، لیکن "اردو سے عربی" والا حصہ لازماً تحریری ہونا ضروری ہے، طلبہ کو ان مشقوں کے لکھنے کا پابند بنایا جائے۔

(۳) "طریقہ جدیدہ" اور "الطریقۃ العصریۃ" کا اصل مقصد "بطریق مباشر" عربی سکھانا ہے، لہذا اسے حتی الامکان عربی ہی میں پڑھایا جائے۔

(۴) تمام الفاظ طلبہ سے کہلائے جائیں اور ان میں تلفظ کی صحت کا اہتمام کیا جائے، تلفظ یا لہجے میں بھی اگر کوئی غلطی ہو تو طالب علم کو ٹوک کر اس کی اصلاح کرائی جائے۔

(۵) تمام تمرینات پہلے زبانی کرائی جائیں، پھر تحریری، "طریقہ جدیدہ" کی تمرینات کا مقصد یہ ہے کہ عربی الفاظ صحیح تلفظ کے ساتھ طالب علم کی زبان پر چڑھیں، اور رفتہ رفتہ اس کے عربی بولنے میں روانی پیدا ہو جائے، بعض اوقات اساتذہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان تمرینات میں سوال ہی کے الفاظ کو طالب علم سے دہرانے کی مشق کرائی گئی ہے، جس سے طالب علم کے ذہن پر کوئی خاص زور نہیں پڑتا، اس لئے وہ تمرینات کو بیکار سمجھ چھوڑ دیتے ہیں، لیکن یہ طرز عمل درست نہیں، ان تمرینات سے طالب علم کو عربی جملے بولنے کی رفتہ رفتہ عادت پڑ جاتی ہے، لہذا وہ بہت ضروری ہے۔

(۶) چونکہ "طریقہ جدیدہ" اور "الطریقۃ العصریۃ" کا اصل مقصد طالب علم کو عربی بولنے کا عادی بنانا ہے، اس لئے ان کتابوں کے درس میں حتی الامکان عربی بولنے کا التزام ضروری ہے، اگر طالب علم شروع میں پورے جملے نہ سمجھ پائے تب بھی کچھ حرج نہیں، اس کی وجہ سے عربی میں گفتگو ترک نہ کی جائے، انشاء اللہ رفتہ رفتہ وہ عربی الفاظ کے عادی بنتے جائیں گے اور یہ رکاوٹ دور ہونی شروع ہوگی، لیکن اگر نہ سمجھنے کے ڈر سے شروع ہی میں

عربی بولنا ترک کر دیا گیا تو اس درس کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا، اور پھر عربی بولنے کی مشق کبھی نہیں ہو سکے گی۔

زاد الطالبین، القراءۃ الراشدہ اور معلم الانشاء:

ان کتابوں کا مقصد "عربیت" کا ذوق اور ادبی جملوں کی فہم پیدا کرنا، نیز ان میں نحو وصرف کے قواعد کا اجراء، اور بالآخر خود صحیح عربی جملے بولنے اور لکھنے کی مشق کرنا ہے، لہذا ان کتابوں کا صرف ترجمہ کرانے پر اکتفانہ کیا جائے۔

(۱) ترکیب اور نحوی قواعد کے اجراء پر زور دیا جائے۔

(۲) نئے الفاظ کے لغوی معنی بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان کا محل استعمال بتایا جائے، اور ان الفاظ کے محل استعمال کو بیان کرنے کے لئے از خود مثالیں دی جائیں، اور پھر طلبہ سے ان الفاظ کو جملوں میں استعمال کرایا جائے۔

(۳) تمام تمرینات زبانی اور تحریری دونوں طریقے سے اہتمام کے ساتھ طلبہ سے کرائی جائیں، اور تحریری کام کر کے نہ لانے والے طالب علم کو تنبیہ کی جائے۔

اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ عربیت کا ذوق پیدا کرنے میں کتاب سے زیادہ استاذ کو دخل ہوتا ہے، اگر استاذ میں خود ذوق نہیں ہے، تو کتاب خواہ کتنی اچھی ہو طالب علم کے اندر یہ ذوق پیدا ہونا مشکل ہوتا ہے لہذا استاذ کو چاہئے کہ وہ خود اپنے ذوقِ عربیت کو ترقی دینے کی فکر کرے، ادبی کتابیں اپنے عام مطالعے میں رکھے اور خود اپنی تحریر وتقریر کی مشق کو خارج اوقات میں بڑھاتا رہے۔

نفحۃ العرب:

اس کتاب کا مقصد ہلکی پھلکی ادبی نثر کے ذریعہ رفتہ رفتہ عربی ادب تک طالب علم کی رسائی پیدا کرنا ہے، لہذا اس کتاب کا صرف ترجمہ کرانے پر اکتفانہ کیا جائے، بلکہ مندرجہ ذیل امور کا اہتمام کیا جائے۔

(۱) نئے الفاظ کے لغوی اور مستعمل اور افعال کے باب اور اسماء کے جمع ومفرد کا بیان اور ان کا محل استعمال۔

(۲) نئے انداز کے جملوں کی نحوی ترکیب۔

(۳) قواعد نحو وصرف کا اجراء۔

(۴) نئے الفاظ کو جملوں میں استعمال کرنے کی مشق۔

(۵) ادب کی ہر کتاب سے یہ مقصد بھی ضرور حاصل کرنا چاہئے کہ عربی الفاظ اور عربی جملے طلبہ کی زبانوں پر چڑھیں، اور عربی بولنے کی جھجک دور ہو، اس غرض کے لئے ہر درس کے آخر میں استاذ کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسی درس کی حکایت کے بارے میں طلبہ سے عربی میں سوالات کرے، اور عربی ہی میں طالب علم ان کا جواب دے۔

مقامات حریری:

یہ کتاب ایک خاص دور کی ادبی نثر کی نمائندگی کرتی ہے، جس میں قافیہ بندی اور سجع کے اہتمام، استعارات وتشبیہات کی کثرت اور محسنات بدیع کے پر تکلف استعمال کو پسند کیا جاتا تھا، لیکن یہ ذوق ایک خاص دور کا تھا، نہ اس دور سے پہلے اس کا رواج تھا، نہ اس کے بعد باقی رہا، لہذا اب اس کتاب کی تدریس کا منشا یہ نہیں ہے کہ طلبہ اپنی تحریر وتقریر میں اسلوب کی پیروی کریں بلکہ اس کا منشا ایک تو اس دور کی نثر سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرنا ہے، دوسرے طالب علم کے ذخیرہ الفاظ کو اتنا بڑھانا ہے کہ اس میں ہر دور کی ادبی نثر کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔

مقامات حریری کا مسجع اسلوب اگرچہ اب متروک ہو چکا ہے لیکن اس کا ذخیرہ الفاظ تمام تر متروک نہیں ہوا، چنانچہ مقامات کے بیشتر الفاظ اب بھی اعلیٰ ادبی تحریروں میں مستعمل ہیں، انہی جیسے الفاظ سے جدید مفاہیم کی تعبیریں، اور جدید اسالیب کلام وجود میں آئے ہیں، اس میں استعمال ہونے والی کہاوتیں آج بھی ادبی تحریروں کی جان ہیں، لہذا استاذ کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان تمام امور سے واقف ہو کر یہ کتاب اس طرح پڑھائے کہ اس سے:

(۱) طالب علم کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ ہو۔

(۲) اگر وہ لفظ قرآن کریم یا کسی مشہور حدیث میں آیا ہے تو اس کا قرآنی مفہوم معلوم ہو۔

(۳) اس کو الفاظ کا صحیح محل استعمال معلوم ہو۔

(۴) ان الفاظ کو اگر کسی جدید مفہوم کی تعبیر کے لئے استعمال کیا جارہا ہے تو اس کا علم حاصل ہو۔

(۵) کتاب کی ضرب الامثال کی حقیقت اور ان کا موقع ومحل سمجھ میں آجائے۔

(۶) ایک جیسے الفاظ کے درمیان معانی کا اگر کوئی فرق ہے تو وہ واضح ہو۔

ان مقاصد کے حصول کے لئے استاذ کو مندرجہ ذیل امور کا اہتمام لازماً کرنا چاہئے:

(١) الفاظ کی لغوی تحقیق میں بہت زیادہ پھیلاؤ سے اجتناب کرے، بعض جگہ معمول یہ ہے کہ لفظ کی لغوی تحقیق کرتے ہوئے اس کے تمام مشتقات اور تمام ابواب کا ذکر ضرور کرتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طالب علم اس اصل لفظ کے معنی ہی کو بھول جاتا ہے، لہذا لغوی تحقیق میں اس توسع کے بجائے ہر لفظ کے صرف وہ معنی بتائے جائیں جو اس جگہ مراد ہیں، اگر وہ فعل یا شبہ فعل ہے تو اس کا باب اور اسی مادے میں مجرد کے ابواب کے اختلاف سے یا صلے کے استعمال سے کوئی فرق آتا ہے تو وہ فرق بیان کیا جائے، اور اگر اسم ہے تو مفرد کی جمع اور جمع کا مفرد بیان کرنے پر اکتفا کیا جائے۔

(٢) لغوی تحقیق میں مذکورہ بالا توسع کے بجائے اس لفظ کا محل استعمال ذہن نشین کرانے پر زور دیا جائے، یعنی یہ بتایا جائے کہ یہ لفظ آج کل مستعمل ہے یا نہیں، اگر مستعمل ہے تو کن معانی میں؟ اس کا حقیقی استعمال کس طرح ہوتا ہے؟ اور مجازی استعمال کس طرح؟ اگر کوئی اسم ہے تو اس کی صفت مبالغہ کیا استعمال ہوتی ہے؟ اور پھر ان تمام استعمالات کو خود بھی مثالوں سے سمجھایا جائے اور طلبہ سے بھی اس کی مثالیں بنوائی جائیں۔

(٣) کتاب کی اردو شرحوں کے استعمال پر پابندی لگائی جائے۔

دیوان المتنبی:

یہ کتاب شعراءِ مولدین کے زمانے کی شاعری کا نمونہ پیش کرنے کے لئے نصاب میں رکھی گئی ہے، اس کی تدریس میں ان تمام امور کا اہتمام کیا جائے جو مقامات حریری کے ذیل میں بیان کئے گئے ہیں، مزید باتیں یہ ہیں:

(١) اس بات کا اہتمام کیا جائے کہ طلبہ کو شعر پڑھنے کا صحیح طریقہ آئے، جو طلبہ شعر کو پڑھتے وقت لے سے وزن سے خارج کر دیتے ہیں، انہیں اس غلطی پر ہمیشہ ٹوک کر اصلاح کی جائے۔

(٢) حکمت پر مبنی اشعار زبانی یاد کرائیں جائیں۔

(٣) ترکیب کے اختلاف سے معانی میں تبدیلی کی نشان دہی کی جائے۔

(٤) اشعار میں جو محسنات بدیع آتے ہیں ان کی نشان دہی کی جائے۔

(٥) بلاغت کے دوسرے نکات بھی واضح کئے جائیں۔

(٦) کتاب کے اردو ترجموں اور شرحوں کے استعمال پر پابندی لگائی جائے۔

حضرت مفتی صاحب اپنی اسی کتاب میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

عربی زبان کو نئے اسلوب سے پڑھانا چاہئے:

ادب کی تعلیم میں انشاء کے لئے مستقل وقت رکھ کر اس کی باقاعدہ تربیت کی ضرورت ہے اس غرض کے لئے بھی اس وقت بہت سی کتابیں دستیاب ہیں: مثلاً "الاسلوب الصحیح للانشاء" "معلم الانشاء" وغیرہ، ان سے اس سلسلے میں مدد لی جاسکتی ہے......

لیکن عربیت کا ذوق پیدا کرنے کے لئے ان تمام چیزوں سے زیادہ اہمیت جس بات کو حاصل ہے وہ مدرسے کی مجموعی فضا میں عربیت کا چلن ہے، اس غرض کے لئے ہماری رائے میں تو درجہ رابعہ سے اوپر کے تمام اسباق عربی زبان میں ہونے چاہئیں، لیکن اگر یکایک یہ تبدیلی مشکل ہو تو کم از کم مدرسے کے تمام اعلانات، دفتری اندراجات، تمام دفتری کارروائی، امتحانات کے پرچے اور ان کے نتائج وغیرہ فوری طور پر عربی میں منتقل کرنے چاہئیں، اور رفتہ رفتہ مدارس کے ماحول کو اس سطح پر لانا چاہئے کہ ان میں ذریعہ تعلیم مکمل طور پر عربی زبان بن جائے۔

اساتذہ اور طلبہ کے درمیان باہمی گفتگو میں عربی بول چال کی حوصلہ افزائی کرنی چاہئے، اگر اساتذہ اور منتظمین اس بات کا اہتمام کریں کہ وہ آپس میں، نیز طلباء سے صرف عربی میں گفتگو کریں گے تو بہت جلد عربیت کا ایک خوشگوار ماحول پیدا ہو سکتا ہے، عادت نہ ہونیکی بنا پر شروع میں شاید دشواری پیش آئے، لیکن اگر اس دشواری پر اہتمام کے ساتھ قابو پالیا گیا تو انشاء اللہ بہترین نتائج حاصل ہوں گے۔

مہینے دو مہینے میں طلباء کے ایسے اجتماعات منعقد کرنے چاہئیں جن میں طلبہ عربی میں تقریریں کریں اور مقالے پڑھیں۔

(درس نظامی کی کتابیں کیسے پڑھے اور پڑھائیں؟)

(۵)

تدریس نحو وصرف

نفس کتاب ہی حل کرادی جائے

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ:

"ایک بار کانپور میں جب میں عربی مدرسہ "جامع العلوم" میں مدرس اول تھا تو میں نے مولوی یونس کو جو ایک مبتدی طالب علم اور میرے ہم وطن تھے مولوی انعام اللہ صاحب کے (جو اسی مدرسہ کے ایک طالب علم تھے) سپرد کردیا کہ تم ان کو "فصول اکبری" پڑھادیا کرو، ایک بار میں نے ان کا امتحان لیا تو انہوں نے فن کے متعلق بہت ادھر اُدھر کی تحقیقات بیان کیں، جب امتحان لے چکے تو میں نے مولوی انعام اللہ کو بلایا اور پوچھا کہ تم کو میں نے "فصول اکبری" پڑھانے کے لئے کہا تھا یا "شرح فصول اکبری"؟ کہنے لگے انہوں نے کوئی بات غلط بیان کی؟، میں نے کہا: پہلے میرے سوال کا جواب دو، کہنے لگے "فصول اکبری"، میں نے کہا تم نے تو ان کو "فصول اکبری کی شرح" پڑھائی ہے، کیونکہ جو مضامین ادھر اُدھر کے بیان کئے ہیں وہ "فصول اکبری" میں کہاں ہیں؟ وہ خاموش ہوئے، پھر میں نے کہا کہ تم اس طالب علم کے سامنے نفس کتاب کا مطلب بیان کردیا کرو، اس سے ان کو استعداد پیدا ہوگی۔

پھر فرمایا: کہ کتاب میں مصنف سے کہیں کہیں غلطیاں بھی ہوئی ہیں، تو وہاں پر غلطیوں کی توجیہ او رتاویل نہیں کرنی چاہئے جیسا کہ عام مدرسین کی عادت ہے بلکہ ظاہر کردینا چاہئے کہ یہاں غلطی ہوئی ہے ورنہ ان غلطیوں کی تاویل اور توجیہ کرنے سے شاگرد میں بھی یہی مضر عادت تاویل کی پیدا ہوجاتی ہے۔

دوسرے تاویل کی ضرورت ہی کیا ہے؟ مدرس مصنف کا ذمہ دار تو نہیں کہ جو اس نے کہہ دیا جس طرح بن پڑے اس کو ضرور بنائے، مدرسین کا منصب تو صرف ناقل کا ہے اس کے ذمہ صرف صحیح نقل ہے کہ یہ بتلادے کہ کتاب کی عبارت کا مطلب یہ ہے اور کتاب کو حل کردے خواہ کتاب غلط ہو یا صحیح ہو، البتہ اگر کوئی مضمون غلط ہو اس کا غلط ہونا ظاہر کردے بس کافی ہے، اسی سے طالب علم کی استعداد پیدا ہوتی ہے، اسی طرح خارج کتاب مضامین بیان نہ کرے کیونکہ یہ ادھر اُدھر کی باتیں یاد تھوڑا ہی رہتی ہیں، جب وہ باتیں طالب علم کو یاد ہی نہیں رہ سکتیں تو پھر ان کے بیان کرنے سے فائدہ کیا ہوا"۔(تحفۃ المدرس بحوالہ ملفوظات ج:۲)

ابتدائی درجات کی کتب کی تدریس کا طریقہ

مولانا شمس الحق صاحب رحمہ اللہ ناظم تعلیمات دار العلوم کراچی

ایک استاذ کی درسگاہ میں نگرانی کے سلسلے میں یہاں حاضر ہوا، وہ "نحومیر" پڑھا رہے تھے، "نحومیر" ایک ابتدائی کتاب ہے، وہاں جماعت میں جب حاضرا ہوا، میں نے دیکھا کہ طلبہ بیٹھے ہوئے کچھ لکھ رہے ہیں، میں استاذ کے برابر میں جاکر بیٹھ گیا، میں نے کہا:

کیا لکھا جارہا ہے؟ طلبہ سے پوچھا کیا لکھ رہے ہو؟

طلبہ نے کہا کہ جی استاذ کی تقریر لکھ رہے ہیں۔

میں نے کہا "نحومیر" میں تقریر؟

کہا کہ جی! استاذ لکھوا رہے ہیں۔

میں نے کہا کہ کیا لکھا؟ سناؤ!

تو معلوم ہوا کہ دو دن سے "بسم اللہ" کے اوپر تقریر چل رہی ہے، استاذ طالب علموں کو لکھوا رہے ہیں، چنانچہ میں نے اسی وقت طلبہ سے کہا کہ بند کرو کاپی، آیندہ کوئی تقریر نہیں لکھی جائے گی، پھر استاذ کی میں نے تھوڑی سی اچھی تادیب کی، اور ان کو بتلایا کہ اگر شوق پورا کرنا ہے تو آپ اس کے لئے کسی اور جماعت کا انتخاب کیجئے، یہ تقریر بے محل ہے ان بچوں کو "بسم اللہ" کا ترجمہ نہیں آتا، آپ ان سے کتاب پڑھوائیں اور پڑھائیں، پابندی لگوادی کہ کوئی لمبی چوڑی تقریر نہیں، بس ان کو نفس کتاب، اس کا ترجمہ آجائے، مطلب کتاب آجائے، لمبی چوڑی تقریر نہیں۔

آج ہمارے یہاں بیماری یہ ہے کہ استاذ اپنی قابلیت کو ظاہر کرنے کے لئے طلبہ پر اپنی دھاک بٹھانے کے لئے یا ان کو مانوس کرنے لئے لمبی چوڑی بے محل باتیں شروع کردیتے ہیں، سب نہیں بعض ناتجربہ کار استاذ ایسے ہوتے ہیں۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ انہوں نے اپنے علم کا مظاہرہ کیا، آگے طالب علم بے چارہ الجھن میں مبتلا ہے، اُسے کچھ معلوم نہیں کہ میرا استاذ کیا کہہ رہا ہے کہاں جارہا ہے، اس لئے اس میں استعداد ہی نہیں اس بات کی: کلِّموا الناسَ علی قدر عقولھم، بات کرو عقل کے مطابق کرو، جس میں جتنی صلاحیت ہے اس کے مطابق کرو، ابتدائی سال میں ان کو اس درجہ کے مطابق نفس کتاب سمجھاؤ، اس سے اوپر کے طلبہ ہیں ان کو تھوڑا سا مشکل سا کچھ اضافی چیزیں بتلاؤ، اوپر کی جماعتوں میں جاکرالبتہ تقریر وہاں پر بھی نہ ہونا چاہیے، مدارس کے اندر لمبی چوڑی تقریروں کا رواج پڑ گیا ہے، آخر دور میں جاکر بنیادی بات طالب علم کی کتاب سمجھنے کی یہ ہے کہ وہ استاد کی لمبی چوڑی تقریروں میں کھوجاتا ہے اور اس کو کتاب کا نفس عبارت کا مطلب ہی نہیں آتا، عبارت کا حل معلوم نہیں، لمبی چوڑی تقریر میں گم ہوجاتاہے، اور وہ سمجھتا نہیں کہ میں نے کیا حاصل کیا، کیا مجھے اس کا فائدہ ہے، اس کو بالکل یکسر ختم کردیجیے، کوئی تقریر نہیں صرف نفس کتاب ہونی چاہیے۔

اس کے علاوہ طلبہ کی استعداد بنانے کے لئے ابتدائی استعداد کے لئے یہ ضروری ہے کہ آپ جو کچھ پڑھائیں اس کا اجراء بھی ساتھ کے ساتھ کروائیں، اگر آپ نے اجراء نہ کروایا، تو اس صورت میں جو کچھ چیزیں اس نے سیکھی ہیں وہ قابل استعمال نہیں ہونگی، اور جب وہ قابل استعمال نہیں ہونگی تو مستحضر نہیں رہیں گی ختم ہوجائیں گی۔

ہمارے یہاں عام طریقے کے اور نحو کی کتاب کے اندر بہت فرق ہے اساتذہ محنت کرتے ہیں لیکن ایک چیز کی میں کمی محسوس کرتا ہوں کہ ترکیب کا فقدان ہے، اساتذہ عام طریقے کے اوپر کوئی مثالیں یا جملے لے آئیں، "ہدایۃ النحو" ہے مثلاً، اس میں بہت سی مثالیں آتی ہیں، اشعار آتے ہیں، "کافیہ" کے اندر اسی طریقے سے، ترکیب نحوی انتہائی ضروری ہے، آپ اگر ترکیب نحوی نہیں کروائیں گے تو یاد رکھیں طالب علم کی کبھی استعداد پختہ نہیں ہوگی، صرفی اعتبار سے بھی ان کا اجراء تو ہے لیکن نحوی ترکیب ضروری ہے، مدارس میں اس کا رواج ڈالیں، آپ اپنے طلبہ کے اوپر محنت کیجیے۔

اور ایک بات جو میں عرض کیا کرتا ہوں وہ یہ کہ ہمارے یہاں اوپر کے درجات مین جو کتابیں

پڑھائی جاتی ہیں وہ کتابیں استاذ پڑھاتے وقت جسے ہماری اصطلاح میں کہتے ہیں لکیر کا فقیر، بس مکھی پر مکھی اگر کتاب کے اندر ایک مثال لکھی ہوئی ہے تو وہ اسی پر اکتفاء کرتا ہے، دوسری مثال نہیں دیتا، نہیں! آپ اس جگہ پر جہاں کسی فن کی بات کہی جارہی ہے کوئی قاعدہ کوئی اصول یا ضابطہ بیان کیا جارہا ہے اس کی دو چار مثالیں دے کر اس قاعدہ کی مشق کرائیے، اجراء کرائیے، ورنہ وہ قاعدہ مستحضر نہیں ہوگا، یہ بنیادی چیزیں ہیں جو صرف کی کتابوں کے اندر خاص طریقے سے ہوں تو آگے چل کر کام آئیں گی۔

(رموز تدریس:۱۱۱تا۱۱۳)

حضرات مدرسین کے لئے جامع نصیحت

(۱) طلبہ اور کتابوں کو پورا پورا حق ادا کرنے کی کوشش کریں، طلبہ کو اپنا محسن سمجھیں کہ انہوں نے آپ کو علوم کی تخم ریزی کے لئے اپنے قلوب کو پیش کیا اور اس طرح آپ کے علوم متعدی ہوئے، ورنہ تو محدود ہو کر رہ جاتے، اس لئے صلبی اولاد کی طرح طلبہ پر شفقت کریں۔

(۲) آپ کی خامیوں کو آپ کے اساتذہ کرام نے دور کیا ہے، اپنے طلبہ کی خامیوں کو آپ دور کریں۔

(۳) جو کتاب پڑھائیں، پورے مطالعہ کے بعد پڑھائیں، اگرچہ متعدد بار پڑھا چکے ہوں، حق تعالیٰ شانہ ہر مطالعہ میں کچھ نہ کچھ نیا فیض عطا فرماتے ہیں۔

ہدایات تدریس

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم

میزان الصرف یا علم الصرف:

(۱) صرف کے آغاز میں گردانیں یاد کرانا ناگزیر ہے، گردانیں اس طرح یاد ہونی چاہئیں کہ وہ خود بخود زبان پر چڑھ جائیں، اور کسی جگہ اٹکاؤ یا جھجک باقی نہ رہے۔

(۲) لیکن عموماً اساتذہ صرف گردانوں کے رٹوانے پر اکتفاء کر لیتے ہیں، اور جب طالب علم کو کوئی گردان اچھی طرح حفظ ہو جائے تو آگے منتقل ہو جاتے ہیں، اور صیغوں کی شناخت کی طرف توجہ نہیں دیتے، حالانکہ طالب علم کو گردان کا یاد ہونا جس قدر ضروری ہے اتنا ہی ضروری یہ ہے کہ وہ ہر صیغے کو فوراً پہچان کر اس کا صحیح مطلب اور اس کا محل استعمال اچھی طرح سمجھ لے، لہٰذا استاذ کے ذمے ضروری ہے کہ وہ گردان یاد کرانے کے بعد مندرجہ ذیل کام کرے، اور جب تک ان کاموں کی تکمیل اطمینان بخش طریقے پر نہ ہو، اگلے درس کی طرف منتقل نہ ہو۔

(الف) ہر ہر صیغے کے بارے میں یہ پہچان ہو کہ وہ کونسا صیغہ ہے؟ مذکر ہے یا مونث، واحد ہے یا تثنیہ یا جمع؟ اس کے لئے دو طرفہ مشقیں زبانی طور پر کرانی ضروری ہیں، یعنی طالب علم سے مختلف صیغوں کے بارے میں یہ پوچھا جائے کہ وہ کونسا صیغہ ہے؟ مثلاً فعلتُ یا ضربتُ کونسا صیغہ ہے؟ دوسرے مختلف صیغوں کے نام لیکر وہ صیغے بنوائے جائیں مثلاً ضرب سے ماضی کا واحد مونث حاضر، وغیرہ، دونوں قسم کی مشقیں اتنی کثرت سے کرائی جائیں کہ صیغوں کی یہ دو طرفہ پہچان طالب علم کے ذہن نشین ہو جائے اور ہر طالب علم سے اوسطاً ہر صیغے کے بارے میں متعدد سوالات ہو جائیں، اس کام میں اگر ایک دو سبق پورے بھی خرچ ہو جائیں تو اس کی پرواہ نہ کی جائے۔

(ب) اسی طرح یہ بھی انتہائی ضروری ہے کہ ہر صیغے کے صحیح معنی طالب علم کے ذہن نشین ہوں، اور صیغہ سنتے ہی اس کے معنی اس کی سمجھ میں آجائیں، اس کے لئے بھی دو طرفہ مشقوں کی ضرورت ہے، ایک طرف عربی صیغہ

بول کر طالب علم سے اس کے معنی دریافت کئے جائیں، اور دوسری طرف اردو بول کر اس کا ترجمہ طالب علم سے کرایا جائے، یہ دو طرفہ مشقیں بھی اتنی کثرت سے ہونی چاہئیں کہ صیغوں کے معنی اور ان کا صحیح محل استعمال ذہن میں پیوست ہو جائے۔

(ج) میزان میں تمام گردانیں فعل کے مادے پر مبنی ہیں اور وہی یاد کرائی جاتی ہیں لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ دوسرے مادوں سے وہی گردانیں طالب علم سے نکلوائی جائیں، مثلاً اکل قرأ فتح سجدَ وغیرہ، اور ان کے معانی بھی ذہن نشین کرائے جائیں۔

(د) جن مشقوں کا ذکر اوپر (ب) اور (ج) میں کیا گیا ہے، وہ زبانی طور پر کرانے کے علاوہ تحریری طور پر کرانا بھی لازمی ہے، یعنی اردو میں ایسے جملے دیئے جائیں جن کا ترجمہ طلبہ اپنے پڑھے ہوئے افعال کے مختلف صیغے بنا کر کر سکیں، مثلاً مندرجہ ذیل جملوں کا ترجمہ کرایا جائے:

ان عورتوں نے سجدہ کیا۔ تم مردوں نے کھایا۔ ان دو عورتوں نے پڑھا، وہکذا۔

ان مشقوں میں اس بات کا لحاظ رکھا جائے کہ تمام صیغے استعمال ہو جائیں۔

یہ تمام کام ماضی، مضارع، امر و نہی کی تمام گردانوں میں کرائے جائیں۔

(۳) تحریری مشقوں میں شروع ہی سے طالب علم کو اس بات کی عادت ڈالی جائے کہ وہ صاف ستھرے انداز میں سلیقے سے لکھے، جہاں حاشیہ چھوڑنا ضروری ہو وہاں چھوڑے، سطریں سیدھی رکھے، تحریر اور ترتیب میں توازن ہو۔

(۴) جو طالب علم تحریری کام کر کے نہ لائے، اور اس کے پاس معقول عذر نہ ہو، اس کو مناسب تنبیہ کی جائے۔

(۵) جو طلبہ حافظے یا ذہن کے اعتبار سے کمزور ہوں، انہیں ہر روز کا سبق یاد کرانے کی ذمہ داری جماعت کے ذہین اور اچھے طلبہ پر لگائی جائے اور جن طلبہ سے تمام اس طرح کی کوششوں کے باوجود مایوسی ہو جائے، ان کی رپورٹ ناظم تعلیمات کو کی جائے، اور اگر مایوسی حق بجانب ہو تو اس کو تعلیم کے بجائے کسی اور مشغلے میں لگانے کے لئے فارغ کر دیا جائے۔

(۶) صرف صغیر میں اگرچہ ہر گردان کا صرف ایک صیغہ طالب علم کو یاد کرایا جاتا ہے، لیکن استاذ کو چاہئے کہ وہ اس سے کبھی کبھی اس بحث کی پوری گردان سنے مثلاً باب استفعال کی صرف صغیر میں مضارع کا وہ صرف یَستَغفِرُ یاد

کرے گا، لیکن اس سے یَسْتَغْفِرُ کی پوری گردان نکلوائی جائے، اور پھر اس میں بھی مندرجہ بالا مشقیں جاری کی جائیں۔

(۷) تعلیلات کے بیان میں بھی صرف تعلیلات کے قواعد یاد کرانے کافی نہ سمجھا جائے، بلکہ ہر قاعدے کو بہت سی مثالوں سے سمجھایا جائے، اور طالب علم سے مختلف مثالوں میں ان قواعد کا اجراء کرایا جائے۔

نحو میر یا علم النحو:

اساتذہ کو یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ علوم اسلامیہ کی تحصیل کے لئے علم نحو کی ٹھیک ٹھیک فہم اس کا مکمل اجراء اور اس کے قواعد کا صحیح استعمال ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے، لہذا نحو کی تعلیم پر آنے والے ہر علم وفن کی تحصیل موقوف ہے، اگر یہ بنیاد کمزور رہ جائے تو دورہ حدیث تک کی پوری تعلیم کمزور بے اثر اور بے ثبات ہو جاتی ہے، اس لئے نحو کے استاذ کی ذمہ داری بہت بڑی ذمہ داری ہے، اور اس سے کماحقہ عہدہ برآ ہونے کے لئے مندرجہ ذیل امور کی رعایت ناگزیر اور لازمی ہے۔

(۱) نحو کی تعلیم میں اصل مقصد کتاب کی عبارت یاد کرانا نہیں، بلکہ اس میں بیان کردہ قواعد و مسائل کو طالب علم کے اس طرح ذہن نشین کرانا ہے کہ متعلقہ موقع پر طالب علم کو وہ قاعدہ یا مسئلہ یاد آجائے۔

(۲) زیر درس کتاب میں عموماً کسی اصطلاح یا قاعدے کی تشریح کے لئے صرف ایک مثال پر اکتفا کیا گیا ہے، لیکن استاذ کے لئے یہ لازمی ہے کہ وہ ہر اصطلاح اور قاعدے کی تشریح کے لئے طلبہ کے سامنے از خود بہت سی مثالیں بیان کرے، اور بہتر یہ ہے کہ یہ مثالیں عام گفتگو کے علاوہ قرآن کریم سے بھی اخذ کی جائیں تاکہ قرآن کریم سے بھی مناسبت پیدا ہوتی جائے، اس غرض کے لئے استاذ کو چاہئے کہ مفتاح القرآن کو مستقل اپنے مطالعہ میں رکھے۔

(۳) خود بہت سی مثالیں دینے کے بعد طلبہ سے بھی مثالیں بنوانا اور مختلف مثالیں بول کر طلبہ سے ان کے بارے میں سوال کرنا ضروری ہے، یہ کام زبانی بھی ہونا چاہئے اور تحریری بھی۔

(۴) اصطلاح یا قاعدے کی محض نظریاتی تفہیم کو ہرگز کافی نہ سمجھا جائے، بلکہ اس کے عملی اجراء پر زیادہ زور دیا جائے، چنانچہ جب پچھلا سبق طلبہ سے سنا جائے تو اس میں صرف قاعدہ ہی نہ پوچھا جائے بلکہ مختلف مثالوں

کے ذریعہ سوال کر کے اس بات کا اطمینان کیا جائے کہ طالب علم میں اس قاعدے کو عملی طور پر جاری کرنے کی صلاحیت پیدا ہوئی ہے یا نہیں؟۔

مثلاً قاعدہ یہ ہے کہ غیر منصرف کا اعراب حالت جری میں فتحہ سے ہوتا ہے، اب صرف اس سوال پر اکتفانہ کیا جائے کہ غیر منصرف کا اعراب کیا ہوتا ہے؟ بلکہ ایسے جملے اردو میں بول کر عربی میں ان کا ترجمہ کرایا جائے جن میں کوئی غیر منصرف لفظ حالت جری میں آیا ہو، یا ایسے عربی جملے بغیر حرکات کے تختہ سیاہ پر لکھے جائیں جن میں غیر منصرف لفظ حالت جری میں ہو، اور ان پر حرکات لگوائی جائیں، یا ایسے غلط جملے طالب علم کو دیئے جائیں جن میں غیر منصرف کا اعراب صحیح نہ ہو اور پھر اس سے کہا جائے کہ وہ اسے صحیح کرے۔

(۵) طالب علم جب بھی کوئی غلط جملہ بولے یا غلط پڑھے، اس کو فوراً ٹوک کر جملہ درست کرایا جائے، عام طور سے طلبہ میں مضاف پر الف لام داخل کرنے، موصوف صفت اور مبتدا خبر میں مطابقت نہ کرنے وغیرہ کی غلطیاں شروع سے جڑ پکڑ جاتی ہیں، ان غلطیوں کو کسی بھی قیمت پر گوارہ نہ کیا جائے، بلکہ طالب علم سے اصلاح کرائی جائے تاکہ شروع ہی سے ان غلطیوں سے احتراز کی عادت پڑ جائے۔

(۶) جو قواعد کثیر الاستعمال ہیں ان پر قلیل الاستعمال قواعد کے مقابلے میں زیادہ زور دیا جائے، سبق سننے کے وقت بھی اور امتحانات میں بھی کثیر الاستعمال قواعد کے بارے میں زیادہ سوالات کئے جائیں، بلکہ قلیل الاستعمال قواعد کے بارے میں بتایا بھی جائے کہ ان کا استعمال کم ہوتا ہے مثلاً کی پانچ ممکنہ وجوہ اعراب میں طالب علم کو بتادیا جائے کہ راجح اور کثیر الاستعمال کونسی ہے؟۔

(۷) اسم متمکن کی جو سولہ اقسام کتاب میں مذکور ہیں، ان کو ذہن نشین اور یاد کرانے اور ان کے عملی اجراء پر، بہت زور دیا جائے، مختلف الفاظ کے بارے میں طلبہ سے پوچھا جاتا رہے کہ یہ اسم متمکن کو کونسی قسم ہے؟ اور اس کا اعراب کیا ہے؟

(۸) طلبہ کو ہر روز یا کم از کم تیسرے دن کوئی نہ کوئی تحریری مشق ضروری جائے، اور مشقوں کا طریقہ وضع کرنے کے لئے استاذ کے لئے ضروری ہے کہ وہ عربی کا معلم "معلم الانشاء" اور "النحو الواضح للابتدائیۃ" کو اپنے مطالعے میں رکھے، اور جو بحث پڑھائی گئی ہے، اس کے متعلق ان کتابوں میں دی ہوئی مشقوں میں سے طلبہ کی ذہنی سطح کا

لحاظ رکھتے ہوئے مشقیں منتخب کر کے طلبہ کو ان کے تحریری جواب کا پابند بنائے۔

(۹) "مائۃ عامل" کی تعلیم میں ہر عامل کے عمل کو ذہن نشین اور مستحضر کرانے کے لئے مثالوں سے کام لیا جائے، اور ان کی بھی زبانی اور تحریری مشقیں کرائی جائیں۔

ہدایۃ النحو:

"ہدایۃ النحو" درس نظامی کے طلبہ کے لئے انتہائی ناگزیر بے حد مفید اور نہایت اہم کتاب ہے، اور اسے نحو کی ریڑھ کی ہڈی سمجھنا چاہئے، علم نحو سے جو کچھ مناسبت پیدا ہوتی ہے، وہ اسی کتاب میں ہوگی، لہذا اس کو پڑھاتے وقت مندرجہ ذیل امور کو مد نظر رکھنا نہایت ضروری ہے۔

(۱) اس کتاب کا اصل مقصد یہ ہے کہ نحو کے بنیادی قواعد اور اس علم کا مرکزی ڈھانچہ آسان اور عام فہم انداز میں طالب علم کے ذہن نشین ہو جائے اور ساتھ ہی اس میں عربی زبان میں نحو کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو۔

(۲) اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ استاذ صرف کتاب کے بیان کردہ مسائل کی تفہیم پر اکتفا کرے اور اس کتاب کی شروح مثلاً "درایۃ النحو" وغیرہ میں جو غیر متعلق مباحث مذکورہ ہیں، ان کو درس میں نہ خود چھیڑے نہ طلبہ کو چھیڑنے کی اجازت دے، یہ نحو کی بنیاد رکھنے کا وقت ہے، اور طالب علم کی پوری توجہ کتاب کے مسائل کو سمجھنے اور ان کے اجراء پر مرکوز ہونی ضروری ہے، اگر اس کا ذہن خارجی مباحث میں الجھا دیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کتاب کا اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے، اور کتاب کے مسائل اور ان کے اجراء پر طالب علم کی گرفت کمزور ہو جاتی ہے، اور پھر یہ کمی آگے کہیں پوری نہیں ہوتی۔

(۳) کتاب کے مسائل کو سمجھانے، یاد کرانے اور ان کو اچھی طرح ذہن نشین کرانے کے لئے ان تمام ہدایات کو یہاں بھی مد نظر رکھا جائے جو "نحو میر" اور "علم الصرف" کی تدریس کے لئے بیان کی گئی ہیں، چنانچہ اصطلاح اور ہر قاعدے کی تشریح میں اس بات کو مد نظر رکھنا ضروری ہے کہ صرف کتاب کی دی ہوئی مثال پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ ہر اصطلاح اور ہر قاعدے کی بہت سی مثالیں اپنی طرف سے سوچ کر طلبہ کو بتائی جائیں، پھر ان سے نئی مثالیں بنوائی جائیں، اور کوشش کی جائے کہ مثالیں زیادہ سے زیادہ قرآن کریم سے ماخوذ ہوں۔

مثلاً کتاب میں "ما أضمر عامله علی شریطة التفسیر" کی صرف ایک مثال دی گئی ہے، استاذ کو

چاہئے کہ وہ قرآن کریم سے اس کی آسان مثالیں تلاش کر کے طالب علم کے سامنے بیان کرے اور اس میں متعلقہ قواعد کا اجراء کرائے، مثلاً: "وَالسَّمَاءَ بَنَيْنَاهَا" "وَالْأَرْضَ فَرَشْنَاهَا" "إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ" "وَالْقَمَرَ قَدَّرْنَاهُ مَنَازِلَ" "وَالْجَانَّ خَلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلُ".

(۴) اس کتاب میں بھی زبانی اور تحریری تمرینات کا اسی طرح اہتمام کیا جائے جیسے نحو میر اور علم الصرف کے سلسلے میں بیان کیا گیا ہے۔

(۵) ان مشقوں کے لئے "النحو الواضح" کے مختلف حصوں کو بالالتزام مطالعہ میں رکھے، اور جو سبق پڑھائے اس کو اس کتاب میں پڑھ کر اس کی تمرینات اور اس میں دی ہوئی مثالوں سے استفادہ کرے۔

کافیہ:

"کافیہ" علم نحو کی وہ اہم کتاب ہے جس میں نحو کے اعلیٰ درجے کے مسائل بڑے اختصار اور جامعیت کے ساتھ بیان کر دیئے گئے ہیں، اس کتاب کا مقصد نحو کے مبادی سے کماحقہ واقفیت کے بعد اس علم کے تفصیلی مسائل کے ذریعے طالب علم میں فن کے ساتھ مناسبت پیدا کرنا اور اس کے ساتھ شواہد کی مدد سے مسائل نحو کے استنباط کا سلیقہ سکھانا ہے۔

لیکن ہمارے دور میں ان مقاصد کے حصول میں بہت بڑی رکاوٹ اس کتاب کا وہ طریق تدریس ہے جس میں سارا زور غیر متعلق چوں چرا پر صرف کر دیا جاتا ہے، اور اس چوں وچرا کی کثرت میں کتاب کے اصل مسائل گم ہو کر رہ جاتے ہیں، اور طالب علم کی توجہ ٹھیٹھ نحوی مسائل ومباحث کے بجائے اعتراض وجواب کی طرف لگ جاتی ہے، لہذا:

(۱) "کافیہ" سے صحیح فائدہ حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ استاذ نفس کتاب کی تفہیم پر اکتفاء کرے البتہ اس تفہیم کا معیار "ہدایۃ النحو" سے اتنا بلند ہونا چاہئے کہ عبارت کے فوائد وقیود اور ایک ایک لفظ کا پورا پس منظر طالب علم کے سامنے بیان کیا جائے، اور مصنف نے مختصر الفاظ میں جو مباحث سموئے ہیں، وہ پوری تفصیل کے ساتھ طالب علم کے سامنے آجائیں، لیکن اس کے علاوہ ان فضول عقلی موشگافیوں اور لفظی مناقشات سے مکمل پرہیز کیا جائے جن سے براہ راست نحو کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

(۲) "کافیہ" کی سب سے بہتر شرح "رضی" "شرح جامی" اور "عصام" کو استاذ اپنے مطالعہ میں رکھے لیکن طالب علم کے سامنے ان میں سے صرف وہ منتخب کر کے پیش کرے جو کتاب سمجھنے کے لئے ضروری ہوں یا

جن کا براہ راست نحو سے تعلق ہو "تحریر سنبٹ" اور اس قسم کی دوسری شروح جو محض چوں وچرا پر مشتمل ہیں، استاذ چاہے تو اپنی دلچسپی کے لئے مطالعے میں رکھے، لیکن اس قسم کے مباحث نہ طلبہ کے سامنے بیان کرے اور نہ طلبہ کو ایسی شروح دیکھنے کی اجازت دے، مثلاً: الکلمۃ لفظٌ وُضع لمعنیً" پر جس طرح عموماً کئی کئی دن خرچ کئے جاتے ہیں اس کی چنداں ضرورت نہیں، اس جملے کے مطلب کے علاوہ صرف الف لام کی قسمیں، مفرد کا مطلب اور مفرد کی مختلف وجوہ اعراب اور ان سے حاصل ہونے والے معانی پر اکتفاء کیا جائے، لیکن الف لام کی قسموں کو اتنی مثالوں سے سمجھایا جائے کہ ہر قسم کی پوری شناخت طالب علم کے ذہن نشین ہو جائے اور پھر طالب علم سے بھی ان مختلف قسموں کی مثالیں نکلوائی جائیں۔

(۳) اس قسم کے مباحث ترک کرنے سے جو وقت بچے گا اس کو حقیقی نحوی استعداد پیدا کرنے میں صرف کیا جائے، چنانچہ کتاب کے مسائل کی خارجی مثالیں اور قرآن وسنت اور کلام عرب سے ان کے شواہد پیش کئے جائیں اور طلبہ سے ایسے فقرے بنوائے جائیں جن میں وہ مسائل جاری ہو۔

اس غرض کے لئے ضروری ہے کہ "کافیہ" کا استاذ "النحو الوافی" کو بالالتزام اپنے مطالعہ میں رکھے، اس کتاب میں "کافیہ" کے معیار کے مسائل کو قرآن وسنت اور کلام عرب کے شواہد سے سمجھایا گیا ہے، اسی کتاب میں تمرینات بھی موجود ہیں، ان تمرینات سے مدد لے کر استاذ اپنے طلبہ کے لئے تمرینات خود مرتب کرے[1] جن کا مقصد ایک طرف یہ ہو کہ کافیہ کے مسائل کا اجراء ہو سکے، اور دوسری طرف اس طرح عربیت کا ادبی ذوق بھی ساتھ ساتھ پیدا ہوتا چلا جائے۔

اور اصل بات یہاں بھی وہی ہے کہ "کافیہ" سے طالب علم کو صحیح فائدہ پہنچنے کا مدار استاذ کے اپنے نحوی اور ادبی ذوق پر ہے جسے ترقی دینے کے ہر استاذ کو کوشش کرنی چاہئے اور نحو اور ادب کی معیاری کتابیں اپنے عام مطالعے میں رکھنی چاہئیں۔

---

(۱) اللہ کا شکر ہے، بندہ گنہ گار کو اللہ تعالیٰ نے توفیق دی اور اس سلسلہ کی کئی کتابوں پر قرآن کریم، احادیث نبویہ علی صاحبہا الصلوات والتسلیمات اور مختلف عربی کتابوں سے اجراء کے لئے تمارین لگائی ہے جو الحمد للہ ملک اور بیرون ملک کئی مدارس میں شامل نصاب ہیں، مدرسین حضرات انہیں بھی دیکھ لیں، جن میں سے چند یہ ہیں: (۱) إقناع الضمير مع الأسئلة والتمارين. (۲) النحو اليسير مع الأسئلة والتمارين. (۳) هداية النحو مع الأسئلة والتمارين. (٤) علم الصيغة مع الأسئلة والتمارين. (٥) الكافية مع الأسئلة والتمارين. (٦) إرشاد الصرف مع الأسئلة والتمارين.

علم الصیغہ:

"علم الصیغہ" ہمارے نصاب میں صرف کی آخری کتاب ہے اس میں اہم ترین حصہ قواعد، تعلیلات کا ہے، یہ قواعد اس کے کے بعد کہیں طالب علم کے سامنے نہیں آئیں گے، لہذا ان کو خوب یاد کرا کے ازبر کرا دینا اور ان کا اجراء استاذ کی اہم ترین ذمہ داری ہے۔

اس طرح "خاصیات" کا بیان پہلی اور آخری مرتبہ صرف "فصول اکبری" ہی میں طالب علم کے سامنے آئے گا ان خاصیات کو بھی نہ صرف ذہن نشین بلکہ اچھی طرح یاد کرنا لازمی ہے۔ (درس نظامی کی کتابیں کیسے پڑھے اور پڑھائیں؟)

حضرت مفتی صاحب اپنی اسی کتاب میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

ابتدائی درجات کے نصاب میں صرف و نحو کی ایسی کتابوں کا اضافہ کیا جائے جن میں قواعد کے بیان کے ساتھ ساتھ ان کے عملی اجراء کا اہتمام ہو، ہر ہر قاعدے کے ساتھ اس کی بہت سی مثالیں دے کر قاعدے کو ذہن نشین کرایا گیا ہو اور پھر تمرینات کے ذریعے طلباء کو ان قواعد پر عمل کا عادی بنانے کی کوشش کی گئی ہو، عرب ممالک میں اس غرض کے لئے بہت سی کتابیں تیار ہوئی ہیں، مثلاً نحو و صرف کے ابتدائی اور متوسط درجات کے لئے "النحو الواضح" اور اعلیٰ درجات کے لئے "النحو الوافی" وغیرہ، ان کتب سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔

(درس نظامی کی کتابیں کیسے پڑھے اور پڑھائیں؟:۶۶)

نحو اور صرف کی صحیح اور جامع تدریس کے اصول

مولانا محمد بشیر جمعہ صاحب

مولانا کے قلم مدرار سے ماشاء اللہ کئی کتابیں منصہ شہود پر آگئیں ہیں زیادہ تر کتابیں عربی زبان اور صرف اور نحو سے متعلق ہیں، اس میدان میں اُن کو بڑا ملکہ حاصل ہے، ذیل میں درج بالا عنوان سے لکھے گئے ایک مضمون سے چند چیدہ چیدہ اصول یہاں درج کئے جارہے ہیں:

صرف ونحو کی صحیح تعلیم کے اصول:

میرے سامنے اس وقت برصغیر پاک وہند کے علاوہ کئی عرب ملکوں جن میں مصر، سعودی عرب، عراق، اردن، یمن اور متحدہ عرب امارات، قطر وغیرہ شامل ہیں کے نصاب تعلیم موجود ہیں، ان تمام ممالک کے ماہرین تعلیم نے عربی زبان اور نحو صرف کی صحیح اور موثر تعلیم کے لئے جن اہم اصولوں کو واضح کیا ہیں میں یہاں اُن کا خلاصہ پیش کرتا ہوں:

پہلا اصول:

(۱) نحو وصرف کے قواعد کی تعلیم مقصود بالذات نہیں، صرف ونحو کی معلومات، گردانیں اور قواعد کوئی ایسا مستقل اور الگ فن نہیں ہے کہ انہیں عربی زبان سے علیحدہ کرکے پڑھایا جائے، کیونکہ صرف ان کی تعلیم مقصود بالذات نہیں ہوتی، بلکہ ان کی تعلیم وتدریس کی اساس یہ ہوتی ہے کہ یہ قرآن کریم، حدیث شریف اور دیگر علوم شرعیہ کے صحیح فہم وتفسیر میں مفید ہیں، اور بچوں کو عربی زبان کی عبارت کو صحیح پڑھنے، صحیح لکھنے اور صحیح بولنے میں معاون ہیں، اس لئے اس کی تدریس کے دوران اس کے اصل مقصد یعنی عربی زبان میں صلاحیت ومہارت پیدا کرنے پر توجہ دی جائے، اس اُصول پر تمام عرب ملکوں کے ماہرین تعلیم متفق ہیں اور ان سب ملکوں میں اسی کے مطابق صرف ونحو کی تعلیم دی جاتی ہے کہ گرامر کے قواعد کو عملی مشق اور تربیت کے

مسلسل عمل سے ذہن نشین کرایا جاتا ہے، اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے بطور مثال میں یہاں سعودی عرب کی وزارت تعلیم کی الوکالة العامة للتطوير التربوي کی شائع کردہ تعلیمی کتاب "كتاب النّحو والصرف" برائے سال ۱۴۱۵ھ موافق ۱۹۹۴ء کے مقدمہ سے تین اقتباسات پیش کرتا ہوں:

(۱) ہم نے ثانوی سکول ک کے سال دوم کی اس کتاب "كتاب النّحو والصرف" میں فکر ونظر کی صفائی، عبارت کی آسانی، طرز بیان کی گہرائی، قاعدے کے اختصار اور تمرینات کی کثرت کا اہتمام کیا ہے، اور زیادہ مثالوں کو اسلام کی ابدی کتاب قرآن کریم سے لیا ہے تاکہ ہمارے بچوں کی زبانیں آیات کریمہ کی تلاوت سے تر رہیں، اور قواعد کی تعلیم کے اصل مقصد کو سمجھ لیں کہ یہ ان آیات کریمہ کا صحیح فہم اور اغلاط سے پاک تلاوت وترتیل ہے، پھر کچھ مثالیں ہم نے مختلف ادوار کے عمدہ اشعار سے لی ہیں، نیز عربی امثال وحِکم اور کچھ عمدہ کہانیوں کو بھی شامل کیا ہیں، ہمارا مقصد یہ ہے کہ نحو کے اسباق کو ادب اور اس کے دیگر فنون کے ساتھ مربوط کردیا جائے، اس طرح نحو وصرف کی تدریس اس جمود سے پاک ہوجائے جو عربی زبان کی روح اور حسن وجمال سے عاری مصنوعی مثالوں کی صورت میں عرصہ دراز تک اس پر چھایا رہا۔

(۲) ہم محترم اساتذہ سے گذارش کرتے ہیں کہ صرف ونحو کے قواعد کی تعلیم بذات خود مقصود نہیں ہوتی، بلکہ یہ طلبہ کو صحیح بول چال، عبارتوں کو درست پڑھنے اور لغت قرآن کریم کے صحیح فہم اور اس کی بلاغت کے اسرار واسباب سے آگاہی کا مفید اور معاون ذریعہ ہے، لہذا یہ مقصود نہیں کہ بچے انہیں زبانی یاد کریں اور انہیں بلا سمجھ رٹتے رہیں، بلکہ صرف ونحو کے قواعد کی صحیح تعلیم وتدریس کا معیار یہ ہے کہ چیدہ چیدہ ادب پاروں کو زیادہ پڑھایا جائے اور ایسے قواعد پر زیادہ بحث کی جائے جو ان کی صحیح تشکیل کی بنیاد بنتے ہیں، اس وجہ سے ہم نے مختلف ابواب کے بعد زیادہ مشقیں لکھی ہیں تاکہ ہر قاعدہ کا استخراج ہو اور عملاً بچوں کے ذہنوں میں راسخ ہوکر انہیں عربی محاوروں اور عبارتوں کا اچھا ذوق اور سلیقہ فراہم کرے اور وہ غلطی سے پاک نطق وتعبیر کے

عادی ہوں۔

(۴) نحو وصرف کے قواعد کو زباندانی سے علیحدہ کرکے پڑھایا جائے تو وہ اپنی حقیقی روح سے محروم ہوکر صرف بے مقصد اور جامد سانچے بن جاتے ہیں، اس لئے ہم معلمات سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ ان کے صحیح مقاصد کو مدنظر رکھیں، اور عبارت کے صحیح فہم اور عمدہ ذوق کی تربیت میں ان قواعد کی تطبیق کرائیں، اور لغتِ قرآن سے محبت اور محنت واخلاص سے گرامر کے ذریعہ عربی زبان کے عمدہ سلیقہ اور ذوق کی آبیاری پر توجہ دیں، خصوصا تمرینات کے ذریعے، کیونکہ تھوڑی سی محنت سے یہ اسباق طالبات کے ذہنوں میں عمدہ پھلوں اور پھولوں کی بہار بن کر ثمرات اور خوشبو کی بارش برساسکتے ہیں، خصوصاً اس حسن وجمال کی فضا میں جو لغت قرآن کا امتیاز ہے۔ انشاء اللہ۔

صرف ونحو کو عربی زبان سے علیحدہ کرکے پڑھانا غیر فطری امر ہے:

اس اصول کی مولانا ابو الحسن علی ندوی رحمہ اللہ نے بھی واضح کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"دوسری حقیقت یہ ہے کہ زبان کے قواعد کو زبان سے علیحدہ کرکے مجرد علمی طریقہ پر پڑھانا غیر فطری امر ہے، قواعد بغیر مشقوں اور جملوں اور عبارتوں کے نہ ذہن نشین ہوسکتے ہیں نہ جاگزیں، دنیا کی تمام زبانوں کے قواعد (صرف ونحو) مشق اور مثالوں سے پڑھائے جاتے ہیں اور ان کو عملی طور پر ذہن نشین کیا جاتاہے، ہمارے یہاں عرصہ دراز سے صرف ونحو کو زبان سے الگ کرکے پڑھایا جاتاہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ شرح جامی اور شروح الفیہ تک پہنچ جانے والے، اور اوعر شافیہ اور اس کے شروح تک عبور کرنے والے جو طلباء نحو وصرف کے دقائق اور باریکیاں جانتے ہیں نہ صحیح لکھ سکتے ہیں نہ بول سکتے ہیں اور بعض اوقات عبارت تک غلط پڑھتے ہیں، یہ سب اس کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے تیراکی کا فن پانی سے باہر سیکھا ہے، جب ان کو دریا میں گھسنے کا موقع ملتاہے تو اصول شناوری جو انہوں نے نظری طور سے سیکھے تھے کچھ کام نہیں آتے"۔(تمرین الصرف:ص۳)

تعلیم وتربیت کے اسی اہم اصول کو مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ ایک دوسرے مقام پر واضح کرتے ہیں اور اسے نظرانداز کرنے کے مضر اثرات ونتائج کی تشریح یوں کرتے ہیں:

"یہ ایک بڑی تعجب خیز اور ناقابل فہم بات ہے کہ کوئی فرد یا جماعت اپنی زندگی کا ایک معتد بہ حصہ اور اپنی ذہنی صلاحیتیں ان علوم وتصنیفات کے درس ومطالعہ میں صرف کرے جو عربی زبان میں لکھی گئی ہیں، لیکن اس زبان میں اظہار خیال سے بالکل معذور وقاصر ہو، زبانوں کے سلسلے کا یہ بالکل انوکھا تجربہ ہے جو صرف ہندوستان کے عربی مدارس اور علمی مجالس کی خصوصیت ہے، اس معذوری کی بڑی وجہ یہ ہے کہ عربی زبان کو جس کی بدولت ہم اسلام سے علمی تعلق پیدا کرتے ہیں کبھی زبان کی حیثیت سے پڑھنے پڑھانے کی کوشش نہیں کی گئی، اس کو بھی ایک نظری علم اور ایک کتابی فن کی حیثیت سے دیکھا گیا اور صرف کتابوں کے سمجھنے کا ذریعہ سمجھا گیا"۔(مسلم ممالک ۸۸)

دوسرا اُصول:

بچوں کو ان کے مختلف تعلیمی مراحل کے دوران صرف ونحو کی معلومات، گردانوں اور قواعد کے عملی استعمالات کی ایسی موثر مشق اور تربیت کا اہتمام کیا جائے کہ یہ قواعد عربی عبارتوں کے فہم کے ساتھ ان کی صحیح قراءت، صحیح تحریر اور صحیح بول چال سکھانے کا ذریعہ بنیں اور بچے ان کی تعلیم وتدریس کے دوران عربی کلمات اور محاوروں کا معقول ذخیرہ سیکھیں، اس طرح ان کی زبان وقلم پر صحیح عربی جملے، محاورے اور عبارتیں رواں دواں ہوں، اور وہ آسانی اور روانی سے عربی زبان لکھ بول سکیں اور یہ نظر آئے کہ بچے عربی زبان کی اچھی اور معیاری تعلیم وتربیت حاصل کررہے ہیں، نصاب تعلیم کے ان مقاصد کو مزید واضح کرتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ صرف ونحو کی تعلیمی کتاب میں عربی زبان کی مثالوں اور مشقوں کی تحریر اور ترتیب میں تین امور کو مدنظر رکھا جائے:

(۱) مثالوں اور مشقوں کی زبان مستند اور معیاری ہو، جس کی بہترین صورت یہ ہے کہ ان میں افصح الکتب قرآن کریم کی آیات کریمہ، احادیث نبویہ، مشہور عرب شعراء کے آسان اور عمدہ اشعار اور حکماء وعلماء کے اقوال، حِکم، قصص سے اقتباسات وغیرہ کو شامل کیا جائے۔

(۲) تربیتی مثالیں اور مشقیں بچے کے اپنے ماحول سے ماخوذ اور متعلق ہوں، لہذا ضروری ہے کہ ان تربیتی مشقوں میں زیر تعلیم بچوں کے اپنے دینی اور معاشرتی ماحول، عقیدہ، گھر، درسگاہ، معاشرے اور رشتہ داروں وغیرہ سے متعلق صحیح اور معیاری جملوں، محاوروں، مثالوں اور عبارتوں کو شامل

کیا جائے، تاکہ بچے اس مستند اور معیاری عربی ذخیرۂ لغت سے واقف ہوکر اسے اپنے ماحول میں پڑھنے لکھنے اور بولنے کی مشق کرتے ہوئے عربی کو ایک زندہ اور مستعمل زبان کی طرح سیکھیں۔

(۳) معیاری مثالوں اور مشقوں کی تعداد زیادہ ہو اور قواعد کم ہوں، پھر اسباق اور مشقوں میں تنوع ضروری ہے کہ کہیں نحو وصرف کے قواعد کی تطبیقات، کہیں متنوع معروضی سوالات ہوں۔

تیسرا اُصول:

بچوں کو صرف ونحو کی تعلیم وتدریس میں تدریج اور آسانی کو ملحوظ رکھا جائے اور پہلے ہی سال یا سالوں میں پورے فن یا فن کے زیادہ مسائل ومباحث کو پڑھانے کی کوشش نہ کی جائے، بلکہ پہلے اور دوسرے تعلیمی سال میں اس فن کے صرف کچھ تھوڑی سی بنیادی، آسان اور ضروری معلومات کی تعلیم پر اکتفا کیا جائے، اور ان کی تعلیم کی زبان اور طرز بیان اتنے سادہ اور آسان ہوں کہ کم سن بچے انہیں آسانی سے پڑھیں اور سمجھ لیں، اسی طرح تدریس کے دوران فن کی عملی مشق اور تربیت کا مواد، مثالیں اور جملے بھی سادہ اور عام فہم ہونے چاہیے اور یہ بھی ضروری ہے کہ عملی مشق کے مواد اور جملوں کا زیر تعلیم بچوں کے اپنے ماحول، گھر، درسگاہ، عقیدے اور مشاغل سے گہرا تعلق ہو۔

پھر دوسرے اور تیسرے سال باقی مسائل اور مباحث کی ایسی مفصل تدریس کرائی جائے جس کے دوران مستند اور معیاری مثالون اور مشقوں کے ذریعے عربی زبان وادب کے استعمال کی موثر تعلیم وتربیت کا اسلوب جاری رکھا جائے۔

چوتھا اصول:

درسی کتابوں میں مثالوں اور عبارتوں کی مکمل تشکیل نہ کی جائے، جب صرف ونحو کی تدریس کا اصل مقصد طلبہ کو اس فن کے قواعد اور معلومات کی عملی تربیت دینا اور مشق کرانا ہے تو پھر یہ ضروری ہے کہ اس تربیت اور مشق کا آغاز ان قواعد کی اپنی درسی کتاب سے کیا جائے اور زیر تعلیم بچوں کو اس کی مثالوں اور عبارتوں کی صحت نطق اور صحتِ اعراب کے ساتھ پڑھنے کا اچھا موقع دیا جائے، اس لئے عربی زبان اور صرف ونحو کی درسی کتابوں کی عبارتوں کی مکمل تشکیل نہیں ہونی چاہیے، یعنی اس پر زبر زیر پیش

نہیں لگانے چاہیے، بلکہ ابتدائی درجوں کے بعد کے تعلیمی مرحلوں کی درسی کتابوں کی تشکیل تدریجاً کم کردینی چاہیے تاکہ بچے خود اپنی محنت اور مشق سے انہیں صحت کے ساتھ پڑھنے، لکھنے اور بولنے کی صلاحیت حاصل کریں اور ان میں خود اعتمادی پیدا ہو، اور اپنی ذاتی جدوجہد اور مہارت کی بنیاد پر ترقی کریں۔

(ماہنامہ وفاق المدارس رجب ۱۴۳۶ھ)

(٦)

درس قرآن اور دورۂ تفسیر القرآن
کے لئے اصول وضوابط

کتاب ہذا اگرچہ مدارس عربیہ میں درس نظامی کے پڑھانے سے متعلق ہے لیکن مدرسین حضرات کی ایک بڑی جماعت درس قرآن اور دورۂ تفسیر القرآن کے لئے بھی ملاقات قائم کرتی ہے اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اس سلسلہ سے متعلق بھی اکابرین کے ارشادات شامل کردیے جائے۔

درس قرآن کے اُصول وآداب

محترم عبدالوحید پشاوری

عوام الناس میں خدمت دین کا بہترین اور موثر ذریعہ "درس قرآن" ہے اور اس کے موثر ہونے کی وجہ یہ ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے جب لوگوں کو دین کی طرف بلانا چاہا تو قرآن کو ذریعہ بنایا، قرآن پاک ایسی کتاب ہے جو بلا ترجمہ وتفسیر بھی زندگی کا رخ موڑنے کے لئے کافی ہے۔

دین پھیلانے والے اداروں کی موجودہ صورت کا قیام ماضی قریب میں ہوا، اس سے پہلے "درس قرآن" ہی کو عام طور پر اشاعت دین کا ذریعہ بنایا جاتا تھا، اب کچھ عرصہ سے درس قرآن کی محفلوں کی رونق غائب ہوتی جارہی ہے اور قرآن کا صحیح فہم رکھنے والے ائمہ مساجد اور علماء دوسرے علمی مشاغل میں لگے تو یہ میدان خالی رہ گیا، میدان کو خالی پاکر دو طبقے برسر عام آئے:

ایک وہ طبقہ جس نے "درس قرآن برائے درس قرآن" کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا اور اشاعت دین اور اصلاح معاشرہ کے بجائے امت کو افتراق وانتشار سے دوچار کیا اور کوئی خاطر خواہ ثمر، نتیجہ سامنے نہیں آیا۔

دوسرا طبقہ وہ ہے جو خالص انگریزی ماحول میں پلے بڑھے، جن کو کبھی عربی زبان وادب سے واسطہ نہیں پڑا، انہوں نے اردو تفاسیر سے ترجمہ دیکھ کر فہم قرآن کے نام سے عوام الناس میں اپنا مشن ونظریہ پھیلانا شروع کردیا، اس مقصد کی عملی صورت کے لئے وہ کرایہ کے مکانات لے لے کر ان میں لاوڈ اسپیکر کرسیاں وغیرہ مہیا کرکے اور لوگوں کو جمع کرنے کے لئے اشتہارات چھپواکر لاکھوں روپے خرچ کرلیتے ہیں۔

لیکن اس وقت بہت افسوس ہوتا ہے کہ ہمارے علماء اور ائمہ مساجد کے پاس ہر سہولت موجود ہے، جگہ موجود ہے، منبر ومحراب موجود ہیں، لاؤڈ اسپیکر کا بندوبست ہے، زمین پر کارپٹ لگا ہوا ہے،

لوگ جن میں پانچ مرتبہ خود بخود حاضر ہوجاتے ہیں، ان کو بلانے کے لئے اعلان نہیں کرنا پڑتا، اشتہارات نہیں چھپوانے پڑتے، سب کچھ بدرجہ اتم موجود ہیں، لیکن اگر نہیں ہے تو امام وخطیب صاحب کے دل میں درد نہیں ہے، کڑھن نہیں ہے، جو اس کو اس بات پر مجبور کرے کہ لوگوں کی اصلاح کی فکر کرے، معاشرہ بدترین برائیوں کا شکار ہے،یہ بحیثیت لوگوں کے امام کے اپنا کچھ کردار ادا کرے اور لوگوں کو اس فتنہ وفساد کے دور میں صراط مستقیم پر چلائے، جو معاشرہ کے لوگوں کا بنیادی حق ہے اور اگر کوئی نام نہاد درس قرآن شروع بھی کرے تو ذمے داری سمجھنے کے بجائے بوجھ سمجھ کر جان چھڑاتاہے، ظاہر ہے ایسی حالت میں درس قرآن کی محفلیں کب بارونق ہوسکتی ہیں، اور جدید مسائل سے دوچار انسانوں کے مسائل کب حل ہوسکتے ہیں اور ان کی پیاس کب بجھ سکتی ہے۔

اس لئے ائمہ مساجد اور علمائے کرام کے سامنے دست بستہ عاجزانہ درخواست کرتے ہیں کہ وہ درس قرآن کو اصول او رآداب سے سرانجام دے کر اصلاح معاشرہ، اشاعت دین اور مسائل حاضرہ کے حل کاذریعہ بنائیں، ذیل میں درس قرآن سے متعلق چند اصول وآداب ذکر کئے جاتے ہیں:

(۱) درس قرآن دینے والے کو اول اپنی نیت درست کرنی چاہیے کہ اس کے دل میں یہ درد ہو، کڑھن ہو، بے چینی ہو کہ میں نے لوگوں کو کچھ دینا ہے اور ان کو برے انجام سے بچانا ہے، اس مقصد کے لئے اس کا دل ایسا بے چین ہو کہ {لعلک باخع نفسک أن لا یکونوا مؤمنین} والی حالت ہو۔

(۲) درس قرآن کو ایک اہم کام سمجھ کر اس کے لئے مستقل وقت نکالنا ہوتاہے، اگر دل میں کام کی اہمیت ہو تو وقت خودبخود نکل آئے گا۔

(۳) درس دینے میں پابندی کرنا بہت ضروری ہے، سامنے بیٹھنے والوں کی تعداد پر نظر نہ ہو، کام کی اہمیت پہ نظر ہو۔

(۴) درس قرآن کا مقصد صرف اور صرف لوگوں کی خیر خواہی ہونی چاہیے، دل میں کسی سے کسی قسم کا کوئی لالچ اور غرض پوشیدہ نہ ہو، ورنہ یہ بات حق بات کے پہنچانے میں رکاوٹ بنے گی۔

(۵) درس میں بیٹھنے والے لوگوں کی عقیدت اور اعتماد حاصل کیا جائے، اس کے لئے ضروری ہے کہ دل میں خالص ان کی صلاح کی فکر ہو۔

(۶) مستقل سامعین کے لئے درس شروع سے رکھا جائے، اور غیر مستقل سامعین کے لئے منتخبات رکھے جائے اور کسی ایک موضوع سے متعلق ساری آیات بیان کی جائیں، اور مرکزی موضوع کو مدنظر رکھا جائے۔

(۷) زبان وبیان میں انتہائی سادگی سے کام لیا جائے، ثقیل اور مشکل الفاظ کے استعمال سے اجتناب اور گریز کیا جائے، خالص آسان زبان استعمال کی جائے، لیکن عامیانہ پن سے بچا جائے۔

(۸) اردو زبان میں عربی اور فارسی کے الفاظ بکثرت استعمال ہوئے ہیں، لیکن آج کل فارسی کی جگہ انگریزی نے لے لی ہے، اگر انگریزی الفاظ استعمال کرنے ہوں تو اس کے لئے یہ بات ضروری ہے کہ استعمال ہونے والے الفاظ کے معنی ومفہوم اور پس منظر سے مکمل واقفیت ہو، ورنہ ہرگز استعمال نہ کرے۔

(۹) کسی علمی بات کو سامع تک پہنچانے کے لئے آسان سے آسان الفاظ کا انتخاب کرے تاکہ سامع کا ذہن اس کو قبول کرنے پر جلد آمادہ ہو۔

(۱۰) قرآنی آیات کو ان کے شان نزول کے ساتھ محدود نہ کیا جائے، قرآن پاک زندہ جاوید کتاب ہے، ہر زمانہ کے لئے یکساں طور پر بھیجا گیا ہے، آج کل ہوتا یہ ہے کہ آیات کو ان کے شان نزول کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے، جن کی وجہ سے موجودہ زمانہ اور بعد میں رونما ہونے والے واقعات کے ساتھ ان کی تطبیق کا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا، اور لاشعوری طور پر سامعین کا ذہن یہ بنتا جاتا ہے کہ اللہ نے عرب کے ایک معاشرے پر صرف تبصرہ کیا ہے، اس سے آگے ان کے ذہنوں میں کیا بات آسکتی ہے، جب خود درس دینے والے کے ذہن میں کچھ نہ ہو۔

(۱۱) عام طور پر زیر درس آیات کا ماقبل آیات سے ربط بیان کیا جاتا ہے، پھر ربط کبھی ظاہر ہوتا ہے، کبھی خفی، کبھی ضعیف ہوتا ہے، کبھی قوی، یہ علمی بحثیں ہیں، ان کا تعلق علماء سے ہے، عوام کے

سامنے ان بحثوں کے بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔

(۱۲) قرآنی آیات عصری تطبیق کے ساتھ پیش کی جائیں، مثلاً اصحاب بدر کے بارے میں نازل ہونے والی آیات کا ہماری زندگیوں سے کیا تعلق ہے، اور موجودہ زمانہ کے لئے ان سے ہمیں کیا رہنمائی ملتی ہے۔

(۱۳) آیات کی عصری تطبیق پر قادر نہ ہونا اور موجودہ حالات پر آیات قرآنی کی روشنی میں تبصرہ نہ کرپانا، عقل کے ناقص ہونی کی علامت ہے۔

(۱۴) آیات کی عصری تطبیق کے لئے خارجی مطالعہ کرنا بہت ضروری ہے، معیاری مواد، معتبر جرائد اور سائل اور مستند محققین اور مصنفین کی کتابیں زیر مطالعہ ہونی چاہئیں۔

(۱۵) درس دینے والے کو اپ ڈیٹ رہنا چاہیے، بلا استثنا کے ہر کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے اور مختلف موضوعات کو زیر فکر رکھنا چاہیے۔

(۱۶) دینی علوم کے ساتھ عصری علوم میں بھی مہارت ہو، سامعین کو بوریت سے بچانے کے لئے سیرت وتاریخ اور "سائنس وقرآن" پر لکھی گئی کتابیں مطالعہ میں رکھنا ضروری ہے۔

(۱۷) درس کے لئے جتنا مطالعہ کیا ہے سب کو بیک وقت سنانا ٹھیک نہیں ہے، بلکہ موقع کا انتظار کرنا چاہیے۔

(۱۸) درس کے بعد سوالات کا موقع دینا چاہیے اگر اپنے اوپر اعتماد نہ ہو تو شروع میں یہ وقفہ کم رکھا جائے، اور سامعین کے سامنے یہ وضاحت کی جائے کہ سوالات کا یہ وقفہ آہستہ آہستہ بڑھائیں گے۔

(۱۹) یومیہ درس کے لئے تین گنا زیادہ مطالعہ کرنا چاہیے، مطالعہ کا ایک ثلث بیان کرنے کے لئے، دوسرا ثلث سوالات کے جوابات دینے کے لئے، اور تیسرا اور آخری ثلث متوقع سوالات کی نیت سے کرنا چاہیے۔

(۲۰) عام طور پر سامعین کے ذہنوں پر مختلف نظریات سوار ہوتے ہیں، کچھ باتیں انہوں نے میڈیا

سے سنی ہوتی ہیں، کچھ باتیں گمراہ اور بدعتی لوگوں سے سنی ہوتی ہیں، اور کچھ باتیں درس میں سنی ہیں تو جو باتیں یہاں درس میں سنتے ہیں ان میں اتنی طاقت ہونی چاہیے جو ان کے ذہنوں سے باقی سارے نظریات مٹاسکے، اور یہ مقصد اس وقت حاصل ہوگا جب درس دینے والے کی تیاری پہلے سے اتم اور اکمل ہو۔

(۲۱) متعلقہ کتابوں کے علاوہ جدید کتابوں کا اپنا ایک منتخب مطالعہ بھی ہونا چاہیے اور اس سے قبل اس پر ایک نظر ڈال لی جائے ہوسکتا ہے اس میں کسی سوال کا جواب نظر سے گزر جائے۔

(۲۲) ہر مرتبہ درس دینے سے پہلے اور بعد میں سامعین کے اندر اعمال اور عقائد کے لحاظ سے تبدیلی آنی چاہیے۔

(۲۳) سامعین کی دلچسپی بڑھانے کے لئے سارے اوقات مشغول رکھے جائیں، روزانہ درس دینے کے علاوہ ہفتہ وار، ماہانہ اور سالانہ اجتماعات منعقد کئے جائیں۔

(۲۴) ہر عمر کے افراد کے لئے الگ الگ اجتماعات منعقد کئے جائیں، مثلاً نوجوانوں کے لئے علیحدہ بوڑھوں کے لئے علیحدہ، بچوں کے لئے علیحدہ اور خواتین کے لئے علیحدہ پروگرام رکھے جائیں۔

(۲۵) بنیادی طور پر ہمارا فرض منصبی یہ ہونا چاہیے کہ لوگوں کو ہر حال میں باطل نظریات سے بچانا ہے اور ان کو حق اور اہل حق کے ساتھ وابستہ کرنا ہے۔

(۲۶) عموماً وسائل کی کمی کا رونا رویا جاتا ہے، لیکن اگر دل میں تڑپ ہو، درد ہو، کڑھن ہو، راتوں کو اللہ سے مانگنا آتا ہو تو پھر مقاصد وسائل خود پیدا کرتے ہیں اور عزائم راستے خود ڈھونڈتے ہیں۔

مندرجہ بالا اصول وآداب بروئے کار لاتے ہوئے اگر درس قرآن دیا جائے تو بہت ہی کار آمد ثابت ہوتا ہے، اگرچہ یہ تھوڑا پرمشقت کام ہے، لیکن اس کے صلہ میں جو تسخیر حاصل ہوگی اس پر پوری دنیا کو قربان کرنے کو جی چاہے گا، دلوں کے لگام ہاتھ میں آجائیں گے، پھر اس بات کا امکان سرے سے ختم ہوجائے گا کہ کوئی شخص حلقۂ درس سے نکل کر غیروں کے پاس چلا جائے، اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی وناصر ہو۔ (ماہنامہ الفاروق رجب ۱۴۳۶ھ)

اور مولانا محمد اسلم شیخوپوری شہید رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

قرآن کا مقصدِ اولین انسانوں کی ہدایت ہے، نہ یہ میڈیکل اور سائنس کی کتاب ہے اور نہ اپنے نظریات کی تصدیق کے لئے جدید ریسرچ کی محتاج ہے، لہذا کمزور باتیں اور ایسی تحقیقات جن کے لئے دور دراز کی تاویلیں کرنی پڑیں انہیں قطعاً قطعاً اپنے درس کا حصہ نہ بنائیں، ہاں! بعض طبائع اس اندازِ بیان سے متاثر ہوتی ہیں اور ان کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے تو ان کے لئے مسلّمہ تحقیقات بیان کرنے میں کوئی حرج بھی نہیں، لیکن طرزِ بیان سے سائنس کو قرآن کا تابع ثابت کیجئے متبوع بنانے سے اجتناب کریں، جدید مسلّم تحقیقات میں سے چند مثالیں ذکر کرتا چلوں:

ارشاد ربانی ہے: {فَالْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُونَ لِمَنْ خَلْفَكَ آيَةً} (یونس:۹۲)

"آج ہم تیرے بدن کو نجات دیں گے اور بعد والوں کے لئے اسے عبرت بنادیں گے"۔

آج سے سوا سو سال پہلے تک فرعون کی لاش کا کہیں نام ونشان نہ تھا، چنانچہ آپ قدیم تفاسیر اٹھاکر دیکھیں تو مفسرین نے مختلف تاویلیں کی ہیں:

کسی نے کہا کہ اللہ نے ایک مہینہ یا ایک سال تک اس کی لاش کو سلامت رکھا، لہذا اتنا عرصہ تک وہ لوگوں کے لئے نشانِ عبرت بنی رہی اور پھر ختم ہوگئی، کسی نے کہا کہ بدن کا اطلاق "زرہ" پر بھی ہوتا ہے اور اس کی "زرہ" محفوظ تھی، لیکن سوا سو سال پہلے عیسائی ماہرین آثار قدیمہ نے اہرامِ مصر کی کھدائی کا کام شروع کیا تو مختلف صندوق پڑے ہوئے ملے جن میں حنوط شدہ لاشیں تھیں، ان میں سے ایک صندوق میں فرعون کی لاش بھی تھی، اور جب اس کے زمانہ کا اندازہ لگایا گیا تو ثابت ہوا کہ یہ وہی فرعون ہے جو سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں آپ کے خلاف برسرِپیکار رہا۔

اس تحقیق سے قرآن کی پیشن گوئی: {فَالْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ} درست ثابت ہوئی۔

سورۂ ذاریات میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: {وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ} ہم نے ہر چیز کو جوڑا جوڑا بنایا ہے۔

کچھ عرصہ قبل تک یہی نظریہ رائج تھا کہ جوڑا جوڑا صرف انسانوں میں ہوتا ہے، لیکن آج جدید

تحقیقات کے ذریعے یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ انسانوں کے علاوہ درخت، پتھر اور دیگر اشیاء بھی جوڑا جوڑا ہیں، کائنات کا سب سے چھوٹا ذرّہ ایٹم ہے اور وہ بھی "پروٹان" اور "نیوٹران" کی صورت میں جوڑا جوڑا ہے۔

قرآن نے انسان کی تخلیق کے مراحل کی یہ ترتیب بیان فرمائی: {ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا}۔

اور آج جدید آلات سے رحم مادر کا مشاہدہ کرنے کے بعد سائنسدان اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ تخلیق کے جو مراحل قرآن نے بیان کئے ہیں ان میں اول تا آخر صداقت ہی صداقت ہے۔

اس قسم کی مسلّم تحقیقات ضرور بیان کی جائیں، لیکن آج جو یہ رواج چل پڑا ہے کہ تحقیق بعد میں آتی ہے اور اس کا تعلق قرآن سے پہلے ہی جوڑ دیا جاتا ہے یہ بالکل غلط ہے۔

درس تفسیر کا ایک لازمی جزء تقابلِ کتب بھی ہے، یعنی قرآن کسی مضمون کو کس پیرائے میں بیان کرتا ہے اور تورات وانجیل میں اس مضمون کو کیسے بیان کیا گیا ہے۔

دیگر آسمانی کتابوں اور ادیان کے ساتھ تقابل سے قوتِ ایمانیہ میں زبردست اضافہ ہوتا ہے اور دینِ اسلام کی صداقت ومحبت کے جذبات دل میں مچلنے لگتے ہیں، ایک مثال اس کی بھی ملاحظہ فرمالیں:

اللہ تعالیٰ نے سورۂ انعام میں مختلف انبیاء کا ذکر فرمایا: {وَزَكَرِيَّا وَيَحْيَى وَعِيسَى وَإِلْيَاسَ}
اور پھر آگے ارشاد فرمایا: {كُلٌّ مِنَ الصَّالِحِينَ} یہ سب کے سب نیکوکار تھے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی نبی کے صالح ہونے میں کیا شک ہوسکتا ہے؟ اللہ کا ہر نبی تقویٰ کے اعلیٰ معیار پر فائز ہوتا ہے، پھر {كُلٌّ مِنَ الصَّالِحِينَ} کا ذکر کرنا کیا معنی؟

اس جملہ کے اضافے کی حکمت اور اہمیت کا اندازہ تب ہوا، جب بائبل اٹھا کر دیکھی، بائبل کہتی ہے کہ معاذ اللہ! اللہ کا نبی کاہن ہوسکتا ہے، جادوگر ہوسکتا ہے، شرابی ہوسکتا ہے، زانی ہوسکتا ہے، حتیٰ کہ بت پرست بھی ہوسکتا ہے۔

قرآن نے {كُلٌّ مِنَ الصَّالِحِينَ} فرماکر ان تمام غلیظ اور جھوٹی نسبتوں کی نفی فرمادی۔

تقابل کتب وادیان کے ساتھ ساتھ سنجیدہ، علمی اور تحقیقی انداز میں فرقِ باطلہ کی تردید بھی ضروری ہے، آپ کے تلامذہ کو معلوم ہونا چاہیے کہ کون کون سے فرقے ہیں جو اسلام کے نام پر لوگوں کو گمراہ کر رہے ہیں، اور آج جبکہ روزانہ کسی نہ کسی نئے فرقے کا ظہور ہو رہا ہے تو اس موضوع کی اہمیت دوچند ہو جاتی ہے۔

(رموز تدریس: ۱۵۱، ۱۵۴)

مساجد میں درس قرآن

مولانا اشتیاق احمد قاسمی مدرس دارالعلوم دیوبند

قرآن مجید کتابِ قراء ت بھی ہے اور کتابِ ہدایت بھی، لیکن آج ہم نے اس کو صرف کتاب قراء ت بنالیا ہے، حالانکہ علمائے امت نے قرآن پاک کا ترجمہ خصوصا عوام کے لئے کیا ہے، جب زبان فارسی تھی تو سب سے پہلے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ نے فارسی میں ترجمہ کیا، پھر ان کے صاحب زادوں نے اردو زبان میں ترجمہ کیا، حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے شاہ عبدالقادر صاحب رحمہ اللہ کے ترجمہ کو اپنے زمانہ کی اردو زبان میں مہذب کیا، اس پر حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے تفسیری حاشیہ لکھا، یہ سب عوام کے لئے کیا گیا، اس لئے عوام کو قرآن پاک کے یہ ترجمے پڑھنے چاہئیں، مسلمانوں کے مصائب وآلام او رذلت وپستی کے من جملہ اسباب میں سے ایک قرآنِ پاک سے دوری ہے، حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ جب مالٹا سے دیوبند تشریف لائے تو علماء کے درمیان ارشاد فرمایا:

"میں مالٹا کی جیل سے یہ سبق لے کر آیا ہوں کہ اپنی پوری توانائی دو کاموں میں صرف کرنا ہے، ایک تو قرآن کو گاؤں گاؤں محلے محلے اور گھر گھر عام کرنا ہے کہ کم از کم اس کی لفظی تعلیم سے کوئی مرد وعورت بچہ بوڑھا خالی نہ رہے اور بڑی مسجدوں میں "درس قرآن" جاری کئے جائیں، جن میں آسان تفسیر قرآن عوام کو پڑھائی جائے، دوسرے آپس کی لڑائی جھگڑوں کی کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے"۔ (الخیر کثیر: ۸۰)

آج ضرورت ہے کہ "درس قرآن" کے ذریعہ عام مسلمانوں کو قرآنی مضامین سے واقف کرایا جائے، خاص طور سے جو آیتیں تذکیری پہلو رکھتی ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی یاددہانی اور آفاق وانفس میں غور وتدبر والی آیتیں، انبیائے کرام علیہم السلام کے واقعات، نافرمانوں کو سزا دیے جانے کے واقعات، عام نصیحت کی آیتیں، سبق آموز عبرت وموعظت سے عام مسلمانوں کو آگاہ کیا جائے، دنیا کے فنا ہوجانے اور آخرت کے ہمیشہ باقی رہنے، قبر، حشر، جنت اور جہنم کی آیات کی معانی سے ان کو آگاہ کیا جائے، موت اور اس کے بعد جزا وسزا کا استحضار کرایا جائے۔

اگر مساجد میں "درس قرآن" کی مجلسیں ہونے لگیں تو عوام علماء سے قریب ہوں گے، زندگی شریعت کے مطابق گزارنے کا حوصلہ پیدا ہوگا، قرآن پر امت متفق ہوگی، اس کی نورمیت سے معاشرہ روشن ومنور ہوگا۔

قرآن پاک میں الفاظ اکثر وہی ہیں جو ہم اردو میں بولتے ہیں، مثلاً: سورۂ فاتحہ میں حمد، رب، عالم، رحمن، رحیم، مالک، عبادت، ہدایت، اور صراط مستقیم جیسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، صیغے اور انداز کا فرق ہے، اگر ہم عوام کو ہر ہر لفظ کا ترجمہ بتاکر روزانہ یا ہفتہ میں ایک دو آیت پڑھادیا کریں تو دھیرے دھیرے لوگ الفاظ قرآنی سے قریب ہوجائیں گے، کہاجاتاہے کہ قرآن پاک میں الفاظ دو ہزار کے قریب استعمال ہوئے ہیں، ان میں تقریباً پندرہ سو الفاظ ہم روز مرہ بول چال میں استعمال کرتے ہیں، اس لئے بقیہ الفاظ کو سیکھنا بھی کچھ بعید نہیں، کرنے سے کام آسان ہوتاہے۔

درس قرآن کا انداز:

درس قرآن کا اسلوب نہایت آسان اور سہل رکھا جائے، جس سے عام لوگ مانوس ہوں، الفاظ بھی بالکل عوامی استعمال کریں، موٹے موٹے عقائد، بدعات ورسوم سے اجتناب، معاشرہ کی اصلاح، اعمالِ صالحہ کی ترغیب، اچھے اخلاق کی تلقین اس انداز سے کی جائے جو قبولِ عام حاصل کرسکے۔

آج کل لوگوں کی مصروفیت بہت بڑھ گئی ہے، اس لئے پندرہ منٹ سے زیادہ نہ لیا جائے، مشورہ سے ایسا وقت متعین کیا جائے جس میں سب کو سہولت ہو، جو اردو جانتے ہوں ان کو اردو ترجمہ وتفسیر مطالعہ کرنے کا مشورہ دیا جائے، مثلاً حضرت تھانوی رحمہ اللہ کا ترجمہ، معارف القرآن، ترجمہ شیخ الہند رحمہ اللہ، مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری مدظلہ کی ہدایت القرآن، مفتی تقی عثمانی مدظلہ کی توضیح القرآن، وغیرہ اور جو ہندی اور انگریزی جانتے ہوں ان کو ایسے ترجمے مہیا کئے جائیں اور تاکید کی جائے کہ قرآن میں اپنی رائے نہ چلائیں، ہاں جو باتیں سمجھ میں نہ آئیں انہیں صحیح فکر کے حامل علماء سے پوچھیں، اس طرح عام مسلمان قرآن سے قریب ہونگے اور ان کی زندگی کے لئے قرآنِ پاک کتابِ ہدایت ثابت ہوگی۔ (ماہنامہ دقائق المدرس شوال: ١٤٣٣ھ)

دورہ تفسیر کی اہمیت وضرورت

مولانا زبیر احمد صدیقی صاحب

جامعات ومدارس کی سالانہ تعطیلات میں قرآنی علوم ومعارف طلباء وعلماء تک منتقل کرنے طالبین قرآن کریم میں تفسیری ذوق بیدار کرنے اور فہم قرآن کا ملکہ پیدا کرنے کے لئے دورہ ہائے تفسیر قرآن کریم کا سلسلہ آج سے نہیں، بلکہ برسہا برس سے چلا آرہا ہے، اکابرین اہل سنت والجماعت علمائے دیوبند مختلف مقامات پر تعطیلات میں تفسیر قرآن کریم کے حلقے قائم فرماتے اور ان کے حلقہائے درس میں سینکڑوں شائقین علوم قرآنیہ جوق درجوق شریک ہوتے، بالخصوص جامعات سے فارغ ہونے والے اور اپنے سروں پر دستارِ فضیلت سجانے والے علماء وفضلاء سے تاکید کی جاتی کہ وہ میدان عمل میں اترنے سے قبل دورۂ تفسیر قرآن کریم ضرور پڑھ لیں۔۔۔۔۔

برصغیر کے ممتاز محدثین وفقہائے کرام اپنے فاضل تلامذہ کو دورۂ تفسیر پڑھنے کے لئے حلقہ ہائے تفسیر میں تاکید کے ساتھ بھیجتے، فضلائے دار العلوم دیوبند کو حضرت لاہوری رحمہ اللہ وغیرہ کی خدمت میں دورۂ تفسیر پڑھنے کے لئے بھیجا جاتا، جلال پور پیروالا، ضلع ملتان سے حضرت مولانا خان محمد صاحب رحمہ اللہ فاضل دیوبند ارشاد فرماتے ہیں کہ ہمیں حضرت مولانا اعزاز علی رحمہ اللہ نے فراغت پر حضرت لاہوری رحمہ اللہ کی خدمت میں دورۂ تفسیر پڑھنے کا حکم دیا۔۔۔۔۔

دور حاضر میں جامعات ومدارس کے کچھ اساتذہ دورۂ تفسیر کے نصاب ونظام اور افادیت سے عدم واقفیت کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ اس کی مخالفت کا بیڑہ اُٹھائے ہوئے ہیں بلکہ بعض ایک تو اسے ضیاع وقت، فضول مشق اور مہمل عمل قرار دیتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ الناس أعداءٌ لما جهلوا کے مصداق ہیں۔

ذیل میں دورۂ تفسیر قرآن کریم کے تعلیمی نظم اور اندازِ تدریس کے متعلق چند گزارشات پیش کی

جاری ہیں، جن سے اندازہ ہو گا کہ اکابر کا جاری کردہ یہ نظام کتنا مفید، نافع، موثر اور مبارک ہے:

(۱) ترجمۂ قرآن کریم سے قبل طلباء کو ایک مفید علمی مقدمہ پڑھایا جاتا ہے، جس میں قرآن کریم، تفسیر قرآن کریم سے متعلقہ مباحث، مثلاً تعریف، موضوع، غرض وغایت، مراتب تفسیر، تفسیر وتاویل میں فرق، تفسیر بالرای، تحریف کی تعریفات، اہم تفاسیر اور مفسرین کا تعارف، مختلف تفاسیر کی خصوصیات، جمع وتدوین قرآن کریم، مضامین قرآن کریم، اعجازِ قرآن کریم، وجوہ اعجاز سمیت کئی ایک مفید مباحث پڑھائی جاتی ہیں۔

(۲) قرآن مجید کا لفظی اور بامحاورہ ترجمہ طلباء کو پڑھایا جاتا ہے۔

(۳) ہر سورت کا آسان اور جامع الفاظ میں خلاصہ تحریر کرایا جاتا ہے، جس سے سورت کو سمجھنا آسان تر ہو جاتا ہے۔

(۴) ہر سورت سے قبل سورت کا مضمون مختصر الفاظ میں تحریر کرایا جاتا ہے جو تقریباً سورت کا مرکزی خیال ہوتا ہے۔

(۵) ہر سورت کا ماقبل سورت کے ساتھ ربط پڑھایا اور لکھوایا جاتا ہے، اور ربط کی مختلف تقریریں ذکر کی جاتی ہیں، مثلاً سورت کے اول کا سورت کے گزشتہ کے اول کے ساتھ، آخر کے آخر کے ساتھ، آخر سورت کا اول سورت کے ساتھ، مضمون سورت کا گزشتہ سورت کے مضمون کے ساتھ، اور الفاظ کا الفاظ کے ساتھ وغیرہ۔

(۶) مضامین قرآن کا سور، رکوعات اور آیات پر انطباق، مضامین قرآن کی تفصیل، مختلف اکابر نے مختلف انداز سے فرمائی ہیں، مثلاً:

(الف) سلاسل سبعہ:

قرآن کریم میں حق سبحانہ وتعالیٰ نے سلاسل سبعہ ذکر فرمائے ہیں:

(۱) دعاوی (اصول اربعہ: توحید، رسالت، صداقت قرآن اور قیامت کو بطور دعوی پیش کیا جاتا ہے)۔

(۲) دلائل (دلیل عقلی محض، دلیل عقلی مع اعتراف الخصم، دلیل نقلی، دلیل وحی، پھر دلیل عقلی میں دلیل نفسی اور دلیل آفاقی اور دلیل نقلی کی سات اقسام)۔

(۳) شکوہ جات، کہیں محض شکوہ اور کہیں جوابِ شکوہ بھی مذکورہ ہوتا ہے۔

(۴) تخویفات (تخویف دنیوی، تخویف اخروی)۔

(۵) تنبیہات (تنبیہ انبیاء علیہم السلام، تنبیہ مومنین، تنبیہ منکرین)۔

(۶) تسلیات (تسلی انبیائے کرام علیہم السلام، تسلی مومنین)۔

(۷) ازالہ شبہات (مخالفین کے مذکور وغیر مذکور شبہات کے جوابات)۔

(ب) مضامین خمسہ:

امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ قرآن مجید کے پانچ مقصودی مضامین ذکر فرماتے ہیں:

(۱) علم المخاصمہ، (فرق باطلہ کے عقائد واعمال باطلہ کا ابطال)۔

(۲) علم الاحکام (اوامر ونواہی)۔

(۳) تذکیر بآلاء اللہ (تذکرۂ انعامات خداوندی)۔

(۴) تذکیر بایام اللہ (امم سابقہ کے حالات)۔

(۵) تذکیر بما بعد الموت (بعد از موت آنے والے حالات)۔

(ج) علوم اربعہ:

حضرت امام غزالی رحمہ اللہ نے مضامین قرآن کا احاطہ چار چیزوں میں فرمایا ہیں:

(۱) علم الاصول (توحید، رسالت، اور قیامت)۔

(۲) علم الاحکام (اوامر ونواہی)۔

(۳) علم القصص (انبیائے سابقین علیہم السلام اور امم سابقہ کا ذکر)۔

(۴) علم السلوک (اعتماد علی اللہ)۔

(د) حصص اربعہ:

رئیس الموحدین حضرت مولانا حسین علی رحمہ اللہ کے نزدیک مضامین کے اعتبار سے قرآن مجید کے چار حصے ہیں، ہر حصہ کی ابتداء الحمد للہ سے ہوتی ہے:

۱۔ پہلا حصہ سورت فاتحہ سے سورت مائدہ کے آخر تک ہے، اس میں کثرت سے خالقیت باری تعالیٰ کو بیان کیا گیا ہے۔

۲۔ دوسرا حصہ انعام سے سورت بنی اسرائیل کے آخر تک ہے، اس حصہ کا مرکزی مضمون ربوبیت باری تعالیٰ ہے۔

۳۔ تیسرا حصہ سورت کہف سے سورت احزاب تک ہے، اس میں اکثر تصرف باری تعالیٰ کا بیان ہے۔

۴۔ چوتھا حصہ سورت سبا سے آخر قرآن تک ہے، اس میں زیادہ مالکیت باری تعالیٰ اور نفی شفاعت قہری کا بیان ہے۔

(۷) ہر رکوع کا موضوع اور خلاصہ آسان اور اصطلاحی الفاظ میں تحریر کرایا جاتا ہے۔

(۸) ہر رکوع کا ماقبل رکوع سے ربط بیان کیا جاتا ہے۔

(۹) دورانِ درس صرفی، نحوی مشکلات کے حل کی طرف بھی اشارات کئے جاتے ہیں۔

(۱۰) دور حاضر کے فتنوں کا رد آیاتِ قرآنیہ کی تفسیر کے ضمن میں مبسوط اور مفصل انداز سے کیا جاتا ہے۔

(۱۱) علاوہ ازیں جامعہ فاروقیہ شجاع آباد میں دورۂ تفسیر قرآن کریم کے ساتھ تقابل ادیان و مسالک مستقل موضوع بناکر پڑھایا جاتا ہے، جس میں یہودیت، عیسائیت، ہندومت، قادیانیت وغیرہ کا تعارف اور اسلام کے ساتھ تقابلی جائزہ اور دورِ حاضر کے فتنوں کا تعارف وتعاقب پڑھایا جاتا ہے۔

(۱۲) مختلف تفسیری احتمالات میں سے راجح تفسیر اور مرجوح تفسیر کو ذکر کرکے وجوہ ترجیح پیش کی جاتی ہیں۔

(۱۳) علاوہ ازیں طلباء کی اخلاقی تربیت، ذہن سازی سمیت دیگر بہت سے فوائد چالیس روزہ دورہ سے نصیب ہوتے ہیں۔

امید ہے کہ دورہ تفسیر کے اس نظام ونصاب سے آگاہی کے بعد شکوک وشبہات دور ہوجائیں

ہے اور اس مفید اور نافع عمل کی جانب علماء وطلباء کی توجہات مبذول ہوں گی اور اکابر کے اس سلسلہ کو مضبوط کیا جائے گا۔

(ماہنامہ الفاروق شعبان ۱۴۳۱ھ)

تدریس کے لئے مطالعہ

طریقہ، ضرورت، اہمیت

مطالعہ کے لئے چند مفید اور کارآمد باتیں

شیخ الحدیث حضرت مولانا نذیر احمد صاحب رحمہ اللہ

ذوق مطالعہ:

ذوق مطالعہ ہر انسان کے لئے بالخصوص معلم کے لئے ایک بہت بڑی خوبی ہے، بلکہ تمام خوبیوں کی جڑ اور بنیاد ہے، معلم کی اصل ذمہ داری معلومات اور انوار علم احسن اسلوب سے شاگردوں میں تقسیم کرنا ہے، جو مواد تلامذہ کو دینا ہے، جو موتی ان میں تقسیم کرنے ہیں جو پھولوں کے ہار ان کے گلے میں ڈالنے ہیں ان سب کی تحصیل کا ذریعہ مطالعہ ہے، مطالعہ ناقص ہو اور پھر یہ توقع رکھنا اور دعوی کرنا کہ میری تعلیم کامل ہے دھوکہ دہی کے علاوہ کچھ نہیں ہے، تکمیل مطالعہ تکمیل علم کے لئے اور معیار تعلیم کو بلند کرنے کے لئے سب سے بڑا موقوف علیہ ہے، جہاں سکولوں اور کالجوں کا معیار تعلیم ناگفتہ بہ ہے وہاں ہمیں بھی اس حقیقت کا اعتراف کرلینا چاہئے کہ ہمارے ہاتھوں تعلیمی معیار کی بلندی کا جنازہ نکل چکا ہے، قوم پوری فیاضی سے کروڑوں روپے مدارس پر خرچ کررہی ہے لیکن سب بے ثمر درخت بنتے جارہے ہیں یا کم از کم قلیل الثمر تو کہنا ہی پڑے گا، اس کے وجوہ اور بھی ہوں گے لیکن بڑی وجہ ذوق مطالعہ کا نہ ہونا ہے، اگر مطالعہ کرتے بھی ہیں تو انتہائی سطحی قسم کا۔

جب مطالعہ کا ذوق ہوگا تو یہ معلم کے اطوار میں نمایاں امتیاز پیدا کرے گا، پہلی امتیازی شان تو یہ ہوگی کہ تکمیل مطالعہ کے لئے غیر ضروری اشغال اور تمام فضولیات کو ذوق مطالعہ ایک ہی ضرب سے اڑا کر رکھ دے گا، مطالعہ کے بغیر اس کی تسکین نہیں ہوگی، اس لئے غیر تعلیمی مشاغل میں وقت کٹی سے اسے بہت زیادہ تنفر پیدا ہوجائے گا، آپ کے اندر ذوق مطالعہ ہے تو یقین کیجئے کہ حق تعالی آپ کو محروم نہیں رکھیں گے، آپ کے فیوض نمایاں نظر آئیں گے، اگر آپ کے اندر یہ وصف نہیں ہے تو پھر مدرست کی ملازمت ایک دنیاوی تجارت ہے جب تک چاہیں کرتے رہیں، معلم کے لئے ذوق مطالعہ کا پہلا ثمرہ

تفریغ الاوقات للمطالعہ ہے، اور یہی آپ کے ذوق کو پرکھنے کی کسوٹی ہے۔

تکمیل مطالعہ کے لئے کن مراحل سے گزرنا پڑے گا؟ سادہ الفاظ میں ان کی نشاندہی کی جاتی ہے:

ا۔ جمع معلومات:

جس کتاب کا جتنا سبق پڑھنا ہے اس حصہ کی عبارت ٹھیک کی جائے۔

ترجمہ ٹھیک کیا جائے۔

اس کا مطلب سمجھا جائے۔

کوئی اشکال ہے تو اس کا حل نکالا جائے۔

اگر کسی دخل مقدر کا جواب ہے تو اس دخل مقدر اور سوال کو سمجھا جائے کہ وہ کیا ہے؟ یہ عبارت اس کا جواب کیسے بنتی ہے؟

غرض یہ کہ اس حصہ کی صرفی نحوی تحقیق، صحت ترجمہ، متعلقات ترجمہ، اس عبارت کا نفس مطلب یہ ساری باتیں حل کرلینا یہ مطالعہ کا پہلا مرحلہ ہے، اولاً تو آپ اتنے حصہ متن میں غور کریں ان سب امور کو سمجھنے کے لئے اپنا دماغ استعمال کریں، مدرسہ نے آٹھ سال میں آپ کو عالم نہیں بنایا البتہ علمی مہم کے لئے آپ کا دماغ تیار کیا ہے، لہذا سب سے پہلے دماغ استعمال کریں، اپنے دماغ سے بالکل کام نہ لینا اور سارا بوجھ کسی شرح یا حاشیہ پر ڈال دینا یہ بہت بڑی غلطی ہے، آپ اپنا دماغ استعمال کریں آخر آپ کا دماغ کب کام آئے گا، ان معلومات میں درک فہم وہی ہے جو آپ کے دماغ نے غور کرنے کے بعد لے لیا ہے، محض حواشی اور شروح پر قناعت کرنا یہ تو مستعار لباس پہننے کی طرح ہے، آپ کا اپنا کیا ہے؟ وہ وہی ہے جہاں آپ کا دماغ پہنچا ہے، وہی آپ کا علم ہے۔

البتہ مذکورہ باتوں پر زورِ دماغ استعمال کرنے کے بعد کمی کا تدارک کرنے کے لئے ضروری ہے کہ کسی کا تعاون حاصل کرلیا جائے، چاہے وہ تعاون حاشیہ اور بین السطور سے ہو چاہے شرح یا کسی ماہر فن استاد کی کاپی سے ہو، لیکن ان کا درجہ اپنے دماغ کے زور لگانے کے بعد ہے، اب ان حواشی وشروح کی طرف مراجعت کرنے سے آپ کے فہم کی غلطیاں نکلیں گی کہ میں نے جو سمجھا تھا وہ ٹھیک نہیں تھا،

بات تو کچھ اور نکلی، فہم کی خامیاں دور ہوں گی، اس مضمون کے کئی شعبوں کی طرف دماغ پہنچا نہیں تھا، ان معاونین نے پہنچادیا، اس میدان میں کئی شیر سوئے ہوئے تھے، جھاڑیوں میں چھپے رہ گئے، ان معاونین نے توجہ دلادی۔

اس ساری گفتگو کا مقصد یہ ہے کہ نہ صرف شروح وحواشی پر اکتفاء کی جائے اور نہ صرف اپنے زور دماغ پر، بلکہ ان دونوں کی آمیزش سے صحت عبارت، صحت ترجمہ، صحت فہم اور صحت متعلقات سب چیزوں کو منقح کرکے جمع کرلیا جائے۔

۲۔ ترتیب معلومات:

پہلے مرحلہ میں جو مال آپ نے اکٹھا کیا ہے اس کو حسن ترتیب سے اپنے ذہن میں محفوظ کریں، جیسے مسافر سفر پر جانے سے پہلے اپنا سامان ترتیب سے بریف کیس میں رکھتا ہے، اور ہر چیز اپنے مقام پر رکھتا ہے، مقصد یہ ہے کہ ذہن میں ان معلومات کو ترتیب دیں اور ان معلومات مرتبہ کو بار بار دماغ میں تازہ کریں، اگر اشارات مرتب کرکے کسی کاغذ پر نوٹ کرلیں تو اس ترتیب کو ذہن میں پختہ کرنے اور جمانے میں مدد مل جائے گی، ایسے نوٹس کے لئے ایک کاپی مستقل طور پر بنالی جائے تو بہتر ہے۔

۳۔ تلاش تعبیرات حسنہ:

آپ نے معلومات جمع کرکے ان کو مرتب کرلیا ہے، اور ذہن میں ان کا بار بار اعادہ بھی کرلیا ہے، لیکن یاد رکھیں کہ معیار تعلیم کو بلند کرنے کے لئے اتنی بات کافی نہیں ہے، ابھی ایک اہم مرحلہ باقی ہے۔

اس مرحلہ میں آپ نے موازنہ کرنا ہے کہ آج کے سبق کی معلومات کس وزن کی ہیں؟ اور جو جماعت میری مخاطب ہوگی اس کی ذہنی سطح کیا ہے؟ اس کی ذہنی پرواز کہاں تک ہے؟ اس کے مطابق اپنی آسان اور سہل تعبیرات تلاش کریں اور ایسی چسپاں تمثیلات تیار کریں کہ آپ کی زبان سے بات نکلتی جائے اور بڑی جلدی اور سرعت سے طالب علموں کے ذہنوں پر نقش ہوتی جائے، طلبہ سبق کو سمجھنے میں کوئی

وقت محسوس نہ کریں۔

استاد کی تعبیرات کئی قسم کی ہوسکتی ہیں، ایسی تعبیر بھی ہوسکتی ہے جو بدیہی مسئلہ کو نظری بناوے، اور ایسی تعبیر بھی ہوسکتی ہے جو نظری مسئلہ کو بدیہی میں تبدیل کردے، پہلی تعبیر خامی والی ہے، اور دوسری تعبیر خوبی والی ہے، معلم اور مدرس کا کمال یہ ہے کہ تعبیر اتنی آسان لائے کہ گدھے (کندذہن) بھی اچھل پڑیں، اور جامع اتنی ہو کہ کوئی متعلقہ گوشہ آپ کی تقریر سے باہر نہ رہے۔

۴۔ تکمیل مطالعہ:

تکمیل مطالعہ کے لئے یہ مذکورہ بالا مراحل بہت ضروری ہیں، اگر آپ واقعی نیک نیتی سے علم اور طلبہ علم کی خدمت چاہتے ہیں تو آپ کو ان مراحل سے گزرنا پڑے گا ورنہ علم اور طلبہ علم کی حق تلفی ہوگی۔

کوئی بھی صحیح الدماغ ان کی اہمیت اور ضرورت سے انکار نہیں کرسکتا، لیکن افسوس یہ ہے کہ ان مراحل کی تکمیل کے لئے جو تفریغ الاوقات چاہئے اس کے لئے واضح اکثریت عملاً تیار نہیں ہے، ذاتی مشاغل، غیر تعلیمی مصروفیات، تعلقات اور میل جول میں اتنا تنوع اور تکثر ہوتاہے کہ عزم مصمم کے باوجود بھی تکمیل مطالعہ کے لئے وقت فارغ نہیں کیا جاسکتا، اس کے نتائج یہ نکل رہے ہیں کہ علم اور طلبہ علم کی حق تلفیاں کرتے کرتے حق تعالیٰ کے پاس پہنچ جاتے ہیں، کوئی ضروری نہیں کہ غلط مشاغل ہی مطالعہ میں حائل ہوں بلکہ وہ مشاغل جو سراپا رحمت وبرکت ہیں مثلاً اورادِ کثیرہ، وظائف وغیرہ، اگر یہ بھی تکمیل مطالعہ والی رحمت عظمی کے لئے رکاوٹ بن رہے ہوں تو ان کو قربان کردینا چاہئے، ہمارے اسلاف واکابر نے ایسا کیا ہے، وہ طلبہ اور معلمین کو ایسے اورادِ کثیرہ تعلیم نہیں فرماتے تھے، اللہ کرے کہ مدارس کی فضاؤں میں یہ ذوق ابھر جائے۔ (آمین)۔

۵۔ مطالعہ میں احتیاطی پہلو:

بعض اوقات غیر اختیاری طور پر کوئی ایسا کام پیش آجاتا ہے جو مطالعہ کرنے سے مانع بن جاتا ہے، سبق کے ناغہ سے بچنے کے لئے قبل از وقت یہ حکمت عملی اختیار کریں کہ اپنا مطالعہ سبق سے کافی آگے

رکھیں، کم از کم تین چار دن کا مطالعہ آگے چلے، ورنہ یا سبق کا ناغہ ہوگا یا اپنی کمی چھپانے کے لئے طلبہ کی کوئی خامی پکڑ کر ان پر برس پڑیں گے اور یہ کہہ دیں گے کہ تم اس قابل نہیں ہو کہ تمہیں پڑھایا جائے، اس طرح سبق کے ناغے کے ساتھ نفاق اور تلبیس بھی جمع ہو جائیں گے، یا پھر تکمیل مطالعہ کے بغیر پڑھائیں گے جس پر یقیناً آپ خود بھی مطمئن نہیں ہوں گے۔

ایسے موقع پر دو احتیاطیں کریں:

۱۔ عوارض مطالعہ سے بچنے کی پوری کوشش کریں۔

۲۔ مطالعہ آگے رکھیں، مزید احتیاط یہ کریں کہ دو تین دن پہلے کے پرانے مطالعہ پر تدریس نہ کریں بلکہ پہلے اس کی تجدید کرلیں۔

اگر دوران مطالعہ اس احتیاطی پہلو کا لحاظ رکھا جائے تو کتاب کی کمیت اور کیفیت میں بڑا فرق پڑے گا۔ (ادو المدرسین...)

سبق میں جانے سے پہلے بھرپور مطالعہ تیار کرنا

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں:

اہم بات یہ ہے کہ طالب علم کو علم صحیح دو، ہمارے بزرگوں نے اس کے لئے فرمایا کہ ہر استاذ کا یہ فریضہ ہے کہ وہ جانے سے پہلے اپنے سبق کی تیاری کرے، اس تیاری میں صرف اتنی بات نہیں کہ جو کچھ پڑھانے جارہا ہے اس کا مطالعہ کرلیا، یہ تو ہے ہی ضروری کہ مطالعہ کرکے اچھی طرح اس کو خود اپنے ذہن میں بٹھائے، اور جب تک کوئی مسئلہ واضح اور منشرح طور پر دل میں نہ آئے، اس وقت تک نہ پڑھائے، ہمارے شیخ المشائخ حضرت مولانا رسول خان صاحب قدس سرہ کئی مرتبہ ہمارے یہاں دارالعلوم تشریف لائے، انہوں نے ایک نصیحت یہ فرمائی تھی کہ دیکھو بھائی جو پڑھانے جارہے ہو اس کے اوپر جب تک مکمل شرح صدر نہ ہو اس کو نہ پڑھاؤ، چھٹی لے لو اس دن، اس واسطے کہ بات واضح نہیں ہوئی، لیکن پڑھاؤ تو اس طرح پڑھاؤ کہ جب مکمل شرح صدر ہو چکا ہو کہ میں جو بات کہنے جارہا ہوں واقعۃً وہی صحیح ہے وہی میں پڑھاؤں گا۔

اس کے علاوہ مطالعہ اور تیاری میں یہ بھی دیکھنا ہے کہ طلبہ کی ذہنی سطح کے مطابق اس کو کس طرح میں آسان کر کے سمجھاسکتا ہوں،یعنی سمجھانے کا طریقہ بھی مطالعہ کے دوران سوچنا ہے۔

بعض اوقات کوئی بحث ہے، دقیق ہے، مشکل ہے، طلبہ کی ذہنی سطح سے بالاتر معلوم ہورہی ہے، یہ بھی مدرس اور استاذ کا فریضہ ہے کہ یہ سوچ کر جائے کہ کسی طرح اِس کو آسان کر کے طلبہ کو سمجھاؤں، میرے شیخ حضرت مولانا سجان محمود صاحب قدس اللہ تعالی سرہ ہم نے ان سے ابتدائی کتابوں سے پڑھا تھا، میزان اور نحومیر سے لے کر چوتھے درجہ تک ساری کتابیں تقریباً اُن سے پڑھیں، وہ فرمایا کرتے تھے کہ میں اپنے مطالعہ میں بہت،کافی وقت اس پر صرف کرتا ہوں کہ جو مضمون پڑھانے جارہا ہوں اس کو کس طرح آسان کر کے سمجھاؤں، باقاعدہ اہتمام کرتاہوں اس کو سوچنے کے لئے پورا وقت دیتا ہوں، بعض اوقات اس کا خاکہ لکھنے کی ضرورت پیش آتی ہے، اس کا خاکہ لکھ کر بورڈ پر سمجھانے کی ضرورت ہوتی ہے تو یہ سوچ کر جاتا ہوں کہ بورڈ پر کس طرح سمجھاؤں۔

جب آدمی یہ سوچ کر جاتا ہے تو پھر دقیق سے دقیق اور مشکل سے مشکل بحث طلبہ کے لئے آسان ہو جاتی ہے۔(رموز تدریس:۱۰۶، ۱۰۷)

اور شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب دامت برکاتہم اس کے متعلق فرماتے ہیں:

استاذ سبق کی ایسی تیاری کر کے آئے کہ وہ سبق اس کو زبانی یاد ہو، مختلف عنوانات سے وہ طلبہ کو سمجھانے پر قادر ہو، ایسا نہ ہو کہ کتاب کے تابع ہو کر وہ بات کر رہا ہے، کتاب ہٹادی جائے تو وہ سبق کے بیان کرنے سے قاصر ہو، پورا سبق استاذ کو خود اپنے ذہن میں پورے طریقے سے محفوظ کر کے درسگاہ میں آنا چاہیے، اور سبق کی تقطیع کر کے سمجھانا چاہیے،یہاں سے لے کر یہاں تک یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے، اور یہاں سے لیکر یہاں تک یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے، اس کے بعد جزء اول کا خلاصہ بھی نہایت آسان عنوان سے بیان کرے، دوسرے جزء کا خلاصہ بھی نہایت آسان عنوان سے بیان کرے، پھر اس کے بعد کتاب پر منطبق کرے، اگر یہ طریقہ اختیار کیا جائے تو طالبعلموں کو بہت سہولت اور آسانی ہوتی ہے۔

ہم نے اپنے بعض اساتذہ کو دیکھا کہ ان کو سبق پڑھانے کے لئے کتاب کی ضرورت نہیں ہوتی تھی، بیضاوی شریف، توضیح تلویح، اسی طریقے سے خیالی جیسی کتابیں استاد کتاب سامنے رکھے بغیر پڑھاتے تھے، اور وہ طالبعلموں پر اپنی ایسی گرفت قائم کرلیتے تھے کہ طالبعلموں کو نماز میں وسوسے آسکتے ہیں، دُعا کے وقت وسوسے آسکتے ہیں، لیکن ان کے سبق میں بالکل وسوسہ نہیں آتا، تو اس کا نتیجہ یہ تھا کہ طلبہ ان کے سبق کو خوب یاد کرتے تھے، اور ان کے سبق میں حاضری کا بڑا اہتمام ہوتا تھا۔ (رموز تدریس،۴۳، ۴۴)

مولانا عزیز الرحمن صاحب استاد دارالعلوم کراچی مطالعہ کو تیار کرنے اور متعلقہ مضمون پر اچھے طرح حاوی ہونے کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:

مضمون پر حاوی ہونا ضروری ہے، اور جب مضمون پر حاوی ہونے کی کوشش کی جاتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ جو سبق آج ہمارے سامنے ہے اس کے کتنے عناصر ہیں؟ کتنے اجزاء ہیں؟ ہر ہر جزء کے بارے میں پوری بصیرت حاصل ہو اور اس کا بھی خیال ہو کہ میرے سامنے جو طلبہ ہیں وہ مختلف فہم رکھنے والے ہیں، اُن کی سوچ وفکر اور ان کا جو اخذ کا مادہ ہے وہ یکساں نہیں ہے، لہذا مجھے اضعف کی رعایت کرکے اپنی بات پیش کرنی ہے، اضعف کی رعایت کرکے اور اس کے مقابلے میں جو قوی ہے اس کے ذہن میں یہ اشکال پیش آسکتا ہے۔

لہذا سبق کی تیاری کے دوران اس بات کو بھی پیش نظر رکھے لیکن طالب علموں کو اتنا دے جتنا وہ ہضم کرسکیں، اپنی تیاری پوری ہو لیکن جہاں تک منتقل کرنے کا معاملہ ہے اور دینے کا معاملہ ہے وہ قابل تحمل ہو، اپنا مطالعہ، اپنی تیاری اور اپنا جو سامان ہے اس میں کوئی کمی نہ ہو، ایسے میں جب استاد تیار ہو کے درس گاہ میں جاکے بیٹھے گا تو بخدا دل سے بات نکلے گی، اثر انداز ہوگی، خود اعتمادی سے نکلے گی، پوری بصیرت سے نکلے گی، اور یقینی طور پر اس کے اثرات ظاہر ہونگے۔

یہ جو ہوتی ہے ناقص تیاری، اس کے بڑے منفی اثرات ہوتے ہیں مضمون اچھا خاصا آسان ہوتا ہے لیکن ناقص تیاری سے طالب علم کی نظر میں وہ پہاڑ بن جاتا ہے، سیدھا سادھا مضمون ہے اگر مناسب اسلوب کے ساتھ اس کو پیش کیا جاتا تیاری کے بعد، اور جب تیاری ہوتی ہے تو ذہن میں بھی یہ

بات آتی ہے کہ اس کو زیادہ سہل طریقہ سے پیش کرنے کا کیا طریقہ ہے، جب یہ تیاری ہوگی تو سہل طریقہ سے پیش کرنے کا ایک داعیہ پیدا ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی بھی مدد آئے گی، {والذین جاهدوا فینا لنهدینّهم سبلنا}، اللہ تعالیٰ بھی اس کو راستے سجھادیتے ہیں، وہ مشکل پھر آسان ہوجاتی ہے، بات اثرانداز ہوتی ہے، لیکن جب تیاری نہیں ہوتی تو ایسی صورت میں بس وقت گزاری کا انداز ہوگا، اس وقت گزاری کے انداز سے آج یہ صورت حال ہے کہ تقریباً ۷۰، ۸۰ فیصد ہمارے فضلاء اس پایہ کے نہیں ہیں جس پایہ کا ان کو ہونا چاہیے۔(رموز تدریس:۱۳۰،۱۳۱)

مفتی ابولبابہ صاحب فرماتے ہیں:

مدرس کو بھی تین مطالعے کرنے چاہئیں: ایک فہم اور استذکارِ فہم کے لئے کہ وہ جو زمانہ طالب علمی میں پڑھا تھا آج اس یادگار کو دہرا کر پھر لطف تو لیں۔

دوسری مرتبہ افہام کے لئے، اسی مقدار سبق کا پھر مطالعہ کہ حدیث النفس ایسی تیار کرے کہ صبح طلبہ کو جاکر سمجھا سکے۔

تیسرا مطالعہ تسہیل افہام کے لئے کہ کل جو سبق سمجھانے کے دوران الفاظ اپنی زبان سے نکالے وہ منتخب، مختصر، جامع اور اقرب الی الوصول ہونے چاہئیں، ان تین مطالعوں سے ایک مدرس کو گزر کر جانا چاہیے۔

اس دوران ایک ضمنی بات یہ ہے کہ افراط وتفریط سے بچنا چاہیے، تفریط یہ ہے کہ آدمی صرف اردو شروحات کا مطالعہ کرتا ہے، ہم اردو شروح کو دیکھتے ہیں اور طالب علم کو تیار کس لئے کررہے ہیں کہ ہماری تراث عربی سے استفادہ کرنے کے قابل ہوجائے، اور تیار کرنے والا خود اپنے آپ کو اردو ذخیرہ سے تیار کرکے لارہا ہے۔

یہ ہے اپنے فن سے لگن! یہ ہے اپنے پیشہ سے اخلاص! اور یہ ہے خلوص اور للہیت اور ایثار کا نمونہ!

لہذا عربی شروحات کا مطالعہ کرنا چاہیے ورنہ تفریط ہوگی۔

اورافراط یہ ہے کہ آدمی جو کچھ مطالعہ کرے تو اس کا واحد مصرف یہ سمجھے کہ سارا کچھ کل طلبہ کو سنا کر ہی آتا ہے، بالکل غلط رجحان ہے۔

مدرس کا مطالعہ طالبعلم سے تین گنا ہونا چاہیے لیکن وہ بیان صرف ایک ثلث کرے، اور دوسرا ثلث جو اس کے پاس ہے اس سے وہ منتخب کرکے کہیں کہیں کوئی نکتہ بیان کرے اور تیسرا ثلث وہ اپنے استادی کے صدقے کے طور پر محفوظ رکھے کہ اگر کسی طالب علم نے غیر متوقع سوال کرلیا تو جواب حاضر ہے، اس دن اس کی محنت وصول ہوجاتی ہے، اگرچہ کی تھی اس نے سارا سال اور سوال کسی نے سال میں ایک ہی بار کیا، تو مدرس کو تین مطالعہ کرنے چاہئیں لیکن افراط تفریط سے بچتے ہوئے۔

مقارن مطالعہ کا اہتمام:

آپ فقہ کی کسی کتاب کا ـــ چاہے وہ پہلی قسم سے تعلق رکھنے والے دو متن ہوں قدوری اور کنز، یا دوسری قسم سے رکھنے والی دو شروحات ہوں، شرح وقایہ اور ہدایہ، جب آپ ان کا ان کی عربی شروحات کی روشنی میں مطالعہ کرلیں تو پھر مقارن مطالعہ کے لئے دو کام کریں، یا کم از کم دو میں سے ایک ضرور کریں، اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ دو چیزوں کا مقارن مطالعہ کریں: ایک تو اس شاندار کتاب کا جو سارے فقہی دفاتر کا نچوڑ ہے، اسلام کی تاریخ میں فقہ پر ساڑھے بارہ سو سال میں جو کام ہوا وہ سارا پوری تنقیح اور ترجیح کے ساتھ "ردالمُحتار علی الدر المُختار" کی شکل میں جمع کیا گیا ہے، آپ نے جو سبق قدوری میں دیکھا ہے اسے "اللُّباب" اور "الجوھرۃ" میں دیکھ لیا، اسی طرح ہدایہ میں عنایہ وکفایہ بالاستیعاب دیکھیں، اور فتح القدیر بالانتخاب دیکھ لی بس کافی ہے، اس کے بعد آپ وہی جگہ شامیہ میں نکالیں، یقین کریں کہ میں نے لفظ استعمال کیا تھا تنقیح اور ترجیح کا، اگر آپ صرف اسی شروحی مطالعے تک اپنے آپ کو محدود رکھیں گے تو مسئلہ منقح ہوکر سامنے نہیں آئے گا، ذہن میں الجھنیں اور پیچیدگیاں رہیں گی، اور اگر آپ اسی مطالعہ تک محدود رہیں گے تو آپ کے سامنے ترجیح نہیں ہوسکے گی یہ دونوں باتیں آپ کے ہاتھ میں شامیہ کے مقارن مطالعہ سے آئیں گی۔

اور کتب فقہ کی ترتیب تقریبا ایک جیسی ہوتی ہے باب کی باب سے، اجزائے باب کی اجزائے باب

سے، آپ کو وہ جگہ نکالنے میں مشکل نہیں ہوگی، خصوصا جو حضرات مدرسین متخصص فی الافتاء بھی ہیں ان کو یہ اختیار بھی نہیں دینا چاہیے، انہیں دونوں مقارن مطالعہ ضرور کرنے چاہئیں۔

اکابر کے مستند فتاوی کا مطالعہ:

دوسرا مقارن مطالعہ، فقہ پڑھتے پڑھاتے وقت ہمارے اکابر کے مستند فتاوی کا کرنا چاہیے جو باب آپ یہاں پڑھا رہے ہیں، اردو فتاوی میں سے مستند فتاوی لے لیں، یہی باب وہاں بھی کھول لیں بلکہ باب نہ کھولیں اس کی فہرست شروع میں ہے وہ کھولیں اور اس فہرست پر ایک نظر ڈالیں، آپ نے آٹھ سال تک پڑھا اور پانچ سال سے آپ پڑھا بھی رہے ہیں، آپ اپنا امتحان خود لیں کہ اس فہرست میں جو مسائل پوچھے گئے ہیں اس میں سے کون سا مسئلہ ایسا ہے جو مجھے نیا لگ رہا ہے، وہ جگہ نکالیں اور مطالعہ کریں سارے کا مطالعہ نہیں کہہ رہا، بلکہ صرف وہ جو آپ کو نہیں آتا اس کا مطالعہ کریں۔

آپ اس فن کے وارث ہیں، روز قیامت آپ سے اس کے متعلق سوال ہوگا، بقیہ باتیں چھوڑدیں اور یہ دیکھیں کہ ہمارا کھانا، پینا، اٹھنا، بیٹھنا، یہ سب وقف اموال سے ہیں اور روز قیامت ہم امت کے سامنے جوابدہ ہیں کہ ہم نے اس کی نئی نسل کو کیا دیا تھا؟ ہم کو اپنے فن سے عشق نہیں ہے، اپنے اس فن سے ایسا لگاؤ نہیں ہے، ایسا شغف نہیں ہے کہ ہم دنیا کی ساری چیزوں کو اس کی خاطر چھوڑدیں، ساری لذتوں اور راحتوں سے زیادہ لطف اور سکون ہم کو مطالعہ، تحقیق اور مشکل عبارت کے حل کرنے میں آتاہو، اس طرح کا عشق ہمیں نہیں ہے اور دنیا میں لوگوں کو اپنے فنون سے ایسا ہی عشق ہے، اس لئے انہوں نے اس مردار دنیا کا حق ادا کیا اور ہم نے ہمیشہ رہنے والی جنت کی خاطر حق ادا کرنے کی کوشش بھی نہیں کی، اس کی کمی ہے، یہ لگن اور تڑپ ہو، پہلے تو مجھے آنا چاہیے، میری پہچان یہی چیز ہے، مجھے اس چیز کے عوض میں یہ امت عزت دیتی ہے، عظمت دیتی ہے، مجھے قابل احترام سمجھتی ہے۔

آپ اس فہرست میں دیکھیں کہ مجھے کونسا مسئلہ نہیں آتا اس کو نکالیں، حکم تو آپ زبانی یاد کرلیں، یہ آپ کو آنا چاہیے، یہ بہت عجیب بات ہوگی کہ آپ جب ہدایہ کا ایک مسئلہ پڑھیں مثلا: ومَن اشترى عشرة أسهم من مائة سهم من دارٍ، فالبيع جائزٌ، تو آپ وہاں پر حصہ مشاعہ سمجھاتے

ہوئے اسٹاک ایکسچینج کا حکم نہ سمجھائیں بہت عجیب بات ہوگی، بیع صرف کے اندر تقابض بدلین مجلس کے اندر اندر ضروری ہے ورنہ بیع باطل ہے جب آپ باب الصرف پڑھا رہے ہیں تو منی ایکسچینج کے مسائل آپ کو نہ آتے ہوں تو یہ بڑی عار کی بات ہے، عار کی بات یہ نہیں ہے کہ مولوی کے پاس قراقلی نہیں، شروانی نہیں، سنہرا چشمہ نہیں، چمکتے بوٹ نہیں، کہ وہ کسی تقریب میں نہیں جاسکتا، یہ چیزیں کیا ہوتی ہیں؟ ان چیزوں کو عزت تو ہمارے پاؤں تلے آکر ملتی ہے۔

حکم آپ یاد کرلیں اور دلیل مسئلہ میں جو عبارت وہاں موجود ہوگی یہی عبارت آپ کی کتاب میں بھی ہوگی یا اس سے ملتی جلتی ہوگی، یہ عبارت مفتیانِ کرام شامیہ سے لیتے ہیں، یہی عبارت آپ کے ان دونوں متون میں یا ان دونوں شروح میں موجود ہوگی، اور جب وہ عبارت آپ کی سمجھ میں آجائے تو وہ مسئلہ آپ وہاں بیان کردیں۔

(رموز تدریس:۱۶۹ تا ۱۷۰)

مطالعہ کیوں؟ کیا؟ کیسے؟

مولانا فاروق اعظم عاجز قاسمی صاحب

اس عنوان سے مولانا فاروق اعظم عاجز قاسمی صاحب نے ایک قیمتی مضمون لکھا ہے، انہوں نے اگرچہ یہ مضمون ایک محرر اور مضمون نگار کے لئے لکھا ہے لیکن ایک مدرس اگر اپنے کو بھی اس کا مخاطب سمجھ کر پڑھ لیں اور تدریسی لائن میں اس سے استفادہ کریں جیسا کہ قوسین میں دیے گئے بعض اضافوں سے اسے مخاطب بنایا گیا ہے، امید ہے کہ فائدے کا باعث ہوگا۔

ایک شہسوار قلم کے لئے مطالعہ اتنا ضروری ہے جتنا انسانی زندگی کی بقا کے لئے دانا اور پانی کی ضرورت ہے، مطالعہ کے بغیر قلم کے میدان میں ایک قدم بھی بڑھانا بہت مشکل ہے، علم انسان کا امتیاز ہی نہیں بلکہ اس کی بنیادی ضرورت بھی ہے، جس کی تکمیل کا واحد ذریعہ بھی مطالعہ ہے، ایک پڑھے لکھے شخص کے لئے معاشرے کی تعمیر ترقی کا فریضہ بھی اہم ہے، اس لئے مطالعہ ہماری سماجی ضرورت بھی ہے، اگر انسان اپنے اسکول ومدرسہ کی تعلیم مکمل کرکے اسی پر اکتفا کرکے بیٹھ جائے تو اس کے فکر ونظر کا دائرہ بالکل تنگ ہوکر رہ جائے گا، مطالعہ استعداد کی کنجی اور صلاحیتوں کو بیدار کرنے کا بہترین آلہ ہے، یہ مطالعہ کا کرشمہ ہے کہ انسان ہر لمحہ اپنی معلومات میں وسعت پیدا کرتا رہتا ہے، اور زاویہ فکر ونظر کو وسیع سے وسیع تر کرتا رہتا ہے۔

مطالعہ ایک ایسا دوربین ہے جس کے ذریعے انسان دنیا کے گوشہ گوشہ کو دیکھتا رہتا ہے، مطالعہ ایک طیارے کی مانند ہے جس پر سوار ہوکر ایک مطالعہ کرنے والا دنیا کے چپے چپے کی سیر کرتا رہتا ہے، اور وہاں کی تعلیمی، تہذیبی، سیاسی اور اقتصادی احوال سے واقفیت حاصل کرتا ہے، شورش نے کہا:

"کسی مقرر کا بلا مطالعہ تقریر کرنا ایسا ہی ہے جیسا بہار کے بغیر بسنت منانا، یا ہوا میں پتنگ اڑانا"۔

یہ تو ایک مقرر کے سلسلے میں بات تھی، لیکن ٹھیک یہی صورت ایک قلم کار (اور مدرس) کی بھی ہے، مولانا نور عالم امینی صاحب فرماتے ہیں:

"آج لوگ لکھنے والے زیادہ اور پڑھنے والے کم ہوگئے، جس کے نتیجے میں تحریر کی اثر آفرینی ختم ہوگئی ہے، اس لئے تحریر (اور تدریس) کو مؤثر بنانے کے لئے ضرورت ہے ایک ایک صفحہ کو لکھنے (اور ایک ایک مسئلہ اور قاعدہ کو سمجھانے) کے لئے سو صفحات کا مطالعہ ہو"۔

پروفیسر عبدالمغنی صاحب کہتے ہیں:

"مطالعہ کی غرض علم کا حصول اور راہِ عمل کی تلاش ہے"۔

شیشی کے اندر اگر مشک ہو تو کھولنے کے بعد خوشبو ضرور پھیلتی ہے، اسی طرح جب ایک قلم کار (اور مدرس) کا مطالعہ جب وسیع اور گہرا ہوتا ہے تو اس کی تحریر (اور تدریس) میں قوت اور اثر ہوتا ہے، ورنہ تحریر (اور تدریس) کمزور، پھسپھسی اور بے جان ہوجاتی ہے۔

عربی کا ایک مشہور محاورہ ہے:

"زمانے کا بہترین دوست کتاب ہے"۔

اسی کو شورش مرحوم نے اس طرح کہا ہے:

"کتاب سا مخلص دوست کوئی نہیں"۔

اسی طرح ایک مفکر کہتا ہے:

"کتابوں کا مطالعہ انسان کی شخصیت کو ارتقا کی بلند منزلوں تک پہنچانے کا اہم ذریعہ، حصول علم ومعلومات کا وسیلہ اور علمی تجرباتی سرمایہ کو ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل کرنے اور ذہن وفکر کو روشنی فراہم کرنے کا معروف ذریعہ ہے"۔

کتابوں سے جہاں معلومات میں اضافہ اور راہ عمل کی جستجو ہوتی ہے وہیں اس کا مطالعہ ذوق میں بالیدگی، طبیعت میں نشاط، نگاہوں میں تیزی اور ذہن ودماغ کو تازگی بھی بخشتا ہے۔

مطالعہ کن کتابوں کا ہو؟:

مطالعہ ایسی کتابوں کا ہو جو نگاہوں کو بلند، سخن کو دل نواز اور جاں کو پرسوز بنادے، اگر مطالعہ فکر کی سلامت روی، علم میں گہرائی اور عزائم میں پختگی کے ساتھ ساتھ فرحت بخش اور بہار آفریں بھی ہو تو اسے صحیح معنوں میں مطالعہ کہا جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ آج کا دور انتہائی ترقی پذیر اور مسابقہ کا دور ہے، ذرائع ابلاغ وترسیل کی بہتات ہے اور سہولیات کی بھی کمی نہیں ہے، ایسے ہی طرح طرح کے اخبارات ورسائل اور کتابوں کی بھی فراوانیاں ہیں، اب ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ کتابوں کی اس ریل پیل اور جنگل میں کن کا مطالعہ کیا جائے اور کن کو چھوڑا جائے؟ اس کا سیدھا سا جواب یہی ہے کہ یہ ممکن نہیں، اس لئے کہ نہ ہر کتاب قابل مطالعہ ہے اور نہ ہی تمام کتابوں کے مطالعہ کرنے کی انسانی زندگی میں گنجائش، اس لئے انتہائی چھان پھٹک کر کتابوں کا انتخاب ہونا چاہیے، یہ بات بھی انتہائی ضروری ہے کہ کتاب ایمان سوز اور اخلاق سوز نہ ہو، اس لئے کہ مطالعہ ہی کے غلط رخ نے عبدالماجد کو ارتداد کے گڑھے میں دھکیل دیا تھا، لیکن بعد میں اسی شخص کے مطالعہ کی سمت جب درست ہوئی تو عبدالماجد مولانا عبدالماجد ہوگئے، اور مفسر قرآن اس شخص کے نام کا جزو لاینفک بن گیا، صحت مند مواد اور مستند مصنفین کی کتابوں کے مطالعہ ہی کا کرشمہ کہنا چاہیے کہ امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھی رحمہ اللہ (نومسلم) دس بارہ سال ہی کی عمر میں اسلام کی طرف مائل ہوگئے تھے، اس لئے معتبر ومستند مصنفین ہی کی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے، کتابوں کے انتخاب کے سلسلے میں مولانا یعقوب کے حوالہ سے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا ایک مقولہ نقل کرتے ہیں:

> "جب کسی کتاب کے مطالعہ کا ارادہ کرو تو پہلے اس کے نام کو دیکھو، اگر نام ہی اصل مضمون کے مناسب نہ ہو تو اس کو چھوڑ دو، پھر تمہید کو دیکھو، اگر وہ کتاب کے مضمون کے مناسب نہیں تو چھوڑ دو، اس کے مطالعہ میں وقت ضائع نہ کرو، جب نام اور تمہید میں مناسبت دیکھ لو تب آگے بڑھو"۔

اس سلسلے میں ایسے اساتذہ کی رہنمائی بھی بڑی کارآمد ہوتی ہے جن پر مطالعہ کرنے والے کو مکمل اعتماد ہو، رہنما ایسا ہونا چاہیے جو بذات خود ہر اعتبار سے ایک پیاسے کی تشنہ لبی کو دور کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہو، مفکر اسلام ممتاز عالم دین مولانا علی میاں ندوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> "مطالعہ کو وسیع کیجئے اور اس کے لئے اساتذہ سے، خاص طور پر مربی اصلاح سے اوران اساتذہ سے جن سے آپ کا رابطہ ہے، ان سے مشورہ لیجئے"۔

اسی طرح اس پگڈنڈی پر انتہائی سبک روی سے چلنے کی ضرورت ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے عظیم شخص کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے توریت جیسی عظیم المرتبت آسمانی کتاب کے مطالعہ سے منع فرمادیا تھا۔

مطالعہ کے بنیادی مواد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر یاسین صدیقی ندوی کہتے ہیں:

"مطالعہ میں ہدایت نبوی کے مطابق سب سے اچھی چیزیں اور بری چیزیں چھوڑ دیں، اس میں انصاف سے کام لیں کہ یہ خیر کا دروازہ ہے"۔

ایسی ہی انسانی زندگی کے محدود ہونے کی وجہ سے تمام موضوعات کا احاطہ مشکل ہے، البتہ ہر موضوع سے کچھ نہ کچھ واقفیت ضروری ہے، چنانچہ نعیم صدیقی صاحب رقمطراز ہیں:

"بنیادی طور پر قرآن وحدیث اور ان سے متعلق علوم پر جس حد تک ممکن ہو نگاہ ہونی چاہیے ـــــ پھر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور صحابہ کے سیر پر نظر ہونی چاہیے ـــــ ضروری ہے مطالعہ کا سفر کرنے والا ہر شخص کم از کم اپنے ملک اور اپنی قوم بلکہ اپنی تہذیب کے اوبیات سے واقف ہو"۔

جس طرح کتابوں کے انتخاب کا مرحلہ بڑا نازک ہے اسی طرح مطالعہ میں ترتیب کی رعایت بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے، اس لئے مطالعہ کے معیار کو بتدریج بڑھایا جائے، ایسا نہ ہو کہ "نورانی قاعدہ" پڑھا نہیں اور قرآن شریف ہی پڑھنا شروع کردیا۔

طریقۂ کار:

مطالعہ ایک خوبصورت گلشن کی مانند ہے، اس میں خوشبو بھی ہے، دل آویزی بھی ہے، اور خاردار شاخیں بھی ہیں، ایک طرف جہاں مطالعہ کی اہمیت مسلم اور افادیت قابل ذکر ہے ساتھ ہی ساتھ اس کے مواد میں انتہائی چاق وچوبندی ناگزیر ہے، اسی طرح اس کے طریقہ کار سے بھی واقفیت بہت ہی ضروری ہے اس لئے کہ کسی بھی کام کو اگر اس کے اصول وضابطہ سے کیا جائے تو وہ کارآمد ثابت ہوتا ہے، ورنہ نفع تو درکنار نقصان ضرور ہاتھ آتا ہے، فرض کیجئے! آپ کے پاس وقت بھی ہے کتابیں بھی اچھی ہیں، لیکن ذہن پریشان، آنکھوں میں درد، اور روشنی بھی مدہم، تو آپ مطالعہ نہیں کرسکتے، اگر اسی صورت حال میں مطالعہ

کی کوشش کریں گے تو صحت پر اس کا بہت برا اثر پڑے گا، اس لئے صحت کا خیال بھی بہت ضروری ہے، بطور خاص آنکھوں کا خیال۔

یہ بھی قابل ذکر بات ہے کہ اس خیال سے مطالعہ کو ہرگز ترک نہیں کرنا چاہیے کہ یاد نہیں رہتا، بلکہ مطالعہ ضرور کرے، کہیں نہ کہیں اس کا فائدہ ضرور ظاہر ہوتا ہے، اس لئے مہندی میں سرخی پتھر پر بار بار گھسنے کے بعد ہی آتی ہے، مولانا عبدالسلام خان لکھتے ہیں:

"مطالعہ جتنا زیادہ ہوگا اتنا ہی جلد محفوظ ہوگا اور تیز ہوگا، اس لئے کتب بینی کو سُست روی یا یاد نہ رہنے کی وجہ سے ترک نہ کرنا چاہیے"۔

حاصل مطالعہ:

مطالعہ کے ساتھ ساتھ حاصل مطالعہ کو ذہن نشین کرنے کی تدبیر بھی ضروری ہے، علم ومعلومات کی مثال ایک شکار کی سی ہے، لہذا اسے فوراً قابو میں کرنا چاہیے، امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"علم ایک شکار کے مانند ہے، کتابت کے ذریعے اسے قید کرلو"۔

اس لئے مطالعہ کے دوران قلم کاپی لیکر خاص خاص باتوں کو نوٹ کرنے کا اہتمام کرنا چاہیے، ورنہ بعد میں ایک چیز کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور وہ نہیں ملتی ہے، اب یا تو سرے سے بات ہی ذہن سے نکل جاتی ہے یا یاد تو رہتی ہے لیکن حوالہ دماغ سے غائب ہوجاتا ہے، ڈاکٹر صمت جاوید کا کہنا ہے:

"یاد رکھنے کے قابل بات پر دوران مطالعہ اہم مقامات پر نشان لگانے اور کتاب کی پشت پر سادہ اوراق میں اہم نکات کو کاپی یا کسی کاغذ کے پرزے پر نوٹ کرلیں"۔

اسی طرح ڈاکٹر احمد سجاد کہتے ہیں:

"بعض صفحات کے نمبروں کو لکھنے کی عادت ہنوز قائم ہے، مطالعہ کے معاً بعد بعض کتابوں پر ذاتی تاثرات تبصرے بھی اختصار کے ساتھ لکھنے کی عادت ہے"۔

حاصل مطالعہ کیسے ذہن نشین ہو؟ یہ بھی ایک اہم عنصر ہے، اس سلسلے میں نعیم صدیقی رقم طراز ہے:

"میری ذہنی ساخت یوں بنی کہ میں حاصل مطالعہ کو دماغ میں ڈال لیتا اور میرے اندر اس پر غور

وبحث کا ایک سلسلہ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، کھانا کھاتے جاری رہتا، یہاں تک کہ اس کا مثبت یا منفی اثر میرے عالم خیال پر رہ جاتا"۔

معلوم ہوا کہ مطالعہ کے بعد حاصل مطالعہ کی بھی بڑی اہمیت ہے، ورنہ تو بات لاحاصل ہی رہے گی، مطالعہ کے دوران جہاں اچھی کتابوں، خوشگوار فضا، مناسب مقام، موزوں روشنی اور وقت کی تنظیم ضروری ہے وہیں صحت کا بھی خاص خیال رکھنے کی اشد ضرورت ہے۔ (ماہنامہ الفاروق شوال ۱۴۳۰ھ)

مطالعہ کو کار آمد بنانے کے سلسلہ میں مولانا محمد یزید احمد نعمانی صاحب لکھتے ہیں:

رہا یہ سوال کہ مطالعہ کو کار آمد کیسے بنایا جاتا ہے؟ اس سے حاصل ہونے والے علمی جواہرات کیسے محفوظ کیا جائے؟ تحریر کی معنویت سے بھرپور استفادہ کیوں کر ممکن ہوسکتا ہے؟۔

تو جناب من!

اول: اس کے لئے ضروری ہے کہ بوقت مطالعہ ذہن کو تفکرات اور انتشار فکر سے بچاکر مکمل طور پر حاضر رکھا جائے، تاکہ "کتاب خوانی" محض پڑھنے تک محدود نہ ہو، بلکہ عبارت کا مطلب ومفہوم بھی ذہن نشین کرنے کی سعی وکوشش ہو۔

دوم: قبل از مطالعہ "قلم وقرطاس" کا پاس ہونا حاصل مطالعہ کو پختہ، محفوظ اور مفید بنانے کا بنیادی اور کلیدی عنصر ہے، دوران مطالعہ "اہم اور اہم تر" کے اصول کو مد نظر رکھتے ہوئے اہم عبارات، بنیادی باتوں اور عمدہ نکتوں کو نشان زد کرلیا جائے۔

سوم: پسندیدہ ابحاث، قابل ذکر عنوانات، ادبی لطائف واشعار اور سیرت وسوانح کے متاثر کن واقعات سمیت ہر وہ بات ونکتہ جو پہلی نظر میں دل ودماغ کے تاروں کو ہلادے، اس کو نوٹ کرنے کے لئے الگ بیاض ترتیب دی جائے، جس سے آگے چل کر علمی وعملی زندگی میں بھرپور استفادہ وراہنمائی لینا سہل وآسان ہے۔

یہ امر محتاج دلیل نہیں ہے کہ شوق مطالعہ کی کمی اور کمزوری طالب علم دین کے لئے سخت مضر اور سم قاتل ہے، بلند فکری، وسعت علمی اور تعمق نظری کی نظریاتی اور فکری اسلحہ سے تہی دستی امت کے

مستقبل کے نگہبانوں اور پاسبانوں کا شعار نہیں، "عشقِ کتاب" کے اس سفر میں جاں سوزی اور بلاکوشی اٹھائے بغیر ملت کی سیادت وقیادت کے فرائض سے عہدہ برآہونا کارِ محال ہے، بقول مولانا اسعد اللہ صاحب ناظم مظاہر العلوم:

انسان کو بناتا ہے اکمل مطالعہ
ہے چشم دل کے واسطے کاجل مطالعہ
ناقص تمام عمر وہ رہتے ہیں علم سے
ہوتا نہیں ہے جن کا مکمل مطالعہ
کھلتے ہیں رازِ علم کے انہی کے قلوب پر
جو دیکھتے ہیں دل سے مسلسل مطالعہ

(ماہنامہ الفاروق شوال: ۱۴۳۱ھ)

وهذا آخر ما رتَّبتُ وجمعتُ وسجلت

وصلِّ اللّٰهمَّ وسلِّم على حبيبك محمد وآله وبارك وسلِّم تسليمًا بعدد الحروف والحركات والسَّكنات والنقط ما كتبتها وماكتبها الأولون والآخرون وصلِّ عليه إلى أبد الآبدين وإلى دهر الداهرين يا رب العالمين۔

سید عبد الرشید بن مقصود ہاشمی

من ابناء

جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن

۲۵ محرم الحرام ۱۴۳۴ھ

تحفہ مدرسین
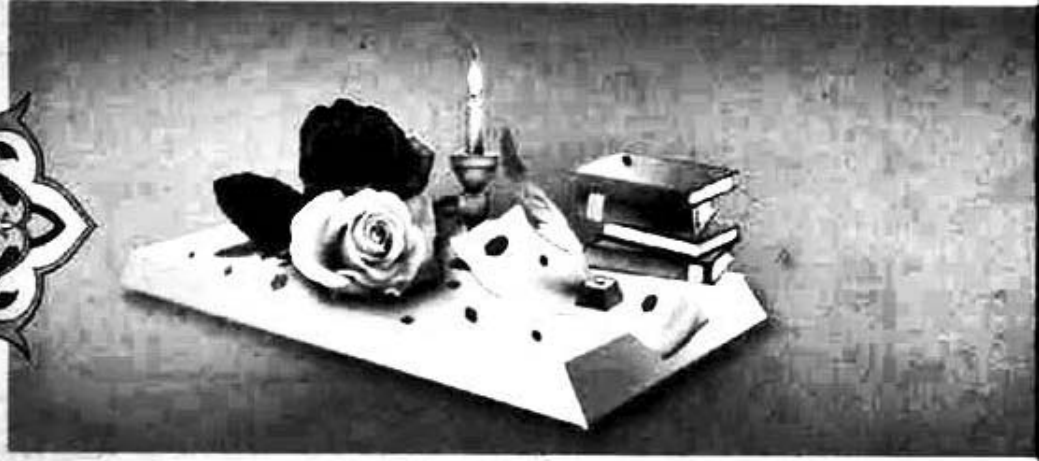
Faraz 0302-2691277

ادارۃ الرشید کراچی

جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن

Tel: 021-34928643 Cell: 0321-2046610